اسلامی اخلاق
مولف:
احمد دیلمی و مسعود آذر بائیجانی

یہ کتاب برقی شکل میں نشرہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسنین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

اسلامی اخلاق

مولف: احمد دیلمی و مسعود آذر بائیجانی

s hi a n e t .i n

پہلا باب: اخلاق کے اصول

پہلی فصل: کلّیات

علم اخلاق کیا ہے ؟ اس کا موضوع اور ہدف کیا ہے؟ دوسرے علوم سے اس کا کیا رابطہ ہے؟اخلاق کی تعلیم کیوں ضروری ہے ؟ مسلمان علماء کے درمیان موجود اخلاقی نظریات اور اُن کے طریقوں کی قسمیں کون سی ہیں؟

یہ وہ اہم سوالات ہیں جو علم اخلاق کے مسائل شروع ہوتے ہی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ان کا مناسب اور شائستہ جواب نہ صرف اس علم کے موضوع، حدود اور مقام و منزلت کے واضح ہونے کا سبب بنے گا بلکہ ہماری امیدوںکی اصلاح کے ساتھ بہت سے ایسے شبہات اور ابہامات کو بڑھنے سے روک سکتا ہے جو ممکن ہے بعد کی بحثوں میں سامنے آسکتے ہیں۔

الف۔ علم اخلاق سے واقفیت

علم اخلاق کی ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نکات اور مفاہیم کا واضحہونا ضروری ہے:

۱۔ لفظ اخلاق کا لغوی مفہوم

اخلاق خُلق کی جمع ہے جس کے معنی انسان کی باطنی قدرت اور عادت کے ہیں، جسے باطنی آنکھوں سے نہیں بلکہ چشم بصیرت سے درک کیا جا سکتا ہے یہ(خُلق) خَلق کے مقابلہ میں ہے جو ظاہراً قابل حس و درک شکل وصورت کے معنی میں ہے اور ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے قابل ہے۔ [۱]

اسی طرح خُلق کو واضح و پائیدار نفسانی صفت بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنی صفت کے مطابق بغیر کسی تاخیر کے اعمال کو انجام دیتا ہے۔مثلاً اگر کوئی انسان شجاع ہے تو وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کرنے میں شش وپنج میں نہیں پڑتا۔ یہ باطنی وراسخ وثابت حالت، ممکن ہے کسی انسان میں طبیعی، ذاتی و فطری طور پر پائی جاتی ہو جیسے کوئی

۱۔ اصفہانی، راغب: معجم مفردات الفاظ قرآن، ص: ۱۵۹۔

جلدی غصہ میں آجاتا ہے یا معمولی بات پر خوش ہو جاتا ہے۔خُلق پیدا ہونے کے دوسرے عوامل و اسباب وراثت، تمرین و تکرار ہیں۔ مثلاًیہ کہ کوئی پہلے شجاعت والے کاموں کو تردّد اور تذبذب کی حالت میں انجام دیتا ہے پھر تمرین کی وجہ سے تدریجاً اس کے اندر شجاعت کی پائدار صفت اس طرح وجود میں آجاتی ہے کہ اُس کے بعد کسی جھجک کے بغیر شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ (۱)

یہ باطنی و نفسانی راسخ صفت ممکن ہے "فضیلت"یعنی اچھی خصلتوںکا سبب قرار پائے اور ممکن ہے "رذیلت"یعنی برائی اور بدکرداری کی ہو جائے۔بہر حال اُسے خُلق کہا جاتا ہے۔

۲۔علم اخلاق کی تعریف

اسلامی علوم میں علم اخلاق کے مستند و معروف اور سب سے اصلی منابع کی طرف رجوع کرنے سے اور قرآن واحادیث میں اس کے استعمال کے مقامات پر دقت کرنے سے علم اخلاق کی تعریف اس طرح بیان کی جاسکتی ہے: علم اخلاق وہ علم ہے جو اچھی اور بری نفسانی صفات اور ان کے مطابق اختیاری اعمال و رفتار کو بیان کرتا ہے اور اچھی نفسانی صفات کو حاصل کرنے، پسندیدہ اعمال کو انجام دینے اور بری نفسانی صفات اور نا پسندیدہ اعمال سے پرہیز کرنے کے طریقوں کو بتاتا ہے۔ (۲)

اس تعریف کی بناء پر علم اخلاق اچھی اور بری صفات کے بارے میںگفتگو کرنے کے علاوہ ان کے مطابق انجام پانے والے اعمال و رفتار کے بارے میں بھی بحث کرتا ہے۔ اس کے علاوہ نفسانی یا عمل فضائل تک پہنچنے اور برائیوں سے بچنے کے طریقوں کے بارے میں بھی بحث کرتا ہے۔

اس طرح علم اخلاق کے موضوع کویوں بیان کیا گیا ہے: اچھی اوربری صفات اور اعمال، اس وجہ سے کہ انسان کے لئے ان کا حاصل کرنا اور انجام دینا یا ترک کرنا ممکن ہو۔

۱۔ رجوع کیجئے: ابن مسکویہ: تہذیب الاخلاق و طہارۃ الاعراق، ص: ۵۱۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص: ۲۲۔

۲۔ رجوع کیجئے: ابن مسکویہ: تہذیب الاخلاق، ص ۲۷، طوسی۔ خواجہ نصیر الدین: اخلاق ناصری: ص ۴۸۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۶، ۲۷۔ صدر الدین شیرازی: الاسفار الاربعۃ، ج ۴، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔

چونکہ انسان کے اچھے اور برے صفات اور اس کے طرز عمل کی بازگشت اس کی جان و روح سے وابستہ ہے اس لئے بعض اخلاقی دانشوروں نے انسانی نفس کو علم اخلاق کا موضوع قرار دیا ہے۔ (۱) علم اخلاق کا آخری ہدف یہ ہے کہ انسان کو اس کے حقیقی کمال و سعادت تک پہنچائے کہ یہی کائنات اور انسان کی خلقت کا اصلی مقصد ہے. اس کمال و سعادت کی واقعی تفسیر اور اس کا محقق ہونا، اس بات میں ہے کہ انسان اپنی استعداد اور ظرفیت کے مطابق، نفسانی صفات اور کردار میں الٰہی اسماء اور صفات کا مظہر بن جائے تاکہ جہاں پوری طبیعی دنیا کسی ارادہ کے بغیر، خدا کے جمال وجلال کی تسبیح میں مشغول ہے، ویہٰاانسان اپنے اختیار اور اپنی آزادی کے ساتھ سب سے زیادہ گویا، مقرب اور مکمل الٰہی مظہر بن کر سامنے آجائے۔

۳۔ اخلاق کا فلسفہ

اخلاقی گفتگو میں قبل اس کے کہ اچھی اور بری صفات و اعمال کے مصادیق کو معین کیا جائے اور ان کو حاصل کرنے یا ان سے پرہیز کرنے کے طریقوں کو بیان کیا جائے، بعض ایسے بنیادی سوالات سامنے آتے ہیں جو دوسرے اخلاقی مباحث پر مقدم ہیں اور مخصوصاً عقلی ماہیت رکھتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

"اچھے" اور''برے" جیسے الفاظ اور عناوین کا مفہوم کیا ہے ؟

اخلاقی مفاہیم کی ماہیت و حقیقت کیا ہے ؟

اخلاقی قضیوں کی زبان، انشائی ہے یا اخباری ؟

صحیح یا غلط اخلاقی قضیوں کا مبدأ اور معیار کیا ہے ؟

کسی اچھی یا بری صفت یا رفتار کا معیار کیا ہے ؟

آیا اخلاقی قضیے مطلق (عالمی اور دائمی) ہیں یا نسبی(زمانی و مکانی ہیں) ؟

اخلاقی ذمہ داری کی حدیں اور شرطیں کیا ہیں ؟

اخلاقی مباحث و تحقیقات کا وہ حصہ جو اِن بنیادی سوالوں کا جوابدہ ہے اسے فلسفۂ اخلاق کہتے ہیں۔ اگرچہ اس کے مباحث کی ماہیت حتمی اور ہمیشہ عقلی نہیں ہوتی ہے، خاص طور سے فلسفۂ اخلاق کے جدید مکاتب فکر میں زبان و ادب کے لحاظ سے بھی (پہلے سوال کے مانند) گفتگو ہوتی ہے۔

۱۔ رجوع کیجئے: نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۶۔

٤۔ اخلاقی تربیت

لغت میں تربیت کے معنی کسی شئے کی صلاحیتوں کو پرورش دینا ہے۔یہ صلاحیتیں ممکن ہے جسمی و مادّی، علمی و عقلی ہوں اور ممکن ہے وہ قابلیتیں اخلاقی ہوں۔

اخلاقی تربیت سے مراد، پسندیدہ اخلاقی صفات و کردار کے حصول میں باطنی صلاحیتوں کو پرورش دینا، بلند اخلاقی فضائل کو حاصل کرنا اور برائیوں سے پرہیز اور ان کو نابود کرنا ہے۔اس بناء پر تربیت اخلاقی کا اہم کام، اخلاقی صلاحیتوں کو پیدا کرنا اور اخلاقی کمالات تک پہونچنا ہے۔ جبکہ علمی تربیت میں اصل مقصد علمی قابلیتوں کی پرورش کرنا اور اس کے اعلیٰ مراتب کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔اس بناء پر انسان کو ایک آلہ اور وسیلہ کی حیثیت دیکھا جاتا ہے۔

اخلاقی تربیت کا ربط علم اخلاق کے ایک اہم حصے سے ہے اور چونکہ اس کی اکثر باتیں عمل سے متعلق ہیں لہٰذا اس حصہ کو کبھی اخلاق عملی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں اخلاقی مباحث کا وہ حصہ جو اخلاقی لحاظ سے اچھائیوں اور برائیوں کی تعریف کرتا ہے اُسے کبھی اخلاق نظری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ب۔ علم اخلاق اور دوسرے علوم

علم اخلاق بھی دوسرے علوم کی طرح بعض موجودہ علوم سے مربوط ہے۔ہم یہاں دوسرے علوم پر علم اخلاق کے اثر اور اس سے مربوط بعض علوم جیسے علم فقہ، عرفان عملی و علوم تربیتی کا ایک جائزہ پیش کریں گے۔

۱۔ علم اخلاق اور فقہ

علم فقہ مکلّف انسان کے اعمال و رفتار کے بارے میں دو جہت سے بحث کرتا ہے:

الف۔ اُخروی آثار کے لحاظ سے یعنی ثواب وعقاب کے لحاظ سے، جو واجب و حرام جیسے عناوین کے تحت بیان ہوتے ہیں۔

ب۔ دنیاوی آثار کے لحاظ سے جس میں صحیح و باطل جیسے عناوین کے تحت گفتگو ہوتی ہے۔

فقہ کی پہلی قسم کے احکام کی حیثیت اخلاقی ہے اور ان میں سے بہت سے علم اخلاق سے مربوط ہیں۔

فقہ کی دوسری قسم کے احکام کا ربط علم اخلاق سے نہیں ہے، ان کی حیثیت صرف فقہی اور حقوقی ہے۔ [1]

۲۔ علم اخلاق اور حقوق

علم حقوق کا موضوع، معاشرے کے لئے وہ لازم الاجراء قوانین ہیں جنہیں حکومت پیش کرتی ہے اور وہ اس کی ذمہ دار ہے۔ اس بناء پر علم حقوق کا ربط فقط انسان کی اجتماعی و دنیاوی زندگی سے ہے اور اس کے سارے قوانین سب کے لئے ہوتے ہیں اور ان کا اجراء دنیاوی فلاح کے لئے ہوتا ہے۔ جبکہ علم اخلاق کا ربط، انسان کی فردی زندگی سے بھی ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح اخلاق کا ربط، فردی و اجتماعی زندگی سے بھی ہے اور اس میں بعض پر عمل ضروری اور بعض پر عمل ضروری نہیں ہوتا ہے۔ وہ اخلاقی احکام جن کی حقوقی حیثیت نہیں ہوتی۔ [2]

اور اُن میں دنیاوی فائدے بھی نہیں ہوتے وہ پاکیزگی نفس کے لئے اور اُخروی لحاظ سے لازم الاجرء ہوتے ہیں۔

علم اخلاق اور حقوق میں فرق ہونے کے باوجود دونوں میں یگانگت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف حقوق عدالت اجتماعی کے اجراء میں جس کا شمار بلند اخلاقی اقدار میں ہوتا ہے، اخلاق کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف علم اخلاق، اخلاقی خوبیوں کی ترویج اور برائیوں سے مقابلہ کرکے معاشرے کو پاک و پاکیزہ بناتا ہے۔ اس طرح یہ معاشرے میں نظم و ضبط اور عدالت برقرار کرکے علم حقوق کا بہترین معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے دونوں میں سے کسی ایک کا بھی نہ ہونا معاشرے کے لئے بہت زیادہ نقصاندہ ہے۔

۳۔ علم اخلاق اور عرفان عملی

عرفان ایک علمی اور ثقافتی نظام ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں: نظری اور عملی۔ عرفان نظری کا رابطہ ہستی (وجود)، یعنی خدا، دنیا اور انسان سے ہے۔ عرفان کی یہ قسم فلسفہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ عرفان عملی، خدا، دنیا اور خود سے

۱۔ البتہ کبھی کبھی اُن احکام کو جن پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے مثلاً مستحب و مکروہ، احکام اخلاقی یا آداب کہا جاتا ہے اور فقہ میں ان کے شامل ہونے کا معیار حکم کا لازم ہونا مانا جاتا ہے۔ یہ استعمال صرف ایک خاص اصطلاح ہے اور عام طور پر اس کا واسطہ اخلاق سے نہیں ہے۔

۲۔ غیر مذہبی حقوقی نظام میں حقوق کو اخلاق کے مقابل قرار دیا گیا ہے اور اُن دونوں کے لئے مشترک حدود اور موضوعات کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اسلامی حقوقی نظام میں بعض اجتماعی زندگی کے طریقے، اخلاقی ماہیت بھی رکھتے ہیں اور حقوقی ماہیت بھی۔ جس کے نتیجہ میں وہ حقوقی حکم اور اجراء کی ضمانت بھی رکھتے ہیں، جیسے چوری اور قتل۔

انسان کے رابطے اور ان کے فرائض کو بیان کرتا ہے۔ عرفان کی یہ قسم جس کو سیر و سلوک کا علم بھی کہتے ہیں، علم اخلاق سے زیادہ مشابہ ہے۔ عرفان عملی میں گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ سالک کو انسانیت کی معراج (توحید) تک پہنچنے کے لئے کہاں سے آغاز اور کن منزلوں کو ترتیب سے طے کرنا چاہئے اور اس سفر کی منزلوں میں کون سے حالات، اس سے روبرو ہو سکتے ہیں اور اس کے سامنے کون سے واقعات پیش آئیں گے۔ البتہ یہ تمام مراحل اس کامل اور تجربہ کار انسان کے زیر نظر ہوں جو خود اس سفر کو طے کر چکا ہو اور ان منزلوں کے قاعدے اور قانون سے آگاہ ہو اور اگر انسان کامل کی رہنمائی ہمراہ نہ ہو تو گمراہی کا خطرہ ہے۔ [۱]

اس طرح عرفان عملی کی بخصوص طور پر اخلاقی تربیت اور معنوی مقامات تک پہنچنے کے طریقوں اور وسیلوں کے ارد گرد گھومتی ہےاور حقیقت میں یہ مسئلہ علم اخلاق کے اصلی موضوعات میں شمار ہوتا ہے۔

٤۔ علم اخلاق اور تربیتی علوم

تربیتی علوم، علم نفسیات کے نتیجوں سے بہرہ مند ہو کر اور انسان کے سلیقوں پر حاکم قوانین کو پہچنوا کر اور اُن فارمولوں سے آگاہی کی کوشش کر کے جو انسان کے عمل اور رد عمل کے دائرہ میں ہیں، شکل اختیار کرتے ہیں اور علمی، اخلاقی و فنی مہارتوں کی قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لئے وسائل امکانات فراہم کرتے ہیں اور اگر ان کی توجہ اخلاقی عوامل پر ہے تو ان کی اُن عاملوں پر نظر وسیلہ اور آلہء کار کی حثیت رکھتی ہے اور چونکہ اخلاقی فضیلتوں کی وجہ سے تربیتی مرحلوں کو طے کرنے میں مدد ملتی ہے، لہٰذا اُن پر بھی توجہ کرتے ہیں۔ [۲]

اگر چہ علم اخلاق اس سے بلند ہے کہ اس کو تربیت کے ایک وسیلہ کے عنوان سے پہچنوایا جائے لیکن بعض اخلاقی حدود میں علم اخلاق اور تربیتی علوم (دونوں) حدود اور مسائل یعنی اخلاق علمی کے مانند مشترک ہیں۔

علم اخلاق اس (اخلاق علمی کے) دائرہ میں بھی، اصل علم و موضوع اور متعلقات پر اخلاقی نظر رکھتا ہے اور معلم و شاگرد کے مقاصد کو بھی اخلاقی لحاظ سے منظم کرتا ہے اور ساتھ ہی ان کے ایک دوسرے سے متعلق رابطوں کو، اخروی معیار کے مطابق مستحکم کرتا ہے۔ علوم تربیتی کی تربیت کرنے والے ان اخلاقی فارمولوں سے اور علم نفسیات کی معلومات نیز، خطا و آزمائش کے نتیجوں سے بہرمند ہو کر اپنے بلند اور قیمتی اہداف تک تیزی سے اور آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔

۱۔ رجوع کیجئے: شہید مطہری، مرتضیٰ: آشنائی با علوم اسلامی (عرفان) ص: ۱۸۱، ۱۸۶۔

۲۔ تعلیم و تربیت کی تعریف اور ماہیت کے سلسلہ میں مجموعی نظریات سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے "فلسفہء تعلیم و تربیت، دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، جلد اول، بخش دوم،، کی طرف رجوع کیجئے۔

ج۔ اخلاق سے متعلق نظریات

اخلاق کے بارے میںمسلمانوں کے درمیان خاص طور سے علمائے علم اخلاق کے درمیان تین نظریات پائے جاتے ہیں ابتداء میں اِن تین نظریوں کے بارے میں اجمالی طور پر گفتگو کی جائے گی پھر ان میں مورد قبول نظریہ کو پیش کیا جائے گا۔

۱۔ فیلسوفوں کا نظریۂ اخلاق

اس مکتب فکر کے افراد، افراط و تفریط کے مقابلہ میں جو رذائل اخلاقی میں سے ہیں، اخلاقی فضائل کے لئے حد اعتدال کو اختیار کرتے ہیں اور خوبی و بدی کے لئے اسی کو کسوٹی قرار دیتے ہیں۔اس بناء پر چونکہ انسان کے عمل کا سرچشمہ نفسانی قوتیں ہیں لہذا اس کے اعمال و کردار باطنی قوتوں میں اعتدال یا عدم اعتدال سے مربوط ہیں اس بناء پر اس مکتب میں قوائے نفسانی میں اعتدال اور اس میں افراط وتفریط سے بحث ہوتی ہے اور تمام دینی اخلاقی باتوں کو اسی معیار پر پیش کیا جاتا ہے۔ تربیت اخلاقی کے بارے میں یہ مکتب نفسانی قوتوں میں اعتدال کی نصیحت کرتا ہے ۔ ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق و طہارت الاعراق، نصیر الدین طوسی کی اخلاق ناصری اور کافی حد تک جامع السعادات، تصنیف مولیٰ محمد مہدی نراقی اسی مکتب و نظریہ کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔

اعتدال کی توضیح کے سلسلہ میں موجود مشکلوں کی وجہ سے نیز اخلاق کے تمام مفاہیم کی تفسیر میں جامعیت کے نہ ہونے کی بناء پر یہ مکتب تنقید کا شکار ہوا ہے اور چونکہ یہ موضوع علمی اور بہت زیادہ خشک ہے لہذا علماء اور فلاسفر کو چھوڑ کر عوام کے درمیان رائج نہ ہو سکا۔ (۱)

۲۔ عارفوں کا نظریۂ اخلاق

یعنی وہ اخلاق جس کو رائج کرنے والے صوفی اور عرفاء تھے۔اس طرح کے اخلاق نے جس کا زیادہ دار ومدار اخلاقی تربیت اور سیر سلوک پر ہے، ایک تربیتی نظام کو رائج کرنے اور اس کے آغاز و انجام و مراحل کے علاوہ

۱۔ استاد مطہری، مرتضیٰ: تعلیم و تربیت در اسلام، ص: ۲۰۰۔

اس راہ پر چلنے کے لئے ضروری وسیلوں کو معیّن کرنے پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ عارفانہ اخلاق کا محور (اصل مقصد) نفس سے جنگ وجہاد کرنا ہے۔پرہیز گار عارفوں کی ہمیشہ یہ کوشش تھی کہ اپنے اعمال و کردار کو شریعت کے ظاہر و باطن کے مطابق قرار دیں اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ان لوگوں نے اسی طرح دل اور محبت کی قدرت پر زور دے کر اور اشعار کی نفوذی زبان سے استفادہ کر کے اور تشبیہات واستعارات وکنایات کو استعمال کر کے لوگوں کے درمیان زیادہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری کی لکھی ہوئی کتاب "منازل السائرین، ، اور بہت سے معنوی وعرفانی مضامین والے فارسی اشعار کے معتبر دیوان جیسے مولوی کی مثنوی معنوی اور عطار نیشاپوری کی منطق الطیر اسی طرح کے اخلاق کو بیان کرتی ہیں۔

اس نظریۂ اخلاق میں بھی متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اس مکتب کا تنقیدی جائزہ اور اس کی قدر وقیمت کو طے کرتے وقت ضروری ہے کہ اس بات پر بھی توجہ کی جائے کہ اُن نظریات کو بطور کلی تقسیم کرنے پر اُن کے دو گروہ بنتے ہیں:

پہلا گروہ: وہ نظریات جو معنوی سلوک میں اصولی طور پر شریعت کی پابندی کو ضروری نہیں جانتے یا مختصر مدت اور ایک خاص مرحلہ تک ہی لازم مانتے ہیں۔

دوسرا گروہ: وہ نظریات جو شرعی احکام کی پابندی کو بلند معنوی مقامات تک پہنچنے کے لئے تنہا راستہ اور اسے ہمیشہ ضروری جانتے ہیں۔

پہلے گروہ کی قدر وقیمت کا اگر اندازہ لگایا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ ایک طرح سے نفس سے جنگ کرنے

میں افراط کا شکار ہوگئے اور اخلاق اسلامی کو زندگی سے موت کی طرف لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاق میں غور و فکر کی اہمیت کو بھی کافی حد تک فراموش کر چکے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ لوگ ایسی تعلیمات سے نزدیک ہو گئے ہیں جو قرآن وسنت کے بر خلاف ہے مثلاً خود پرستی (تکبر) اور نفس سے جہاد کے بہانے، نفس کی عزت اور کرامت کو فراموش کر دیا ہے۔

حالانکہ اخلاق اسلامی میں نفس کی شرافت و کرامت نہ صرف ایک اخلاقی فضیلت ہے [۱] بلکہ اسے حاصل کرنا اور تقویت پہنچانا تربیت کا خود ایک طریقہ ہے۔ [۲]

لیکن عرفانی نظریہ کے دوسرے گروہ والے جو شریعت سے وفاداری کو اپنی تعلیم کے لئے سرِ لوح (بنیاد) اور لازم قرار دیتے ہیں، معنوی سفر کے قاعدوں کو منظم کرنے اوراُن کے مبدأ و مقصد اور اس سفر کے مرحلوں کو معین کرنے سے حاصل نتیجوں کو اور ان قدرتمند عناصر (جیسے محبت، ذکر، معنوی بلندی کے لئے نظارت) کے استعمال کرنے کی کیفیتوں کو جو اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں بہت ہی کار آمد و مفید ہیں، اپنے ہمراہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اِن تمام امور کو قرآن و روایات کے مطابق جانتے ہیں۔ تربیت کے ان جذاب نتیجوں کو اخلاق اسلامی کے توصیفی مباحث کے ہمراہ کرنا اسلام کے اخلاقی نظام کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

۳۔ اخلاق نقلی [۳]

یعنی وہ اخلاق جیسے محدثین نے اخبار واحادیث کو نقل ونشر کر کے لوگوں کے درمیان بیان کیا ہے اور اس طرح اسے وجود میں لائے ہیں۔ [٤]

اس نظریہ میں اخلاقی مفاہیم کو کتاب وسنت کی بنیادپر بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عمل اُن مفاہیم پر حاکم، واقعی تربیت اور ان کے درمیان پائی جانے والی مناسبتوں پر کافی و وافی توجہ کے بغیر ہوتا ہے۔ اس طرح کے متن اکثر اخلاقی مفاہیم کی توصیف کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں اور ان کی بنیادوں اور عملی نمونوں پر کم توجہ دیتے ہیں۔ اس بناء پر (اس نظریہ میں) اخلاق کی ابتداء و انتہا مخصوصاً اخلاقی تربیت زیادہ واضح نہیں ہے۔ اس اخلاقی روش میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی ہے جس کی بناء پر اسے ایک اخلاقی نظام کہا جا سکے اور جو اخلاق کی بنیادی بحثوں کو بھی شامل کئے ہو اور تربیتی و توصیفی بحثوں کو بھی عقلی ترتیب کے لحاظ سے پیش کئے ہو۔اس روش پر لکھی ہوئی

۱۔ (وَ لِلّٰهِ العِزَّةُ وَ لِرَسُولِه وَ لِلمُومِنِين) (سورہ: منافقون، آیت: ۸)۔

"وَلاَ تَکُن عَبد غَیرکَ وَ قَد جَعَلَکَ اللّٰهُ حُرّاً، ، (نہج البلاغہ: نامہ ۳۱)۔

۲۔ مقدس اسلامی کتابوں میں مکارم اخلاق (مکارم یعنی بڑی خوبیاں) سے مرادیہی ہے۔

بعض روایتیں، جیسے"مَن کَرُمَت عَلَیه نَفسَه هَانَت عَلَیه شَهوَاته، ،۔(نہج البلاغہ، حکمت: ٤٤١)۔

ایضاً:"مَن هَانَت عَلَیه نَفسَه فَلَا تَمَن شَرَّہ، ،۔(تحف العقول، ص: ٤٨٣) اس بات کو بیان کرتی ہیں۔

۳۔ نقلی سے مراد آیات و روایات یا کسی کے قول کو نقل کرنا ہے۔٤۔ استاد مطہری، مرتضیٰ: تعلیم وتربیت در اسلام، ص: ۲۰۱۔

کتابیں، اخلاقی مواد و مطالب کے لحاظ سے غنی ہونے کے باوجود، شکل وصورت کے لحاظ سے مناسب ورضایت بخش نہیں ہیں۔ محمد غزالی کی احیاء العلوم اور فیض کاشانی کی المحجۃ البیضاء جیسی کتابیں اس طرح کے اخلاقی مضامین کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اس کتاب میں ایسا قابل قبول قاعدہ ہے جو تینوں مذکورہ طریقوں میں پائے جانے والے مثبت نکات کی ترکیب اور ان کا مجموعہ ہے۔ اسی کے ساتھ اس قاعدہ میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مذکورہ طریقوں میں پائی جانے والی کمیوں کو پورا کیا جائے۔ اس بناء پر اس قاعدہ میں اولاً یہ کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان اخلاق اسلامی کو شکل و مضمون کے لحاظ سے منطقی و عقلی قاعدوں کی بنیاد پر بیان کیا جائے۔ ثانیاً عارفوں کے نتیجوں اور تجربوں سے حتی المقدور استفادہ کیا جائے اور ثالثاً اخلاقی فیصلوں کا معیار ہمیشہ قرآن و روایات کو قرار دیا جائے۔

اس روش میں کتاب خدا اور نبی اکرم اور اُن کے اہلبیت اطہار (ع) کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے جن خوبیوں کو گذشتہ اخلاقی طریقوں اور مکاتب میں شمار کیا گیا ہے، وہ سبھی موجود ہیں۔ اخلاق اسلامی میں وسعت کی بناء پر اصلی اخلاقی سوالوں کے جواب بھی ملیں گے اور اس میں اخلاقی مفاہیم پر بحث بھی شامل ہوگی اور اسی کے ساتھ طریقۂ کار اور تربیت کے عملی طریقوں اور قوانین کی توضیح بھی کی گئی ہے۔ یہاں اسلامی مفاہیم پر ایک خاص نظام حاکم ہے۔ ہر مفہوم کی دوسرے مفاہیم سے نسبتوں پر اور اخلاقی نظام کے مجموعہ میں ان کی اہمیت پر بھی دقت کی گئی ہے۔ اخلاق تربیتی پر زیادہ توجہ کے ساتھ ہی مخاطبین کے شعور کی مناسبت سے راستوں اور وسیلوں کو پہچنوایا گیا ہے اور اس میں مبدأ و مقصد، درجات و مراتب کا بھی خیال کیا گیا ہے۔ معرفت اور جہاد بالنفس پر خاص توجہ کے ساتھ ہی انسان کی عزت و شرافت و بزرگی پر بھی تاکید کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اخلاقی مفاہیم کو سمجھنے اور بیان کرنے اور عمل کی ترغیب کے لئے عقلی نتیجوں کو سامنے رکھ کر محبت و دوستی کو اس معنوی سفر کے لئے کامیاب اور نتیجہ تک پہنچانے والے وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

اس نظریہ کا وحی سے نسبت رکھنا اور اس کا شریعت کے مطابق ہونا اس کی جوہری خصوصیت ہے۔ اس کے باوجود، عقلی میزانوں، عرف و عقل کے مسلّم اصولوں، اور معنوی سفر میں پیش قدمی کرنے والے سچے لوگوں کے عملی تجربوں سے، نیز قرآن و سنت میں جو کچھ آیا ہے اسے سمجھنے، اس کی تفسیر، تطبیق و اجراء کرنے میں غفلت نہیں کی گئی ہے۔

اس بناء پر اس مقبول اخلاقی نظریہ کی کچھ خاص خصوصیتوں کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ مباحث کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا اور ان کے بر خلاف نہ ہونے کو واضح کرنا۔

۲۔ ایسا جامع نظام پیش کرنے کی کوشش کرنا جو تمام اخلاقی سوالوں کا جواب دے سکے۔

۳۔ ایک ایسی تفسیر پیش کرنا جو معتدل اور اخلاقی مفاہیم کے موافق ہو۔

٤۔ اخلاقی بحثوں کو عقلی لحاظ سے مطالعات کے تین حصوں (اصولی، توصیفی، ترتیبی) میں تقسیم و ترتیب دینا۔

٥۔ اخلاقی تربیت کے وسیلوں اور ان کی طبیعی ترتیب پر توجہ دینا اور ان کا شرعی ہونا۔

٦۔ تہذیب اخلاق (خوش اخلاقی) میں پیش قدم و کہنہ مشق (تجربہ کار) لوگوں کے تجربوں سے عملی فائدہ حاصل کرنا۔

۷۔ کتاب و سنت میں وارد ہوئے مصداقوں کے درمیان سے اخلاق کے کلی اصولوں اور قاعدوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔

۸۔ عمل اور نفسانی ملکات کے مختلف حلقونکے بارے میں اسلام کے نظریہ کو مستقل طور پر البتہ ہر ایک کی تثیر پر توجہ کرتے ہوئے بیان کرنا۔

۹۔ فکر، نفسانی ملکات، رفتار و کردار پر آپس میں پڑنے والے ہر ایک کے اثرات پر توجہ کرنا۔

۱۰۔ اخلاقی مفاہیم کی تفسیر اور عمل میں، عقل، فطری رجحانات اور عملی آثار اور تجربوں کے مرتبہ پر توجہ کرنا۔

۱۱۔ اخلاقی لیاقتوں کے توازن اور اُن سب کی باہمی ترقی پر تاکید کرنا اور اُن میں افراط و تفریط سے پرہیز کرنا۔

۱۲۔ اخلاقی قوانین کو استعمال کرنے میں مخاطبین کی خاص حالت و کیفیت پر توجہ کرنا۔

د: اخلاق اسلامی کے مباحث کی تقسیم

یہ اخلاق، اسلامی مفہوم کے مطابق اور قرآن و عترت اطہار (ع) کے ذریعہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کی روشنی میں علم اخلاق کے اُن بنیادی سوالوں کا جن کی گفتگو آج فلسفۂ اخلاق میں کی جاتی ہے، جواب دیتا ہے اور مطلوب و کامل انسان کو نفسانی صفات اور عمل کے مختلف نمونوں کے طور پر نمایاں بھی کرتا ہے۔ ان دو مسئلوں کے علاوہ، مثالی انسان اور سب سے بلند معنوی مقامات تک پہنچنے کے لئے علمی و اجرائی، عملی قاعدوں اور ضابطوں کو پہچنواتا ہے۔ اس بناء پر اخلاق اسلامی منظّم ومرتّب طور پر مندرجہ ذیل تین فصلوں میں تقسیم وترتیب پاتا ہے:

۱۔ اخلاق کی بعض بنیادی اور فلسفی بحثیں

اخلاق کی حقیقت اوراخلاقی عمل کے ضروری عناصر سے واقفیت اور ان کو پہچنوانا۔

۲۔ اخلاقی خوبیوںاوربرائیوں کی توصیف

نفسانی صفت کے عنوان سے بھی اور عمل کے مختلف حدود میں بھی۔

۳۔ اخلاق تربیتی

انسان کو اخلاقی فضیلتوں سے آراستہ اوربرائیوں سے پاک کرنے کے لئے وسیلوں اور طریقوں کو بیان کرنا۔

دوسری فصل : اخلاق کی جاودانی

مقدمہ

۱۔ مسئلہ کی وضاحت:

ناقص بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، چوری کرنا، قومی برتری پر اعتقاد رکھنا وغیرہ بعض گذشتہ معاشرے میں جائز مانا جاتا تھا اور اُنھیں اخلاق کے خلاف شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ آج معاشرے کی اکثریت ان چیزوں کو غیر اخلاقی مانتی ہے۔ اس زمانے میں بھی مختلف تہذیبیں اخلاقی فضائل ورذائل کے بارے میں متعدد قسم کے نظریات رکھتی ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ بعض معاشرے "چند بیویوں، ، کے ہونے کو جائز اور حجاب کو ضروری جانتے ہیں، اکثر عیسائی تہذیبوں میں "چند بیویوں، ، کا ہونا غیر اخلاقی بات اور حجاب کو غیر ضروری جانا جاتا ہے۔

اس طرح کی حقیقتوں پر توجہ کرنے سے ہم اخلاق سے متعلق ایک اہم سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ کیا اچھی اور بری اخلاقی عادتیں اور خصلتیں آفاقی و جاودانی ہیں ؟ اخلاقی عدالتوں نے انسانوں کی ظاہری اور باطنی صفتوں کے لئے جن احکام کو صادر کیا ہے کیا وہ عالمی اور ابدی اعتبار رکھتی ہیں ؟ دوسرے لفظوں میں کیا اخلاقی خوبیا ں اور برائیاں مطلق اور عام ہیں یا نسبی خصوصیتیں رکھتی ہیں اور تنہا کسی خاص دور اور زمانہ یا خاص مکان و معاشرہ اور مخصوص حالات کے لئے اعتبار اور معنی رکھتی ہیں ؟

۲۔ بحث کی تاریخ:

اس بحث کی شروعات قدیم یونان کے زمانہ تک پہنچتی ہے اور مغربی ملکوں کے جدید علمی زمانہ میں بھی یہ سوال اخلاقی فلسفیوں کے لئے ایک بنیادی سوال بن گیا ہے۔ اسلامی مکاتب میں اخلاق کے نسبی رجحان کو اشعری متکلمین کے یہاں پایا جا سکتا ہے، اگرچہ ان لوگوں نے اشیاء کے عقلی وذاتی حسن وقبح
سے انکار کرنے میں " اخلاقی نسبیت"(E t h i c a l r e l a t a i v i t y)کی اصطلاح سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔
لیکن یہ بحث موجودہ زمانہ میں مسلمان دانشوروں کے علمی حلقوں میں بھی ایک بلند درجہ رکھتی ہے اور مختلف زاویوں سے اس پر بحث کی گئی ہے۔

۳۔ موضوع کی دینی اہمیت:

اُن آثار کے علاوہ جو اس بحث کے نتیجوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور آگے بیان کئے جائیں گے یہ موضوع مسلمانوں کے سب سے زیادہ بنیادی و کلیدی عقیدوں اور اعتقادی و ایمانی ارکان میں سے کسی ایک سے بہت زیادہ نزدیکی رابطہ رکھتا ہے۔ اسلام کا مکمل اور خاتم ہونا اور نتیجۃً اس کا عالمی اور جاودانی ہونا ایسی خصوصیت ہے کہ ا سے گذشتہ و حال کے کٹگھروں سے آزاد کرتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ، گذشتہ وآئندہ کے ادیان سے بشر کے بے نیاز ہونے کو بیان کرتا ہے، اخلاق کا جاودانی ہونا اس بات کی تاکید ہے کہ جغرافیائی موقعیت، تاریخی ادوار، زمان و مکان کے حالات، دینی تعلیمات اور منجملہ ان کے اخلاقی احکام اس کو اپنے زیر اثر قرار نہیں دیتے ہیں مگر ان مجاز و بہتر راستوں سے جسے دین نے خود معین کیا ہے۔

وہ مبانی و نظریات جو نسبیت کو اچھائیوں اور برائیوں کے دائرہ میں قبول کرتے ہیں، اسلام کے کمال اور خاتمیت کی معقول تفسیر کے سلسلہ میں ٹکراتے نظر آتے ہیں۔ اس بناء پر مذکورہ اصل کی پابندی، اخلاقی مفاہیم میں ثبات و اطلاق کے اثبات کی مرہونی ہے۔ یہ بات ثابت ہونا چاہئے کہ اخلاقی موضوعات کی ابتدائی طبعیت ہمیشہ ایک حکم رکھتی ہے اور جغرافیائی اختلاف زمانہ کا گذر، تہذیبوںکا اختلاف، ایک اخلاقی موضوع کے اچھائی یا برائی سے متّصف نے میں کوئی اثر نہیں رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ سوال کا جواب دینے کا ہمارا طریقہ اخلاق کے سلسلہ میں ہمارے نظریہ کو بھی بیان کرے گا اور اخلاقی تحقیقات کے تانے بانے پر بہت اثر ڈالے گا اور نہ صرف اخلاقی اچھائی اور برائی کے سلسلہ میں ہمارا فیصلہ بدل جائے گا بلکہ اخلاق میں بحث کے طریقے، اس کے منابع اوریہاں تک کہ اخلاقی احکام کے مخاطبین کے حدود کو بھی بیان کرے گا۔

٤۔ اطلاق اور نسبیت کا مفہوم:

اخلاقی مطلق پسندی سے مراد اس عقیدہ پر زور دینا ہے کہ اخلاقی اصول و تعلیمات، اخلاقی موضوعات کی ذات اور ان کے حقیقی آثار ونتائج کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز سے وابستہ نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کسی موضوع کے اچھے یا برے ہونے کی جو چیزیں سبب بنتی ہیں صرف موضوع کی ذات میں موجود عناصر کا مجموعہ اور اس پر پڑنے والے واقعی آثارہیں نہ کہ اس سے باہر کے حالات و حوادث۔ جیسے کسی سماجی، اجتماعی، ثقافتی، اقتصادی زندگی کے حالات یا فاعل کے ذوقی ونفسیاتی حالات۔ اس بناء پر بوڑھوں کی مناسب طریقہ سے دیکھ بھال کرنا، ابتداء سے پرہیزگار و پاک دامن رہنا اور اخلاقی لحاظ سے دوسروں کی عزت کی حفاظت کرنا اگر ایک پسندیدہ عمل مانا گیا ہے تو اصولی طور پر ہر زمان ومکان میں اور ہر فاعل کے ذریعہ تمام حالات میں اسے سراہا گیا ہے اور اخلاقی بھی مانا گیا ہے مگر یہ کہ حالات کا بدل جانا عمل کی ماہیت میں تبدیلی کا سبب قرار پائے

یا قدروں کے درمیان کش مکش کا سبب بن جائے۔ (۱)

نسبیت یعنی ایک شئے کا اس کے اصلی آثار اور ذات سے خارج و متغیر امر یا امور سے وابستہ ہونا۔ اس بناء پر ایک اخلاقی مفہوم کی نسبیت خواہ فضیلت ہو یا رذیلت اس طرح سے ہے کہ ایک باطنی صفت یا ظاہری رفتار پر اس کا صادق آنا یا نہ آنا معلوم ہو اور وہ صفات (باطنی یا ظاہری ہوں) اپنے اصلی آثار اور حقیقت سے خارج اور متغیّر عناصر سے وابستہ ہوں۔ جیسے اس صفت کا حامل انسان یا اس رفتار سے مربوط فاعل، وہ سماج جس میں وہ انسان زندگی گذار رہا ہے اور جس میں وہ قاعدہ و طریقہ پایا جاتا ہے، اور اس زمانہ کے حالات۔ مثلاًبوڑھوں سے متعلق رفتار، اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ ایک حکم نہیں رکھتی۔ یا مختصر شراب پینا یا حجاب کی پا بندی نہ کرنا، عیسائی سماج میں زندگی بسر کرنے والے کے لئے ایک اخلاقی برائی شمار نہیں کی جاتی لیکن اسلامی سماج میں زندگی گذارنے والے کے لئے ایک برا اور اخلاق کے خلاف عمل مانا جاتا ہے۔ (۲)

ایک موضوع کو اخلاقی اچھائی یابرائی سے متّصف ہونے کے اعتبار سے موضوع کی ذات اور اس کے اصلی آثار سے باہر کس متغیّر چیز کے تابع قرار دیا جائے اس کے لئےاخلاقی نسبت پسندی کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ایک کلی تقسیم کی بناء پر (۳) وہ لوگ جو اخلاقی اصول کو سماجی تہذیب کی تبدیلی کے تابع قرار دیتے ہیں وہ نسبیت قرار دادی (۴) کے طرفدار ہیں اور وہ لوگ جو اسے انسان کی خواہش اور انتخاب کے تابع قرار دیتے ہیں، نسبیت ذہنی (۵) کو قبول کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ جو اخلاقی اصول کے لئے عینی وخارجی اصل اور مبدأ کے قائل ہیں وہ اصالت عین (۶) کے طرفدار ہیں۔

۱۔ رجوع کیجئے: اسی کتاب میں اخلاقی قدروں میں تزاحم اور ترجیح کا معیار اور سوالات وجوابات کی طرف (صفحہ ٦٧ پر)۔

۲۔ رجوع کیجئے علامہ طباطبائی: المیزان، ج: ۱، ص: ٣٧٦، ٣٧٧۔

٣۔ رجوع کیجئے: لوئس پویمن۔ نقدی بر نسبیت اخلاقی، ترجمہ فتح علی۔ (بحوالۂ مجلّہ نقد و نظر، ش ١٣، ١٤، ص٣٢٦)

۴۔Conventional ۵۔Subjectivism ۶۔Objectivsm

دوسری تقسیم کے لحاظ سے اخلاقی نسبیت پسندی کی قسموں کو مندرجہ ذیل طریقہ سے بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔علم حیات کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی اصول، انسان کی متغیر زندگی کے حالات کے تابع ہیں۔

۲۔علم سماجیات کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی اصول اس سماج کے متغیر حالات کے تابع ہیں جس میں انسان زندگی گذارتا ہے۔

۳۔علم نفسیات کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی مفاہیم، انسان کے متغیر نفسیاتی حالات اور اس کے ذوق وشوق، رغبت وسلیقہ کے تابع ہیں۔ اس طرح کی قسم کو کبھی ذوقی نسبیت پسندی یا (نظریۂ اصالت وجود) {E g z i s t a n s i al i s m} اگزسٹنسیا لیسٹی بھی کہتے ہیں۔

٤۔تہذیب وثقافت کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: اخلاقی فضائل و رذائل اخلاقی سماج کے آداب و رسوم کے پابند ہیں۔

٥۔ مادہ پرستی کے سلسلہ میں نسبیت کا رجحان: کسی صفت یا رفتار کی اچھائی یا برائی کا معیار، انسانوں کے درمیان مادی لحاظ سے برابری اور مساوات کو ایجاد کرنے اور امکانات کو مساوی لحاظ سے تقسیم کرنے کے سلسلہ میں اس کی تثیر و کارکردگی کو قرار دیا گیا ہے۔ (۱)

الف۔ اخلاقی نسبیت پسندی کے نتیجے:

کلی طورپر اور ہر اس دلیل و مبنیٰ کی بنیاد پر جسے دعوے کے طورپر پیش کیا جائے، اخلاقی نسبیت کا رجحان، تباہ کن نتائج کا حامل اور غیر قابل قبول ہے اور وہی دلیلیں اسے باطل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس کے بعض کلی اور مشترک نتیجے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ذمہ داری کا سلب ہونا:

اخلاق مطلق اور عمومی و جاودانی اصول سے انکار کرنے سے کسی بھی انسان کو اس کی رفتار کے مقابلہ میں، اخلاقی لحاظ سے اور بہت سی جگہوں پر حقوقی لحاظ سے بھی ذمہ دار نہیں مانا جاسکتا ہے۔ (۲)

۱۔ رجوع کیجئے: پُل رو بیجك: موافق و مخالف اگزسٹنسیا لیزم، ترجمہ: سعید عدالت نژاد، نقل از مجلہ ٔ نقد و نظر، ش ۱۳۔۱٤، ص: ۳۰۰تا۳۲۳۔

۲۔ رجوع کیجئے: پُل رو بیجك: ایضاً، (نقل از مجلہ ٔ نقد و نظر، شمارہ: ۱۳۔۱٤، ص: ۳۰۵)۔

۲۔اخلاقی احکام کا بے ثمر ہونا:

اخلاقی احکام اور قضیے اس صورت میں مفید ہیں جب وہ تاثیر گذار ہوں۔ اس کے علاوہ مخاطبین کے ذوق و شوق، تسلیم و رضا کو پروان چڑھائے اور ان کو ایثار و فداکاری کے لئے آمادہ کرے۔ یہ چیزیں عام و مطلق کی حقانیت اور اخلاقی اصول کی جاودانی کو قبول کرنے اور ان سے عشق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاقی نسبیت کا رجحان ان تمام امور سے ٹکراؤ رکھتا ہے اور ہر طرح کے مشترک اخلاقی اصول کی سفارشوں سے لگاؤ اور اس سے محبت کی گرمی کو ٹھنڈا کردیتا ہے۔[1] جس کے نتیجہ میں تبلیغ و ہدایت اور ارشاد و تربیت بے معنی ہیں اور خدا کے نبیوں اور ولیوں کو بشر کی ہدایت کے لئے نہ کسی اجازت کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی سماجی مصلحین اپنی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے لوگوں کے کسی معقول جواب کے منتظر رہ سکتے ہیں۔

۳۔ دین کے مکمل اور جاودانی ہونے کی نفی:

اخلاق دین کی نظر میں ایک بلند اور وسیع مرتبہ کا حامل ہے۔ اور اتنا بلند ہے کہ اس کی نظر میںتکوین و تشریع کا اصل مقصد، اخلاق کی عالی فضیلتوں تک پہنچنا اور اسے حاصل کرنا بتایا گیا ہے۔اسی وجہ سے دین کی تمام تعلیمات میں اخلاقی باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اکثر دینی تعلیمات براہ راست اخلاقی موضوعات کے بارے میں ہوتی ہیں۔

اس حقیقت پر توجہ کرتے ہوئے اخلاقی احکام کے عدم ثبات اور تغیّر کو قبول کرنا دینی تعلیم کا عصری اور وقتی ہونا مانا جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دین کے کامل اور خاتم ہونے کی نفی کردی جائے۔ اس بناء پر اخلاقی نسبیت اور دین کا عالمی و جاودانی ہونے میں ٹکرائو نظر آتا ہے جبکہ کمال اور خاتمیت دین کی شان ہے۔

٤۔ اخلاقی شکّاکیت:

اخلاقی نسبیت پر اعتقاد رکھنے سے کسی اخلاقی موضوع کے سلسلہ میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔ اخلاقی نسبیت پسندی سے تہذیبی ماحول اور کسی خاص سلیقہ کے تحت، صداقت کے قبیح ہونے کے بارے میں کسی فیصلہ کا جتنا احتمال ہوسکتا ہے اتنا ہی حسن صداقت کے سلسلہ میںبھی ممکن ہے۔ اخلاقی نسبیت پسندی، واقعیت کی توصیف اور اسے بیان کرنے والے کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ اخلاقی احکام کی ماہیت کے بارے میں اپنے نظریہ کو بیان کرنے کی حیثیت سے ہے اور اس کے مطابق اخلاقی اصول کا سالم وناسالم ہونا، انسان یا سماج کے متغیر عوامل پر منحصر ہے۔ اس بناء پر کسی اخلاقی موضوع کے بارے میں کوئی مستقل فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہی اخلاقی شکاکیت ہے۔

۱۔ رجوع کیجئے: پل رو بیجک: (نقل از مجلہ ٔ نقد و نظر، شمارہ: ۱۳۔۱٤، ص: ۳۱۲)۔

۵۔خادموں اور خائنوں کا یکساں ہونا:

اخلاقی نسبیت کا سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور وجدان کے خلاف نتیجہ یہ ہے کہ خدمت وخیانت، اصلاح وجنایت، خیر خواہی وشرارت وغیرہ اخلاقی دائرہ میں سبھی برابر اور سبھی ایک نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ایک ہی طریقہ سے ان کی تعریف و تنقیص ہوتی ہے۔اس بناء پر فرعون و معاویہ کا عمل اتنا ہی معقول ہوگا جتنا حضرت آسیہ وحضرت زینب کے عمل کو پسندیدہ کیا گیا ہے۔

ب۔ اخلاق میں مطلق پسندی اور اس کی دلیلیں

اخلاقی نسبیت کے رجحان کے تباہ کن نتیجوں پر توجہ کرنے کے بعد ضروری ہے کہ جاودانہ اخلاق کی معقول اور عقلی بنیادوں پر بیان کیا جائے اور اُن نظریاتی اختلافات اور نقصانات کو راستہ سے ہٹادیا جائے جو اس نظریہ کے لئے خطرہ کا باعث ہیں۔ اس نظریہ کو حاکم بنانا اور اس کا معقول قوام واقتدار حاصل کرنا اس شرط کے ساتھ ہے کہ اپنے دعوے کو عقل وبرہان کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

۱۔پائدار اخلاق کی نشاندہی کی ضرورت:

اخلاقی نسبیت کے رجحان کے بعض نتیجوں پر اجمالی نظر ڈالتے ہی اخلاق کے جاودانی ہونے کی ضرورت آشکار ہوجاتی ہے۔ انسان کا با مقصد ہونا اور اس کا اپنی ذمہ داری کو قبول کرنا، تعلیم وتربیت اور ترغیب وترہیب (ڈرانے) کی حکیمانہ توجیہ، عدل وظلم کے بارے میں گفتگو کا امکان، انسانی حقوق کا دفاع اور اس کی حق تلفی کے خلاف جنگ، فضیلت ورذیلت، خیر و شر، خائن وخادم، جزاء و سزا، ثواب وعقاب، جنت و جہنم، عادل وفاسق کے درمیان تمیز پیدا کرنا، انبیاء واولیاء کی رسالت، مصلحین اور خیر خواہوں کی کوششوں کا دفاع کرنا، ابدی اور کامل دین کی طرفداری، اخلاقی حسن وقبح کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے عمومی اصولوں اور معیاروں کی نشاندہی کا امکان اور دسیوں اور سیکڑوں ایسے انسانی زندگی کے اصول و ارکان جن کو نظر انداز کرنے سے انسانی زندگی کا شیرازہ بکھرجائے گا لہٰذا اُن کی بقاء صرف ثابت اور پائدار اخلاقی اصولوں کو قبول اور بیان کرنے اور اُن کی نشاندہی کرنے سے ممکن ہے۔

۲۔ اخلاق کے جاودانی اصولوں کو بیان کرنا:

مختلف اخلاقی مکاتب میں اخلاق کے جاودانی اصولوں کی عقلی تفسیر مختلف شکلوں میں کی جاتی ہے۔یہاں اختصار کے طور پر اخلاق کی صرف اُن بحثوں کا ذکر ہوگا جو اسلامی دائرہ میں داخل ہیں۔اس دائرہ میں اخلاق جاودانہ کے عقلی بنیادوں کو بیا ن کرنے کے لئے جس مطلب کو سب سے زیادہ قوی مانا گیا ہے

وہ حقیقت میں اخلاقی فرائض کی بحث کے سلسلہ میں علامہ طبا طبائیؒ کی قائم کردہ بنیادوں سے اخذشدہ نظریہ ہے۔اس نظریہ کی مختصر شرح درج ذیل عبارت میں بیان کی جارہی ہے۔

اخلاقی مفاہیم، انسان کے اختیاری افعال کے درمیان عینی اور حقیقی رابطوں کا نتیجہ اور مظہر ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ مفاہیم اُن دونوں (عینی اور حقیقی رابطوں) کے درمیان پائے جانے والے علت و معلول کے رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ رابطہ فاعل کے علم وجہل و ارادہ اور سماج پر حاکم حالات سے آزاد و مستقل اور حقیقی ہوتا ہے۔ اخلاقی خوبی و بدی اور اوامر و نواہی اسی واقعی وتکوینی نسبت کا مظہر ہیں، اِسے جیسے انسان کے اختیاری فعل کا اس کے نفسانی کمال پر پڑنے والی تاثیر کی نوعیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ رابطہ، عینی وتکوینی ہے اور علیت کے رابطہ کی نوعیت سے متعلق ہے لہٰذا وہ تغیّر و تحوّل سے دوچار نہیں ہوتا۔ دونوں (عینی اور حقیقی) روابط کے ثبات و پائداری کی وجہ سے یہ نسبت ثابت و جاودانی ہے۔ اس طرح اس سے حاصل اخلاقی مفاہیم بھی عالمی اور جاودانی ہیں۔ کیونکہ انسان کی روح اور حقیقت میں جو رابطہ کا ایک سرا ہے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اور وہ مشخص فعل اور عمل بھی جو اخلاقی حکم کا موضوع اور رابطہ کا دوسرا سرا ہے، اسے بھی واحد اور ثابت فرض کیا گیا ہے۔ [۱]

کتاب و سنت کی نظر میں بھی انسان کی واقعی شخصیت اور روح پر اس کے اختیاری اعمال کا رابطہ اور اثرایک حقیقی اورعینی امرہے۔ یہ حقیقت قرآن میں جابجا نظر آتی ہے۔ نمونہ کے طورپرچند مورد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے قرآن کریم اُن لوگوں کے بارے میں جو قیامت اور آیات الٰہی سے انکار کرتے ہیں، فرماتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کی بد اعمالیوں کی تاریکی نے ان کے دلوں پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ [۲]

علامہ طباطبائیؒ کے قول کے مطابق اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔برے اعمال کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور وہ انسان کے نفس کو اپنے مطابق بنادیتی ہیں۔

۲۔ یہ نقوش اور صورتیں، نفس اور حقیقت کو درک کرنے میں مانع اور حائل ہوجاتی ہیں۔

۱۔ رجوع کیجئے: علامہ طبا طبائی، اصول فلسفہ و روش رئالیسم، مقالہء اعتباریات و رسائل سبعہ، مقالہء اعتباریات۔اسی طرح زیادہ معلومات کے لئے رجوع کیجئے: استاد مطہری کی جاودانگی و اخلاق، یادنامہ استاد مطہری، ج: ۱، ص: ٤١٠، ٤١٨ وانہی استادکی: حکمت عملی، ص: ١٤، ٢٠ و اسلام و مقتضیات زمان ج: ۱، ص: ٣٤١، ٣٥١ وج: ٢، ص: ٢٤٦۔

٢۔ سورہٴ مطففین، آیت: ١٤۔

۳۔نفس اپنی ابتدائی طبیعت کے لحاظ سے ایسا پاک اور نورانی ہوتا ہے کہ حقائق کو درک کرسکتا ہے اور حق و باطل کے درمیان تمیز پیدا کرسکتا ہے۔[۱]

اسی طرح قرآن کریم میں آیا ہے کہ جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا خدا اس کے لئے نجات کا راستہ کھول دے گا۔[۲]

اور فرمایا کہ اے ایمان لانے والو! اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کروگے تو حق وباطل میں تشخیص کی قدرت تم کو وہ عطا کردے گا۔[۳]

علامہ طباطبائی مرحوم اِن آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"معرفت" حاصل کرنے کے لئے تقویٰ ایک مستقل ذریعہ نہیں ہے بلکہ تقویٰ، انسان کی طبیعت کے اپنے فطری اعتدال پر پلٹنے کے لئے سبب بنتا ہے اور یہ اعتدال اس بات کا سبب بنتا ہے کہ انسان کی رغبتیں پہلے کی بہ نسبت عالی بن جائیں اور اس کے ذریعہ بہتر اعمال انجام پائیں۔یعنی اعمال صالح، پسندیدہ اور نیک اخلاق کی حفاظت کا ضامن نیز حقیقی معرفت، مفید علوم اور صحیح افکار کی پیدائش کا موجب بنتا ہے۔[٤]

اس بیان میں فضیلتوں اور رذیلتوں کے پیدا ہونے کے اسباب کے ثابت ہونے کی کیفیت کی شرح کے ساتھ خوبی اور بدی کے اطلاق اور اثبات کو نتیجہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یعنی جب انسان کی باطنی طاقتیں ثابت ہیں اور ان میں افراط وتفریط و اعتدال جیسی تینوں حالتیں بھی ایک ہی طرح ہیں، لہٰذا اخلاقی فضایل ورذایل جو انھیںؐحالات سے وجود میںآتے ہیں بالطبع ثابت ہوں گے اور نسبیت و تبدیلی سے دور ہوں گے۔ یہ بیان باطنی قوّتوں سے مربوط ایک خاص معرفت شناسی پر مبنی ہے۔یہاں کوشش کی گئی ہے کہ عقلی لحاظ سے اورانسان کی نفسانی قوّتوں کی مخصوص وضاحت پر تکیہ کرتے ہوئے تمام اخلاقی مفاہیم کی تفسیر کی جائے۔ اخلاق اسلامی کے وہ مشہور منابع جو فلسفی نظریات پر مبنی ہیں، اس شیوہ کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ روش ایک ایسے نظام سے متأثر ہے جسے ارسطو نے اخلاقی قضیوں کو بیان کرنے کے لئے پیش کیا ہے۔

۱۔ علامہ طباطبائی: المیزان، ج: ۲۰، ص: ۱۳٤۔

۲۔ سورئہ: طلاق، آیہ: ۲۔

۳۔ سورائہ: انفال، آیہ: ۲۹۔

٤۔ علامہ طباطبائی: المیزان، ج: ۹، ص: ٥٦ وج:۱۹، ص۳۱۳و۳۱٥۔

ج۔ سوالات اور جوابات

اس بحث کی تکمیل کے لئے مناسب ہے کہ ایسے بعض شبہات جو ممکن ہے اسی طرح بیان کئے جاتے ہوں، سوال و جواب کی شکل میں تحقیق کی جائے۔ اس مربوط واصلی سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا سوال:

اگر اخلاقی اصول، مطلق اور جاودانی ہوتے ہیں تو استثنائات کے لئے کیا توجیہ اور تفسیر کی جا سکتی ہے؟

پہلا جواب:

حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی احکام استثنا نہیں ہوتے اور جس وقت اخلاقی حکم کا موضوع محقق ہوتا ہے اسی وقت اس کا حکم بھی اس کے لئے ثابت ہوجاتا ہے۔ہاں، کبھی اخلاقی حکم کے اصل معیار میں خطا نظر آتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں: ''سچ بولنا اچھا ہے" لیکن اگر یہ کسی بے گناہ کا خون بہنے کا سبب بن جائے یا اسلام کے دفاعی نظام کے اسرار کے فاش ہونے کا موجب قرار پائے تو ایسے موقعوں پر "سچ بولنا اچھا نہیں ہے، ،یہاں اخلاقی حکم عمومی اور کلی قاعدوں سے جدا ہوگیا ہے۔حالانکہ حقیقت میں ہم نے اخلاقی حکم کے موضوع کو اس کی تمام خصوصیتوں اور قیدوں کے ہمراہ پہچنوانے میں خطا کی ہے۔پہلے والے حکم میں اس کا واقعی موضوع ''سچ بولنا کسی بڑی خرابی اور فساد کے بغیر مفید ہونا" ہے[1] قطعی طور پر ان تمام موارد میں جہاںیہ موضوع محقق ہوتا ہے سچ بولنے کا حکم موجود رہے گا۔ سچ بولنا اگر بے گناہوں کا خون بہنے وغیرہ کا سبب بنے تو یہ معاملہ اخلاقی نہیں ہے۔[2]

دوسرا جواب:

اخلاقی اصول استثناء کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ایسی جگہ پر جہاں غیر ضروری اور نا مناسب نتائج کا سامنا ہوتا ہے ایسی حالت میں ایک خارجی فعل، دو عنوان کا مصداق بن جاتا ہے۔ جیسے پہلے جواب میں درج مثال۔ اُن دو عنوانات میں ایک سچ بولنا ہے اور دوسرا بے گناہ کا قتل یا اسلامی فوج کے اسرار کا فاش کرنا۔ اس بناء پر ایک ہی عمل ایک لحاظ سے اچھا ہے اور دوسرے لحاظ سے برا۔ ایسی جگہوں پر مجبوراً ایک ہی طرف کو انتخاب کیا جائے گا۔ کیونکہ یا اس عمل کو ترک کیا جائے یا انجام دیا جائے۔ یہاں تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ عمل کے ترک کرنے یا انجام دینے کے انتخاب میں مجبوراً اس کے حسن وقبح کے درجات کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا۔

۱۔ اشیاء اور افعال کے ذاتی وعقلی حسن وقبح کو قبول کرنے کی بناء پر۔ جیسے شیعہ اور معتزلہ قبول کرتے ہیں۔ انسان کا اختیاری عمل، مصلحت کی بناء پر اچھا اور مفسدہ وفساد کی بناء پر برا ہوجاتا ہے۔ البتہ مصلحت اور مفسدہ کی تشخیص میں اور ان کی اہمیت کے توازن میں عقل کے علاوہ وجدان، فطرت اور وحی بھی بہت زیادہ اثر رکھتی ہے۔ ۲۔ رجوع کیجئے: مصباح یزدی، محمد تقی: دروس فلسفہ ء اخلاق، ص: ٤١، ١٨٧تا ١٨٩۔

اگر ان کی اچھائی یا برائی مرتبہ کے لحاظ سے ایک ہے تو اسے انجام دینے میں انسان نہ مذمت کا مستحق ہے اور نہ تعریف کا۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر مقدم ہے تو اسی کو انتخاب کرنا چاہئے۔ اس بنا پر خوبی اور بدی (اچھائی اور برائی) مطلق ہیں لیکن کبھی عمل کے مرحلہ میں دونوں یکجا ہوجاتے ہے۔یہاں ان دونوں کے تداخل کوپہلے بیان کی گئی ترتیب سے حل کرنا چاہئے [۱]

تیسرا جواب:

اخلاقی فعل و رفتار، اخلاقی خصلت و عادت سے جدا ہے۔ اخلاق کا مطلق ہونا یعنی اخلاقی فعل ورفتار کا مطلق ہونا نہیں ہے۔ اس شبہہ کے پیدا ہونے کی وجہ، اس ظریف نکتہ سے غفلت کا نتیجہ ہے ممکن ہے۔ کہ ایک فعل ایک اعتبار سے اخلاقی ہو اور دوسرے اعتبار سے غیراخلاقی۔ مثال کے طور پر بچہ کی جسمانی تنبیہ کرنا مطلقاً اچھا ہے اور نہ ہی خراب۔ لیکن کبھی یہ رفتار زیادتی و ظلم کا مصداق اور اخلاقی لحاظ سے بری بن جاتی ہے۔ لیکن جب بچہ کی تادیب کے لئےیہی طریقہ باقی رہ جائے تو اخلاقی لحاظ سے یہی اچھا ہے۔اس بنا پر اخلاقی مفاہیم اور خصلتیں مطلق ہیں اور اخلاقی افعال و رفتار نسبی۔یہاں اخلاقی احکام کا موضوع اخلاقی مفاہیم اور خصلتیں ہیں نہ کہ خاص افعال و رفتار۔ انسان کے افعال و رفتار پر اس وجہ سے کہ وہ کس اخلاقی مفہوم کا مصداق ہے، اخلاقی حکم لگایا جاتا ہے اورچونکہ ایک رفتار مختلف حالات میں مختلف اخلاقی مفاہیم کا مصداق بن سکتی ہے لہٰذا اُس پر مختلف اخلاقی احکام لگائے جائیں گے۔یہ بات " اخلاقی احکام میں نسبیت "کے معنی میں نہیں ہے۔[۲]

دوسرا سوال: بعض روایات کے مطابق عورت و مرد کے اخلاقی احکام میں فرق ہے۔ گویا یہ ایسا ہے کہ اسلام کی نظر میں بھی اخلاقی مفاہیم نسبی ہیں۔ جیسے حضرت علی کی یہ فرمائش کہ" عورتوں کی سب سے اچھی خصلتیں مردوں کی سب سے بری خصلتیں ہیں: جیسے تکبر، بزدل ہونا، کنجوس ہونا۔ لہٰذا جب عورت مغرور ہوتی ہے سر

نہیں جھکاتی ہے اور جب کنجوس ہوتی ہے اپنا اور اپنے شوہر کا مال محفوظ رکھتی ہے اور جب بزدل ہوتی ہے اس کے سامنے جو آتا ہے اس سے ڈرتی ہے۔[۳]

اس فرمائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اخلاقی مفاہیم، انسانوں کے آدھے حصہ (مردوں) کے لئے بُرے اور باقی آدھے حصّہ (عورتوں) کے لئے اچھے اور پسندیدہ ہیں۔

۱۔ رجوع کیجئے: مصباح یزدی، محمد تقی: دروس فلسفہ ء اخلاق، ص: ۱۸٦ و ۱۸۷۔

۲۔ رجوع کیجئے: استاد مطہری، مرتضیٰ: تعلیم وتربیت در اسلام، ص: ۱٤۸ تا ۱۵٦۔

۳۔ نہج البلاغہ، فیض اسلام، حکمت ۲۲٦۔

جواب: اس روایت میں اس فرمائش کا موضوع، خاص حالات و شرائط کے تحت رفتار و عمل کا وجود میں آنا ہے۔ عورتوں کے لئے تکبر کا پسندیدہ قرار پانا، نا محرم مردوں کی متکبرانہ رفتار کے مقابلہ میں ہے۔ کیونکہ روایت اس حکم کے بیان کی دلیل میں کہتی ہے:

"اگر عورت، نا محرم مرد کے مقابلہ میں اس طرح کی بزرگانہ و متکبرانہ رفتار رکھتی ہے تو دوسروں کے لئے سوء استفادہ اور دست درازی کا امکان نہیں رہتا ہے"۔

عورتوں کے خوف کی تعریف بھی ان کی اپنی عفّت و پاکدامنی کے لئے محتاط رہنے کے معنی میں ہے۔ یعنی جب بھی ان کی عفّت خطرہ سے دوچار ہو تو انھیںؐ احتیاط کو ترک کرنا اور بے پروا نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح عورتوں کے لئے کنجوسی کو اچھا قرار دینا اصل میں ان کے اپنے شوہر کے مال کو استعمال کرنے کے لئے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ آگے فرماتے ہیں کہ: " عورت کا بخل سے کام لینا سبب بنتا ہے کہ اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان مشترک مال محفوظ رہے۔،،

اس بنا پر تکبر، خوف اور بخل، عورت اور مرد کے تئیں نفسانی خصلتوں کے عنوان سے ایک ہی اخلاقی حکم رکھتے ہیں۔ لیکن نا محرم مرد کے مقابلہ میں عورت کی متکبرانہ رفتار اور اس کی اپنی عفّت کے واسطے محتاط رہنا، اور اپنے شوہر اوراپنے کنبہ کے مشترک مال کو استعمال کرنے میں بخل سے کام لینا ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اور اس طرح یہ وسیلہ اخلاقی نسبیت تک (یہ کہ وہی اخلاقی عادتیں اور خصلتیں ہیں) نہیں پہنچ سکتا ہے۔

تیسرا سوال: علوم انسانی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال ایک گروہ کے درمیان اچھے اور دوسرے گروہ کے نزدیک برے مانے جاتے ہیں، مثلاً بعض کے نزدیک احترام کی خاطر سر سے ٹوپی اتارنا اچھا اور بعض دوسروں کے یہاں بے احترامی اور بے ادبی مانا جاتا ہے۔ اس طرح کے دوسرے بہت سے اعمال ہیں یہ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کے نسبی ہونے کی دلیل ہے۔[۱]

جواب: مذکورہ رفتار اور ان سے متعلق نظریات میں اختلاف علم اخلاق کے دائرہ سے باہر ہے۔ حقیقت میں اس طرح کے امور ایک سماج کے آداب و رسوم اور عرف کو تشکیل دیتے ہیں۔

آداب و رسوم قرار دادی (اعتباری) ماہیت رکھتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں قرار دادی اعتباریات کی قسموں میں سے ہیں، جو نہ ہی خارجی وجود رکھتی ہیں اور نہ ہی خارجی حصول کے لئے سبب بنتی ہیں بلکہ ایک سماج میں

۱۔ رجوع کیجئے: ویل دورانٹ: لذات فلسفہ، ص ۸۳ تا ۹۹۔

رہنے والے لوگوں کے قولی یا عملی توافق سے وجود میں آتی ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف معاشرہ کے لوگوں سے وابستگی متفاوت اور نسبی ہے البتہ اُن کا نسبی ہونا اخلاقی احکام نسبیت کا سبب نہیں ہے۔(۱)

چوتھا سوال:

ادیان و مکاتب اور جوامع کے درمیان ایسے موضوعات جو ذاتی طور پر علم اخلاق کے دائرہ میں داخل ہیں اُن کے سلسلہ میں موجود عقیدوں کے درمیان اختلاف، اخلاقی احکام میں نسبیت کی دلیل ہے۔ مثال کے طور پر، مسلمان نماز پڑھنے کو واجب اور سور کے گوشت کھانے کو حرام جانتے ہیں، جبکہ اس سلسلہ میں عیسائیوں کا عقیدہ دوسرا ہے۔ یا یہ کہ عیسائیوں کے درمیان چند بیویوں کا رکھنا حرام اور اخلاق کے خلاف ہے اور مسلمانوں کے درمیان محدود طور پر مباح ہے اور اخلاق کے خلاف نہیں مانا جاتا ہے۔

جواب:

کسی واقعیت اور حقیقت کی معرفت میں اختلاف یا ان کو پہچاننے کے ذریعوں، یا کسی بات کے صدق وکذب یا اخلاقی اچھائی یا برائی کے معیار کے سلسلہ میں نظریاتی اختلاف، واقعی امور کی نسبیت کی دلیل نہیں بن جاتا۔اس حقیقت کو قبول کرنے کے بعد کہ اخلاقی فضائل و رذائل جن کی جڑیں عالم عینی میں ہیں اور ان کی حقیقتیں ثابت اور انسان وجہان میں تکوینی اور وجودی آثار رکھتی ہیں ان کے سلسلہ میں نظریاتی اختلاف کا موجود ہونا، ثابت حقیقتوں کے بدلنے اور ان کے نسبی ہونے کا سبب نہیں بنتا اور نہ ہی وہ اخلاقی حقائق کی تغیّر کا نتیجہ ہوتا ہے، بلکہ ان کو پہچاننے میں بعض لوگوںکے خطا کرنے کی دلیل ہے۔ جیسے وہ خطائیں جو مادی اور جسمانی حقیقتوں کو پہچانیمیں انسان سے سرزد ہوتی ہیں۔ حقیقت میں جو کچھ اخلاقی احکام کے اسباب کے سلسلہ میں بیان ہوا، اس پر توجہ کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اس طرح کے اختلافات یا انسان کی کمال مطلوب کے صحیح سمجھ نہ ہونے کی وجہ سے ہیں یا انسان کے فعل کے سلسلہ میں کافی دقت کے باوجود غلطی ہو جانے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ یعنی وہ عمل جو حقیقت میں اس مقصد کے خلاف ہے، اس کے مطابق مانا جاتا ہے اور اس کے بر خلاف بھی ہوتا ہے۔اس طرح اخلاق کے جاودانہ اصولوں کو عقلی اور عقلی طور پر بیان اور سوالوں کا جواب دینے کے بعد معلوم ہوا کہ جاودانہ اخلاق کے نظریے، ایسے نظریے ہیںجو قابل قبول اور شائستہ ہیں۔(۲)

۱۔ استاد مطہری، مرتضیٰ: اسلام و مقتضیات زمان ج: ۲، ص: ۲۴۸ تا ۲۵۸ کی طرف رجوع کیجئے۔ ۲۔ البتہ جاودانہ اخلاق کے دفاع کے لئے دوسرے راستوں کو بھی طے کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مشہور اخلاقی اصولوں کی جدا جدا تحقیق کی جائے تا کہ ان کا مطلق ہونا ثابت ہو جائے۔ (رجوع کیجئے: استاد مطہری، مرتضیٰ، سیری در سیرۂ نبوی، ص: ۹۱ تا ۱۱۶)۔

تیسری فصل: اخلاقی عمل

عناوین

اس حصہ میں اُن بنیادی موضوعات پر گفتگوکی جائے گی جوفلسفہ اخلاق کی بحثوں میں اخلاق کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں یعنی "اخلاقی اچھائی اوربرائی کا معیار"۔ وہ بنیادی سوالات جن کے جوابات اس فصل میں دئے جائیں گے مندرجہ ذیل ہیں:

۱ ۔ ایک عمل کس صورت میں علم اخلاق کی عدالت کے دائرہ میں قرار پاتا ہے ؟

۲ ۔ اخلاق اسلامی کی نظر میں کن عام شرطوں کے تحت ایک عمل اچھا یا برا مانا جاتا ہے؟

۳ ۔ اسلام کی نظر میں اخلاقی ذمہ داری کی عام شرطیں کیا ہیں؟

٤۔ اخلاقی فضائل ورذائل کے کلی معیار کی شناسائی کے بعد اچھے یابرے عمل کے مصداق کی پہچان کے لئے دین میں کن وسیلوں کو پہچنوایا گیا ہے ؟

٥ ۔ کیا دین میں اخلاقی اچھائی اور برائی کو پہچنوانے کے لئے مشخص مفاہیم اور کلمات موجودہیں؟

٦ ۔ کبھی عمل کے مقام پر ایک وقت یاموضوع میں دو اخلاقی حکم اس طرح جمع ہوجاتے ہیں کہ انسان دونوں کا پابند ہوتا ہے دونوں کی پیروی کی قدرت نہیں رکھتا۔کیا اسلامی اخلاق کے نظام میں ان موارد کے لئے کوئی راہ حل تلاش کیا گیا ہے اور کیا ایک اخلاقی حکم کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لئے کوئی معیار بتایا گیاہے؟

ان تمام سوالوں کو ان چار محوروں میں خلاصہ کیا جا سکتاہے:

ا لف ۔ اخلاقی عمل کے حدود اور ان کی کلی شرطیں۔

ب۔ اخلاقی ذمہ داری کی عمومی شرطیں۔

ج۔ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کو پہچنوانے کے راستے اوروسیلے۔

د۔ اخلاقی تعارض اور تزاحم کا معیاراس بناپراس فصل کے مطالب چار عنوان میں ترتیب پاتے ہیں۔

الف ۔ اخلاقی عمل کے قیمتی عناصر

اس بحث میں اخلاقی عمل سے مراد "اچھا عمل" ہے اسلامی اخلاق کے نظام میں، جہاں اخلاق کے لئے جزا وسزا کو ضروری مانا گیا ہے، اچھا عمل وہ عمل ہے جس کے ہمراہ اخروی بدلہ اور ثواب موجود ہو، خواہ اس کے ہمراہ دنیوی بدلہ ہو یا نہ ہو۔

اس بنا پراس بحث کا مقصد ایسی شرطوں کو بیان کرنا ہے کہ ایک عمل انجام دینے والا اُخروی ثواب اور جزا کو حاصل کر سکے۔

ایک مجموعی تقسیم بندی کے لحاظ سے ایک اچھے اور قیمتی اخلاقی عمل کے لئے اس کے ضروری عناصر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: فاعلی عناصر اور فعلی یا عینی عناصر۔ فاعلی عناصر سے مراد ایسے حالات ہیں جو ایک طرح سے فاعل کی طرف پلٹتے ہیں۔ فعلی یا عینی عناصر یعنی ایسے حالات جن کا فاعل کے ارادہ اور حالات سے آزاد ہو کر ایک واقعی اور عینی امر کے عنوان سے فعل میں موجود رہنا ضروری ہو۔ مجموعی طور پر یہ دو طرح کے عناصر جو اخلاق کی اصلی فضیلتوں کی بنیادوں کو تعمیر کرتے ہیں، درج ذیل ہیں:

(۱)

۱ ۔فاعلی عناصر

فاعل میں دو اساسی عنصر کی موجودگی لازم ہے تاکہ اس کے عمل فعل میں موجود دوسری شرطوں کے باوجود اخلاق کے اچھے اور قیمتی زیور سے آراستہ ہو۔ یہ دو عنصر جنھیں "فاعل کی آزادی اور اس کے اختیار" اور "ایک خاص نیت اور مقصد کے وجود" سے تعبیر کیا گیا ہے اس انسان میں فعل کے شروع ہونے سے تمام ہونے تک پائے جاتے ہیں۔

۱۔ توجہ کرنی چاہئے کہ اخلاق اسلامی کی کلامی شرطیں جیسے مبدأ ومعاد ورسالت پر عقیدہ جو بعض عناصر کے محقق ہونے کے لئے بنأ اور ابتدائی شرطیں ہیں،یہاں ان کے سلسلہ میں بحث نہیں کی جائے گی۔ بلکہ علم اخلاق کے کلامی اصول کے عنوان سے ان کو مسلم جانا جاتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ کہ کلامی بحثوں اور اسلامی معارف کے درسوں میں ان پر تحقیق ہوئی ہے اور ان کو قبول کیا گیا ہے۔

ایک: فاعل کی آزادی اور اس کا اختیار

جیسا کہ علم اخلاق کی تعریف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاق انسان کے اُن اختیاری اعمال اوراس کی اُن قدرتوں اور صفتوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جو اختیاری مبدائی حیثیت رکھتی ہیں اوروہ چیزیں جو اس کی آزادی اور اختیار سے باہرہیں اصولی طور پر وہ اخلاقی تحسین و تقبیح اور فیصلہ کے دائرہ سے باہرہیں اوروہ اخلاقی حکم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اوروہ اس کی مستحق بھی نہیں ہیں۔

انسان دو طرح کے افعال انجام دیتا ہے: ایک وہ افعال ہیں جو فطری اور اضطراری (بے اختیاری) طورپر انجام دئے جاتے ہیں اوردوسرے وہ افعال ہیں جواختیاری اور ارادی طورپر انجام دئے جاتے ہیں۔

فطری اور اضطراری افعال انسان کی طبیعت سے صادر ہوتے ہیں اور ان کے انجام میں علم وآگاہی کا دخل نہیں ہوتا ہے جیسے سانس لینا۔ انسان کے ارادی اور اختیاری افعال اس کے علم وآگاہی کے ذریعہ صادر ہوتے ہیں۔ یعنی انسان ابتدا میں اس عمل کوپہچانتا ہے اور اسے دوسرے تمام اعمال سے جدا کرتا ہے، پھر اسے نفس کے کمال کا مصداق سمجھتا ہے۔ اس کے بعد اسے انجام دینے کے لئے اقدام کرتا ہے۔ [۱]

البتہ جس طرح فلسفی اور کلامی بحثوں میں ثابت ہوچکا ہے اوراس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان ان کاموں کی نسبت جو علم وارادہ سے انجام دیتا ہے، اختیارتکوینی رکھتا ہے۔ ہاں یہ جاننا چاہئے کہ آدمی کا اختیار مطلق نہیں ہوتاہے، کیونکہ اس کااختیار سلسلۂ علل کے اجزاکاایک جزہے۔ خارجی اسباب وعلل بھی اس کے اختیاری افعال کے محقق ہونے میں دخیل ہیں۔ مثلاًتغذیۂ انسان، اس کے ارادہ وخواہش کے علاوہ غذا کے خارج میں موجود ہونے اور اس تک دسترسی و کھانے کی قابلیت و صلاحیت اور قوۂ ہاضمہ کی سلامتی اوردسیوں بلکہ سیکڑوں ایسی علتیں ہیں جو اس کے اختیار سے باہرہیں، ان علتوں کے سلسلہ میں خدا کی مرضی و ارادہ کی بھی ضرورت ہے، یہ ایسی حالت میں ہے کہ انسان کے ارادہ کی بقا بھی اس کی مرضی سے وابستہ ہے۔ [۲] اس بنا پر انسان کے ارادہ کی آزادی، اس کے ارادی افعال کے دائرہ میں بھی محدود اور مشروط ہوتی ہے لیکن اس کے عمل کی نسبت اخلاقی تعریفیں اور مذمتیں اس کے اختیاری فعل کے دائرہ کے لحاظ سے محدودہیں۔

۱۔ رجوع کیجئے علامہ طباطبائی، المیزان، ج۱، ص۱۰۷،۱۰۶۔

۲۔ ایضاً، ج۱۶، ص۶۷۔

اختیاری اور ارادی فعل کے مقابلہ میں طبیعی اور جبری (غیر ارادی) فعل ہے، جبر و اختیار کے الفاظ کا مختلف علوم کی اصطلاح میں مختلف طریقہ سے اور سماج کی عام بول چال میں اس کے بہت سے معانی میں استعمال ہونے کی بنا پر لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے شبہے پیدا ہوتے ہیں۔یہاں مناسب ہے کہ جبر و اختیار کے مختلف استعمالات اور ان کی اہم قسموں کو بیان کیا جائے۔

کلمۂ جبر مندرجہ ذیل مقامات پر استعمال ہوتا ہے اور آزادی و اختیار ہر جگہ اس کے مقابل معنی رکھتا ہے:

۱۔ فلسفی جبر:

وہ اعمال جو انسان سے صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود میں آنے کے لئے اس کا کچھ بھی دخل نہیں ہوتا ہے۔ جیسے آدمی کا سانس لینا، اس کی طبیعت کے مطابق ہے۔ اس طرح کے جبر کے مقابلہ میں، فلسفی آزادی اور اختیار ہے۔

۲۔ اخلاقی جبر:

وہ اعمال جنھیں اخلاقی حکم وتقاضہ کے مطابق انسان انجام دیتا ہے یا ترک کرتا ہے جیسے یہ کہ انسان اخلاقی لحاظ مامور سے ہے کہ نماز پڑھے یا حرام ہے کہ وہ شراب پئے اس طرح کا جبر، اخلاقی آزادی و اختیار کے مقابلہ میں ہے۔

۳۔ حقوقی جبر:

قانونی لحاظ سے انسان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی میں کچھ مخصوص اعمال کو انجام دے یا کچھ خاص اعمال کو ترک کرے۔ جیسے قانون کے مطابق ہم سب مجبور ہیں کہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے ٹیکس اور مال گذاری ادا کریں یا دوسروں کی ملکیت اور ان کی خصوصی زندگی کے حقوق کا احترام کریں۔ ان امور کی مخالفت کی صورت میں قانونی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جبر کے اس مفہوم کے مقابلہ میں حقوقی آزادی اور اختیار ہے۔ علم حقوق میں جن ضروری اعمال کی مناسبت سے گفتگو ہوتی ہے وہ اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

٤۔ نفسیاتی جبر:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نفسیاتی وضعیت اور باطنی حالت سے متاثر ہو کر کچھ ایسے اعمال کو انجام دیتا یا ترک کرتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ جیسے کوئی انسان اپنی ماں کے انتقال کی وجہ سے غمگین ہوجاتا ہے اور اس پر قلبی رقت طاری ہوجاتی ہے اور وہ اس حالت میں دوسرے کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آتا ہے یا اپنی زوجہ کو تکلیف نہیں پہنچاتا ہے

یا اپنی روزانہ کی مالا مال آمد کی کثرت سے مست ہوجاتا ہے، یا اپنے عزیزوں سے ملاقات کے شوق وولولہ کی خاطر ناگزیر ہوکر خود سے متعلق دوسروں کی بداعمالیوں کو معاف کردیتا ہے اور بذل و بخشش سے کام لیتا ہے۔اس طرح کا جبر نفسیاتی آزادی اور اختیار کے مقابلہ میں ہے۔ علم نفسیات میں، جبر واختیار کا اس طرح سے معنی کرنا زیادہ رائج ہے۔

۵۔ سماجی جبر:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعی اور سماجی حالات، آداب وتہذیب اس کی رسموں اور طور طریقوں کی وجہ سے انسان خود سے ایک خاص فعل کو ظاہر کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے اور مجبوراً بعض اعمال کو ترک کردے۔ جیسے ہمارے سماج میں ایک بازاری دوکاندار پر یہ سماجی دبائو رہتا ہے کہ عاشور کے دن وہ اپنے کاروبار کو بند کردیتا ہے ، اگرچہ اس کی مرضی نہ بھی ہو۔ یا اجتماعی تحولات وتعمیرات کے موقع پر جو صنعتی ترقی کی بنا پر ہوتے ہیں، انسان مجبور ہے مٹرو سے اُترتے وقت تکلفات کونظر انداز کردے اور اس کے دروازوں کے بند ہونے سے پہلے مختصر وقت میں ہی اس سے باہر آجائے۔ سماجی آزادی اور اختیار، اس طرح کے جبر کے مقابلہ میں ہے۔ اجتماعی اور سماجی علوم میں جبر کا یہ مفہوم وسیع پیمانہ پر مستعمل ہے۔

کلمۂ جبر و اختیار کے مشہور طریقۂ استعمالات کی اجمالی شرح کے بعد اب ہم جبر واختیار کے نوعی مفہوم کو جو اخلاقی عمل کا رکن ہے، آسانی سے جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ کسی عمل کوجو چیزعلم اخلاق کی عدالت میں حاضر کرتی ہے وہ فلسفی مفہوم میں عمل کا اختیاراورآزادہونا ہے۔ فلسفی وتکوینی آزادی اور اختیار، اعتباری جبر جیسے حقوقی واخلاقی جبر سے مغایرت وبے گانگی نہیں رکھتا ہے اور اخلاقی یا حقوقی دستوروں کی موجودگی کسی خاص فعل سے متعلق انسان کی تکوینی آزادی اور اختیار کو سلب نہیں کرتی ہے۔ اُسی طرح جیسے اکراہ واجبار واضطرار، فاعل کی تکوینی آزادی اور اختیار سے ٹکرائو نہیں رکھتے ہیں۔ (۱)

اس طرح وہ چیزیں جو کبھی نفسیاتی یا سماجی جبر کے نام سے جانی جاتی ہیں، ہرگزتکوینی وفلسفی آزادی سے مغایرت نہیں رکھتی ہیں۔ ہاں، سبھی اخلاقی یاحقوقی اوامر ونواہی اور نفسانی اور سماجی عوامل کسی عمل کے انجام یا ترک سے متعلق، انسان کے عزم وارادہ کے پیدا ہونے میں اثرانداز ہوسکتے ہیں اوربہت سی جگہوں پر ایسا ہوتابھی ہے لیکن یہ دخالت وہیں سے گذرتی ہے جہاں انسان کی تکوینی آزادی اور ارادہ وجود میں آتاہے اور یہ کبھی انسان کو حقیقی لحاظ سے مجبور اور مسلوب الاختیار نہیں کرتی ہے۔

۱۔ رجوع کیجئے علامہ طباطبائی المیزان، ج ۱، ص ۱۰۷۔

دو: فاعل کی نیت اور مقصد

بہت سے دوسرے اخلاقی مکاتب کے برخلاف، مکتب اخلاق اسلامی، اخلاقی عمل کو انجام دینے کے لئے فاعل کی نیت اور مقصد پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ اصولی طور پر فلسفی لحاظ سے ایک آزاد اور مختار فاعل کے ذریعہ صادر ہونے والا فعل ان چار علتوں (فاعلی، مادی، صوری، غائی) کے بغیر ممکن نہیں ہے۔یہاں نیت اور مقصد سے مراد وہی علت غائی ہے جو فاعل کو کسی عمل پر مجبور کرتی ہے۔ اس بنا پر اختیاری عمل کے محقق ہونے میں مقصد کے موجود ہونے کی اصل ضرورت ایک ایسی بات ہے جس سے انکار نہیں کیا سکتا۔ لیکن بات اصل یہ ہے کہ عمل کو انجام دیتے وقت فاعل کے کسی خاص مقصد کی موجودگی آیا اخلاقی عمل کے قابل قدر ہونے کے لئے ایک لازم شرط ہے؟ بہت سے اخلاقی مکاتب نے اس سوال کا جواب منفی دیا ہے[۱]، اسلامی اخلاقی مکتب کے نظریہ کے مطابق فاعل میں نیت و مقصد کا ہونا، اخلاقی اقدار کے لئے ایک ضروری شرط ہے۔

یہاں پر اس بات کی یاددہانی ضروری ہے کہ مخصوص نیت اور مقصد کے تحقق کے لئے دو اساسی رکن کی موجودگی ضروری ہے، پہلا: فاعل کسی فعل کو انجام دینے کے لئے ارادہ اور توجہ رکھتا ہو، دوسرا: فعل کو انجام دینے سے اس کا مقصدفقط خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو جسے اخلاص کہا جاتا ہے۔ اس طرح اخلاقی عمل کا فاعلی عنصریا اس کی شرط اُس صورت میں مخدوش ہوتی ہے جب فاعل کسی کام کو غفلت اورسہوکی وجہ سے انجام دے یاخوشنودی پروردگار کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد رکھتا ہو۔ البتہ پہلے رکن کا فقدان ہمیشہ دوسرے رکن کے نہ ہونے کے برابر ماناجائے گا۔ لیکن دوسرارکن، پہلے رکن کے تابع نہیں ہے۔[۲]

اخلاق اسلامی کے فلسفہ میں کسی عمل کی اس وقت اخلاقی قدر وقیمت ہوتی ہے اور اس وقت نیک بدلہ اور اجر کا مستحق ہوتا ہے جب دوسری شرطوں کے محقق ہونے کے علاوہ فاعل کا مقصد خدا کی مرضی حاصل کرنا ہو اور عمل کے انجام دینے کو کمال الٰہی اور اس کے جمال وجلال وصفات سے معنوی طور پر نزدیک ہونے کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ قراردے۔ بس جب بھی کوئی مجنون یا احمق فاعل، پروردگار کی خوشنودی کے علاوہ کسی دوسری وجہ سے کوئی کام انجام دے تو اس کا عمل اخلاقی قدر و قیمت طے کرنے کے لئے ضروری نصاب سے محروم رہے گا۔

۱۔ کانٹ کانظریہ یہ نہیں ہے وہ معتقد ہے کہ اخلاقی عمل کو انجام دینے کے لئے انجام فریضہ کے لئے ضروری مصداق ہونا چاہئے اس کے علاوہ انجام فریضہ کی نیت بھی اخلاقی عمل کے لئے شرط ہے۔ ر۔ک: ایمانوئل کانٹ: بنیاد مابعد الطبیعۃ اخلاق ترجمۂ (فارسی) حمید عنایت وعلی قیصری، ص۲۴،۲۳۔

۲۔ رجوع کیجئے مطہری، مرتضیٰ، تعلیم وتربیت در اسلام (اسلام میں تعلیم وتربیت) ص۱۹۵۔۱۹۶۔

اس کے علاوہ فاعل کا مقصد یگانہ اور خالص ہونا چاہیئے۔ یعنی فاعل کی نیت بہترین مقصد کے تحت اور خالص ہو۔ کبھی اس شرط کو ضرورت کے تحت حسن فاعلی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ حسن فعلی کے مقابلہ میں ہے جو آگے بیان ہو گا۔

اخلاقی عمل کی قدر و قیمت کو طے کرنے میں نیت کی اہمیت اور اس کی تاثیر کو عقل و فلسفہ کی نظر سے اور اسلام کی مقدس کتابوں کی زبان سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مقصد کی عقلی اہمیت:

فلسفۂ اخلاق اسلامی کی نظر میں انسان کا سب سے بلند و جودی مرتبہ اس کا روحانی مرتبہ ہے۔ اس مرتبہ میں انسان کا حقیقی کمال خدا کے صفات کما لیہ زیادہ سے زیادہ معنوی تقرب حاصل کرنے میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کا سب سے بلند روحی مرتبہ اس چیز میں ہے کہ روح جو انسان کا جوہر ہے، الٰہی اسماء و صفات جمال و جلال کی جلوہ گاہ بن جائے۔ یہ چیز علم اخلاق کے کلامی شرائط اور اس کے مقصد و رسالت سے مربوط ہے۔ یہ عظیم کام اس صورت میں ممکن ہے جب انسان اپنے اختیاری عمل میں، جو روح کی ترقی و تنزلی میں وجودی تاثیر رکھتا ہے، خداوند متعال سے نزدیک ہونے کے لئے مقصد اور نیت کے ساتھ حرکت کرے۔ نیت اور اخلاقی قدروں کے درمیان یہ تاثیر اور رابطہ ایک تکوینی اور حقیقی رابطہ ہے نہ کہ جعلی اور قراردادی۔

۲۔ وحی کے مطابق مقصد کی اہمیت: اسلام کی مقدس کتابوں میں، خواہ وہ قرآن سے مربوط ہو یا سنت سے اخلاقی عمل کے لئے خدائی مقصد کے موجود رہنے کی ضرورت پر واضح طریقہ سے تاکید کی گئی ہے۔ ان کی چند مشہور مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

"یہ غنائم یا بلند درجہ اُن فقیر مہاجرین کے لئے ہے جن کو اپنے وطن اور مال سے محروم کر دیا گیا۔ جبکہ وہ خوشنودی خدا اور فضل الٰہی حاصل کرنے کے لئے کام کرتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کے امور میں مدد کرتے ہیں۔ یہ سچے اور حقیقت پسند لوگ ہیں۔"[۱]

"وہ لوگ خدا سے دوستی کی بنا پر مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ) ہم خوشنودی خدا کے لئے کھانا کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے ہیں۔"[۲]

۱۔ سورۂ حشر آیت ۸۔

۲۔ سورۂ انسان۔ آیت ۸ و ۹۔

"اور جن لوگوں نے اپنے خدا کی خوشنودی کے لئے صبر و شکیبائی سے کام لیا اور نماز کو قائم کیا اور ہم نے اُن کو جو روزی دی ہے اس میں سے پوشیدہ و آشکار طریقہ سے انفاق کیا اور بدی کو نیکی کے ذریعہ دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر اِنھیں کے لئے ہے"۔ (۱)

یہ بات واضح ہے کہ الٰہی مقصد پر قرآن کی یہ تاکید صرف مذکورہ موارد اور مقامات سے مخصوص نہیں ہے، اور مخصوص اعمال کا ذکر بعنوان مثال اور شاید الٰہی مقصد کی حفاظت میں انسان کے ذریعہ ہونے والی لغزشوں کے سب سے مشہور اور بنیادی مقامات کے ذکر کے عنوان سے ہے۔

پیغمبر اکرم سے یہ نقل ہوا ہے کہ فرمایا:

"بیشک اعمال کی اہمیت انہیں انجام دینے کی نیت پر منحصر ہے اور انسان کے لئے وہی چیزیں رہیں گی جن کی نیت کی ہے (۲)، مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے" (۳)

نیت کے مراتب:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حتیٰ وہ افراد جو خدا کے وجود کو قبول کرتے ہیں اور قیامت اور پیغمبروں کی بعثت پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی اپنے اعمال کو ثواب حاصل کرنے و بہشت میں جانے، اس کی لازوال نعمتوں سے بہرہ مند ہونے اور دوزخ و جہنم کے کیفر اور سزائوں سے نجات کی غرض سے انجام دیتے ہیں، نہ کہ خدا کی مرضی حاصل کرنے کے لئے۔ مقدس اسلامی کتابیں خاص طور سے قرآن بہشت کی زیبائیوں اور خصوصیتوں سے نیز اخروی سزائوں کی شدت اور ان کے قطعی ہونے سے خبردار و ہوشیار کرکے ایک طرح سے کیفر سے ڈرنے اور جزا و ثواب کی امید کی نیت سے عمل کرنے کو صحیح مانتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا اس طرح کے اخلاقی اعمال کی قبولیت بیان شدہ اخلاقی عمل کی قیمتی شرطوں سے سازگار ہے؟ اس بنیاد پر کہ فاعل کو اپنے عمل میں فقط خدا کی مرضی کا حصول مدّنظر رکھنا چاہیئے۔

۱۔ سورۂ رعد، آیت ۲۲، اسی طرح سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۵۔۱٦، سورۂ بقرہ آیت ۲۰۷، ۲۲۵، ۲٦٤، ۲۷۲، ۲۸٤، سورۂ ممتحنہ آیت نمبر ۱، سورۂ نساء آیت نمبر ۳۸، سورۂ روم آیت ۳۸۔۳۹ کی طرف رجوع کیجئے۔

۲۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۱۲، ح ۳۸۔

۳۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۸٤۔

اس سوال کے جواب میں کہا گیا ہے کہ خدا کی مرضی کے متعدد مراتب ہیں اور انسان انہیں حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کبھی خدا کی مرضی کو اس وجہ سے اختیار کرتا ہے کہ وہ اخروی بدلہ وثواب کا باعث یا قیامت کے دن کیفر وسزا سے نجات کا ذریعہ وسبب ہے لہٰذا وہ اخلاقی عمل کے انجام میں انسان کے لئے توجہ کا مرکز قرار پاتی ہے اور کبھی صرف خدا کی مرضی کو حاصل کرنا صرف مقصد کے تحریک کرنے اور آگے بڑھانے کے لئے ہوتا ہے[1] یعنی خدا کے نزدیک عمل کی محبوبیت ہے جو عمل کی انجام دہی میں انسان کی اس سے محبت اور اس کی طرف مائل ہونے کا سبب بنتی ہے لہٰذا خدا کے نزدیک بھی فاعل کی محبوبیت وجود میں آئے گی اور خدا اس سے محبت کرے گا۔ البتہ اس طرح کے اخلاقی عمل کی انجام دہی، خدا کے صرف خاص بندوں کے ذریعہ ہی میسر ہے۔

اس بناپر پہلی صورت میں بھی فاعل کا مقصد، خدا کی مرضی کا حصول ہے اس وجہ سے کہ وہ بدلہ دینے کا باعث اور کیفر وسزا سے بچنے کا سبب ہے۔

مقصد اور ایمان کا رشتہ:

یہ بات ذکر ہوچکی ہے کہ اسلام کے اخلاقی نظام میں، اخلاقی عمل اس وقت اہمیت اور قیمت رکھتا ہے جب فاعل ا سے انجام دینے میں معبود کی مرضی کا سودا کرے۔ چاہے خدا کی مرضی ذاتی طور پر مطلوب ہو اور چاہے پروردگار کی خوشنودی اس وجہ سے کہ وہ ثواب کا باعث اور عذاب سے بچنے کا سبب ہے، اس وجہ سے اسے اپنا مقصد قرار دیدے۔ (دونوں صورتوں میں اہمیت رکھتا ہے) عقلی طور پر اس امر کا محقق ہونا اس صورت میں ممکن ہے جب فاعل خدا کے وجود روز قیامت اور جزا و سزا کی حقّانیت، انبیاء کی بعثت اور ان کی تعلیمات پر یقین اور عقیدہ رکھتا ہو۔ البتہ خدا پر ایمان رکھنے میں، معاد و نبوت سے متعلق ایمان بھی اس کے شامل حال ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہماری دینی کتابوں میں ایمان پر اخلاقی قدروں کے لئے ضروری شرط کے عنوان سے بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اس کے کچھ نمونے مندرجہ ذیل ہیں:

"عورت اور مرد میں سے جو کوئی نیک اور شائستہ کام انجام دے اور مؤمن ہو، قطعی طور پر ہم ا سے ایسی زندگی عطا کریں گے جو حیات طیبہ اور پاکیزہ ہے اور مسلّم طور پر جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے اس سے بہتر ان کے کئے ہوئے کا بدلہ دیں گے"۔[2]

۱۔ رجوع کیجئے مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق در قرآن، ص۹۶۔

۲۔ سورۂ نحل، آیت ۹۷۔

"نیکی صرف یہ نہیں ہے کہ اپنے چہرہ کو مشرق ومغرب کی طرف کرلیں بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا، قیامت، فرشتوں، آسمانی کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور.....[۱]

"خدا کے پیغمبر اُن چیزوں پرجو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہیں ایمان لائے ہیں اور مؤمنین بھی سب خدا، فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے رسولوں میں کسی کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے ہیں اور وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم نے پیغام الٰہی کو سنا ہے اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں اور ہم تیری طرف پلٹ کے آنے والے ہیں"۔[۲]

ایمان کی حقیقت اور علم کے درمیان کے متعلق ایک طرف اوردوسری طرف اس کے اور اسلام کے درمیان فرق کے بارے میں یہ کہا جاچکا ہے کہ ایمان ایک قلبی بات ہے، اسی کے ساتھ اختیاری بھی ہے۔ جبکہ علم وعقیدہ انسان کے لئے ممکن ہے غیراختیاری صورت میں بھی حاصل ہوجائے، اس لئے علم اورایمان کے درمیان وجودی حقیقت کے لحاظ سے کوئی ملازمہ اور اُن میں وابستگی ضروری نہیں ہے۔ یعنی ممکن ہے کوئی انسان کسی حقیقت کے سلسلہ میں عالم ہو لیکن اسی سلسلہ میں کفر کا اظہار کرے"[۳]

قرآن کریم ایمان سے علم کے جدا ہونے کے بارے میں فرماتا ہے:

"اس کے باوجود کہ ان کے دل اس کے سلسلہ میں یقین کرچکے تھے، لیکن ظلم وزیادتی اورتکبر کی بناپر اس سے انکار کردیا۔ بس دیکھ لو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے"[٤]

البتہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ایمان کا عام راستہ علم سے ہوکر گذرتا ہے۔ لیکن علم انفرادی طورپر ایمان کے محقق ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۷۔

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵۔

۳۔ رجوع کیجئے علامہ طباطبائی، المیزان، ج۱۸، ص۲۵۹۔

٤۔ سورۂ نحل، آیت ١٤۔

ایمان اور اسلام کے فرق کے بارے میں قرآن کی آیۂ شریفہ اس طرح بیان کرتی ہے:

اِنّ الْمُسلمينَ والمسلمات والمؤمنين والمؤمنات [۱]

اوراسی طرح دوسری آیتیں بھی[۲] اسلام کو ایمان کے مقابلہ میں قراردیتی ہیں۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اسلام دین کے سامنے عملی طورپر تسلیم ہوجانے کے معنی میں ہے اور تسلیم عملی بدن کے ظاہری اعضاء وجوارح کے ذریعہ محقق ہوتی ہے۔ لیکن ایمان ایک قلبی، اعتقادی اور باطنی چیز ہے اور یہ چیز اس طرح ہے کہ اس کے آثار بدنی اور ظاہری اعمال مینٔبھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس بناپر ہر مؤمن مسلمان ہے لیکن ہر مسلمان مؤمن نہیں ہے[۳] جیسے منافق، جودین کے دستوروں پر عمل کرتاہے لیکن ایمان نہیں رکھتا۔

ایمان اور عمل کا رشتہ:

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ایمان کو قیمتی، موجب سعادت اور صالح عمل کے ساتھ شمار کیاگیا ہے۔ اُن میں سے اس مثال کو ملاحظہ فرمائیے:

"جولوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح انجام دیتے ہیں ہم ان کو بہت جلدان باغ ہائے جنت میں داخل کریں گے جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اوروہ ہمیشہ اس میں زندگی گزاریں گے......۔"[٤]

بعض دوسری آیتوں میں صرف ایمان کو انسان کی سعاتمندی اورکامیابی اوربہشت میں داخل ہونے کے لئے ایک شرط کے طورپرپیش کیا گیا ہے۔

"خدا نے مومنین ومومنات سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جہاں درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہ اُن میں سے ہمیشہ زندگی گزاریں گے، ان جنّات عدنٍ میں پاکیزہ جگہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور خدا کی خوشنودی سب چیزوں سے بڑی ہے اوریہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔"[۵]

۱۔ سورۂ احزاب ۔آیت:۳۵۔

۲۔ جیسے سورۂ حجرات کی چودہویں اورپندرہویں آیت۔

۳۔ رجوع کیجئے علامہ طباطبائی المیزان، ج۱٦، ص۳۱۳۔۳۱٤۔

٤۔ سورۂ نساء آیت ۵۷، ۱۲۲، اورسورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۳، سورۂ نساء کی آیت ۱۲٤، اورسورۂ کہف کی آیت ۳۰ کی طرف رجوع کیاجائے۔

۵۔ سورۂ توبہ، آیت ۷۲۔

اس آیت میں واضح طریقہ سے خدا کی بڑی نعمتوں مثلاً ایمان کے ساتھ اس کی مرضی کی بشارت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ کسی عمل کے موجود ہونے اور اس کی ضرورت پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ کیا اس طرح کی آیتیں، گزری ہوئی یا آگے آنے والی آیتوں سے، اس بنا پر کہ اخلاقی قدروں کے محقق ہونے کے لئے عمل صالح کا موجود ہونا ضروری ہے، اختلاف نہیں رکھتیں؟ کیا اسلام کے اخلاقی نظام میں صرف ایمان، اخلاقی قدروں اور تعریف وجزا کے مستحق ہونے کا سبب بن سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے اور ان دو طرح کی آیتوں کے مفہوم کے درمیان مناسب رابطہ برقرار کرنے کے لئے یہ کہا گیا ہے:

" ایمان کی حقیقت اور اسلام و عمل سے اس کی نسبت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آیتیں جو ایمان کے ساتھ عمل کا ذکر کرتی ہیں، وہ عام حالات پر نظر رکھتی ہیں، یعنی ان لوگوں سے مربوط ہیں جن کے لئے کام کرنے کی شرطیں جیسے قدرت، فرصت وغیرہ فراہم ہیں اور وہ ان حالات میں عمل کرتے ہیں اور وہ آیتیں جو صرف ایمان کو ہی کامیابی کا سبب قرار دیتی ہیں، ان حالات سے مربوط ہیں جن میں انسان ایمان لاتا ہے لیکن عمل کو انجام دینے کے لئے حالات جیسے قدرت، فرصت وغیرہ اس کے لئے فراہم نہیں ہیں۔ "(۱)

کافروں کے نیک اعمال:

آخری سوال جو مقصد اور نیت کے بارے میں جواب کا مستحق ہے یہ ہے: جو کافرین اور غیر مؤمن افراد مبدأ، معاد اور نبوت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں لہٰذا اپنے اعمال کی انجام دہی میں (اگر چہ ذاتی طور پر وہ عمل پسندیدہ ہیں) خدا کی مرضی حاصل کرنے کی نیت نہیں رکھتے ہیں، کیا وہ لوگ اسلام کے اخلاقی اصول کی رو سے کسی طرح کی تعریف اور جزا کے مستحق نہیں ہیں؟ کیا ان کے نیک اعمال کی کوئی اہمیت و قیمت نہیں ہے اور کیا پروردگار کی جانب سے انہیں بدلہ نہیں ملے گا؟

اس سوال کے جواب میں یہ کہا گیا ہے:

"وہ اعمال جو مذکورہ خصوصیت نہیں رکھتے ہیں لیکن شارع کے معین کردہ طریقوں کے مخالف بھی نہیں ہیں اور

۱۔ر۔ک مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق در قرآن، ص۱۱۳،۱۱۲۔

کوئی منفی مقصد بھی نہیں رکھتے ہیں یعنی دین حق اور اس کے ماننے والوں سے دشمنی کے مقصد سے انجام نہیں دیتے اور فاعل انھیں انجام دینے کے لئے مادی اور حیوانی ضرورتوں کے پورا کرنے سے بالاتر مقصد دکھاتا ہے یعنی اس کا عمل، انسانی احساسات وعواطف کی خاطر انجام پاتا ہے (جیسے کسی کو معاف کردیتا ہے اور سخاوت کو ظاہر کرتا ہے اس جیسے دوسرے اعمال) اگرچہ انسانی نفس کی بلندی وتکامل کے لئے ضروری شرطیں نہیں رکھتے اور اس کے لازمی نصاب تک نہیں پہنچتے لیکن وہ اس کے لئے مقدمہ فراہم کرتے ہیں یعنی انسان کی روح وجان کو معنوی سفر طے کرنے کے لئے آمادہ کردیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں کی بناپر اُخروی سزائوں کے رفع ہونے یا اُن میں تخفیف ہونے کا سبب بن جاتے ہیں اور اگرچہ لازم شرطوں کے نہ ہونے کی بناپر بہشت میں داخل نہیں ہوگا اوراسے ابدی سعادت یسر نہیں ہوگی لیکن مطلق ایسا بھی نہیں ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہ ہو"۔ (۱)

۲۔ فعلی اور عینی عنصر

اخلاقی عمل کے لئے ان شرطوں کے علاوہ جو فاعل کے ذریعہ ان کی انجام دہی میں ہونی چاہیئے، لازم ہے کہ وہ عمل فی نفسہ اورذاتی طور پر بھی نیک، اچھا اور پسندیدہ ہو۔

اسلامی علوم میں رائج تعبیر کے مطابق اُ سے حُسن فعلی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں یہ حُسن فاعلی کے مقابلہ میں ہے جس کے بارے میں عنصر فاعلی کے عنوان کے تحت اس کتاب میں گفتگو ہوئی ہے۔

اس سوال کے بارے میں کہ کیا کوئی عمل ذاتی طور پر نیک اور شائستگی کا حامل ہے یا نہیں ؟ اس سے پہلے اس سلسلہ میں اجمالی طور پر گفتگو ہوچکی ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تحقیق اور معلومات کے لئے اس سے مربوط منابع و مصادر میں جستجو کرنی چاہیئے (۲) لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ اس عمل کا معیار اور اس کی نشانی انسان پر منحصر ہیں اور انھیںنشانیوں کی بنیاد پر اُسے نیکی اور برائی سے متّصف قرار دیاجاتاہے اور وہ ثواب یا عقاب کا مستحق ہوتا ہے اور محاسبہ وآزمائش کی بنیاد پر انسان خدا کے نزدیک جگہ پاتاہے۔ جب کہ اگر خارجی عمل پر اس کے علائم سے ہٹ کر اس پر توجہ کی جائے تو صرف ایک بدنی حرکت ہوگی اور وہ حرکت باقی تمام حرکتوں کی طرح نہیں ہوگی اور اس کی بہ نسبت اچھائی اور برائی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ (۳)

۱۔ ر۔ک مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق درقرآن، ص۱۷۲، ۱۱۷۱۔

۲۔ سبحانی، جعفر: حسن وقبح عقلی، پایہ ہائے جاودان اخلاق کی طرف رجوع کیجئے۔

۳۔ علامہ طباطبائی: المیزان، ج۱٦، ص۸۲۔

اخلاقی عمل کے لئے حُسْن فعلی کی ضرورت کو عقلائی لحاظ سے بیان کرنے کے لئے کہا جاسکتاہے کہ انسان کا ارادی وآزادانہ (غیر ارادی) فعل اس کے نفس کے ذریعہ وجود میں آتاہے اور کمیّت، کیفیت، شکل، زمانی ومکانی خصوصیات وغیرہ کے لحاظ سے وہ فاعل کے مقصد کے تابع ہے۔ یعنی حقیقت میں فاعل کا مقصد اس کے عمل کی روح اور اسے وجود میں لانے والا ہے۔ اس بناپر ہر کام کو ہر مقصد کے ساتھ انجام نہیں دیا جاسکتا ہے اور ہر مقصد ایک خاص طریقہ سے کسی عمل کے ساتھ سنخیت اور مناسبت رکھتا ہے۔ سونے کی حالت میں کسی علمی امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔ گھرمیں بیٹھ کر کعبہ کی زیارت نہیں ہو سکتی ہے اوردوسروں کی عزت وحرمت اور مال کے ساتھ زیادتی کر کے پروردگارکی خوشنودی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔(۱)

اس طرح فلسفۂ اخلاق اسلامی میں فاعل کی نفسانی حالت اور مقصدپر بھی توجہ کی جاتی ہے اس کے علاوہ عمل کی عینی ماہیت اوراس کے واقعی وحقیقی آثار کو بھی توجہ کامرکز بنایاجاتاہے۔ یہ مکتب اُن اصالتِ فاعل کے طرفدار مکاتب کے برخلاف ہے جو عمل کی انجام دہی میں فقط فاعل کے نفسانی پہلووں پرتاکید کرتے ہیں اور اصالت عین کے طرفدار مکاتب کے بر خلاف بھی ہے جو صرف خارجی عمل کی طبیعت اوراس کے عینی ومادی آثار کو اخلاقی اچھائی اوربرائی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو شرائط وحالات اخلاق اسلامی میں فاعل کے مقصد کے لئے عمل کا معنوی عنصرہیں اوراسی طرح اخلاقی عمل کے مادی عنصرکے لئے ضروری مانے جاتے ہیں، وہ دوسرے اخلاقی مکاتب میں بیان ہونے والے شرائط وحالات سے بنیادی طورپر مختلف ہیں۔

۱۔ر۔ک: مصباح یزدی، محمدتقی، دروس فلسفۂ اخلاق، ص۱۶۸،۱۶۷۔

ب: اخلاقی ذمہ داری کی شرطیں

گزشتہ بحث میں اخلاقی عمل کی اہمیت کی شرطوں اور ان کے عنصروں کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اخلاقی تعریف، جزا اور اس کی اہمیت اور قدر وقیمت کے مقابلہ میں اخلاقی سرزنش، مذمّت وسزا اوراس کی ذمہ داری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اخلاق میں "قدر وقیمت "اور"ذمہ داری" دوفیصلہ کن بنیادی رکن کی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن میں سے کسی ایک کے فقدان کی وجہ سے ایک اخلاقی نظام کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس وجہ سے مناسب ہے کہ اخلاقی ذمہ داری کے اصلی عناصر اور ارکان کے بارے میں بھی کچھ بیان کیا جائے۔

اخلاقی ذمہ داری سے مراد پروردگار کے حضور میں ذمہ داری ہے اوراس کے نتیجہ میں اخروی جزاوسزا ہوتی ہے خواہ دنیوی ذمہ داری اورسزا وجودرکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔دوسرے لفظوں میں اخلاقی ذمہ داری کی علامت، عمل پر مترتب ہونے والا اخروی عقاب اور سزا ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے اخلاقی قدر وقیمت آخرت میں جزا وثواب کو وجودمیں لاتی ہے ۔ مسلمان متکلمین، اخلاقی دستوروں کے مقابلہ میں ذمہ داری کی شرطوں کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ان شرطوں میں کچھ اصل دستور اور اخلاقی تکلیف سے مربوط ہیں، کچھ دوسری شرطیں، دستور دینے والے سے مربوط ہوتی ہیں اُن میں سے بعض شرطیں ایسی ہیں جواُن موضوعات کے لئے ہیں جن سے دستور کا رابطہ ہوتا ہے

اور بعض دوسری شرطیں مسئول وذمہ دار انسان سے مربوط ہوتی ہیں۔ [۱]

اخلاقی اوامر واحکام کے پسندیدہ ہونے کی وہ شرطیں جو شریعت کی اساس اور بنیاد کا اہم حصہ ہیں اور اسی طرح حاکم اور اخلاقی فرمان جاری کرنے کے لائق انسان کی خصوصیات، علم اخلاق کے کلامی موضوعات وافکار کی جزہیں اوران کے سلسلہ میں تحقیق وبحث کرنے کی جگہ، علم کلام ہے جہاں خداشناسی، نبوت اور دین کی ضرورت، جیسے مباحث میں بحث و تحقیق کی گئی ہے۔ اُن عملی شرطوں کو بیان کیا جاچکا ہے جن کے لئے حکم دیا جاتا ہے یا ان کی انجام دہی سے نہی کی جاتی ہے، اب اُن بنیادی عناصر کے سلسلہ میں گفتگو ہوگی جن کا انسان کے اندر موجود ہونا اخلاقی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے شرط اور ضروری ہے۔

۱۔بلوغ

بچے اورنا بالغ افراد اخلاقی ذمہ داری کے بارے سے آزاداور بری ہیں۔ البتہ اُن کے سرپرست اُن کے اعمال کی خاطر حقوقی طورپر ذمہ دارہیں۔اس وجہ سے اسلام کے اخلاقی نظام میں بچوں کے نیک اعمال اخلاقی اہمیت اورثواب وجزا کے حامل ہیں لیکن ان کی اخلاقی برائیوں سے متعلق سوال نہیں ہوگا اور اُن کے لئے آخرت میں کوئی کیفروسزانہ ہوگی۔

اسلام کی مقدس کتابوں میں اخلاقی ذمہ داری کی بنیادی شرطوں میں سے بلوغ کو ایک شرط کے طورپرپیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طورپرحضرت امام محمد باقرـ ایک روایت میں بلوغ کے زمانہ آغاز کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "انسان کے سنّ بلوغ تک پہنچنے کے بعد حدودالٰہی مکمل طورپراس کے نفع اورنقصان میں جاری ہو جائیں گے۔" [۲]

۱۔ علامہ حلی: کشف المراد، ص ۳۲۲، شیخ طوسی: الاقتصادفی مایتعلق بالاعتقاد، ص۱۰۷۔ حمصی رازی شیخ سدید الدین: المنقذسن التقلید، ص۲۸۸کی طرف رجوع کیجئے۔

۲۔ رک۔ کلینی: کافی، ج:۷، ص:۱۹۸۔ شیخ صدوق: فقیہہ، ج٤، ص١٦٤۔

۲۔ عقل

طبیعی وفطری بلوغ کے علاوہ قوۂ عقل کی موجودگی اخلاقی ذمہ داری کی شرط ہے۔ اس بناپر وہ افراد جو عقل سلیم نہیں رکھتے اورقدرت تعقل کی کمی سے دوچارہیں وہ اخلاقی ذمہ داری کے حامل نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے سرپرست اُن کے اعمال کے نتیجہ میں دوسروں کو ہونے والے نقصانات کے تئیں حقوقی طورپر ذمہ دار ہوتے ہیں۔

فاعل میں عقل کے موجود ہونے کی ضرورت پر جودلیلیں ہیں اُن میں سے ایک وہ اثر ہے جو فاعل میں علم وآگاہی کے لئے عقل رکھتی ہے[1]۔ آئندہ بیان ہو گا کہ اخلاقی ذمہ داری کی شرطوں میں سے ایک فعل کی اچھائی اور برائی سے متعلق فاعل کا علم اور اس کی آگاہی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ شرط عقلی قدرت پر موقوف ہے انسان کے اندر عقل وادراک کی موجودگی آگاہی کے لئے ضروری مقدمہ ہے اور خود اخلاقی ذمہ داری کے لئے ایک شرط محسوب ہوتی ہے۔

۳۔ علم یا اسے حاصل کرنے کا امکان

کوئی انسان اخلاقی طورپراس وقت ذمہ دارہوتا ہے جب ترک کی جانے والے اعمال کی خرابی، برائی اور ممنوعیت کے بارے میں اورانجام دئے جانے والے اعمال کی خوبی، شائستگی، وجوب اور اسی طرح اُن کو انجام دینے کے سلسلہ کی کیفت میں علم وآگاہی رکھتا ہو یا یہ کہ ضروری علم حاصل کرنا اس کے لئے ممکن ہو۔یعنی ایسے حالات وشرائط کے تحت ہو جن میں وہ ان سے متعلق علم کو حاصل کرسکے۔[2]

اس بنا پر بہت سے ایسے مسلمان یا غیر مسلمان جو اپنے اخلاقی فرائض کے بارے میں علم نہیں رکھتے لیکن اُن کے لئے اس طرح کا علم حاصل کرنا ممکن ہے، وہ اس طرح کے اپنے اعمال کے سلسلہ میں اخلاقی طورپر ذمہ دارہیں اور اخروی سزائیں ان لوگوں سے بھی متعلق ہیں اگرچہ فی الحال علم نہ رکھتے ہوں ان کے مقابلہ میں وہ مسلمان یا غیر مسلمان جن کے لئے اس طرح کا امکان فراہم نہیں ہے اوران سے ممکن بھی نہیں ہے وہ اس طرح کی اخلاقی ذمہ داری سے بری ہونگے۔اخلاق کے علاوہ موجودہ حقوقی نظام بھی انسان کے علم یا اس کے لئے علم حاصل کرنے کے امکانات کو کیفری طورپر ذمہ دار ہونے کے لئے شرط سمجھتے ہیں۔

۱۔ رک۔ شیخ طوسی: الاقتصاد فی مایتعلق بالاعتقاد، ص۱۱۷۔

۲۔ ایضاً ۱۱۶، ۱۱۷۔ علامہ حلی: کشف المراد، ص۳۲۲۔

فرائض سے متعلق علم یا اسے حاصل کرنے کے امکان کو اخلاقی ذمہ داری کے لئے ایک شرط کیوں مانا گیا ہے؟

علم کی شرط اور اس کی موجودگی کی ضرورت کے سلسلہ میں اس کیوں کا جواب دینے کے لئے فطری ، وجدانی، عقلی و عقلائی اور دینی لحاظ سے متعدد دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں:

پہلی دلیل :

انسان کا سالم وجدان کسی انسان کے لئے کیفر اور سزا کے اعلان و ابلاغ کے بغیر اور اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک وہ اپنے فریضہ سے متعلق علم کے حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔[۱]

یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہے کہ یہ شرط حتیٰ اس نظریہ کی صورت میں بھی قابل قبول ہے کہ بدلہ اور سزا کو اخلاقی عمل کا طبیعی نتیجہ مان لیں، کیونکہ وہ لوگ بھی جو عمل اور بدلہ کے درمیان قراردادی رابطہ کی نفی کرتے ہیں اور تکوینی رابطہ کو قبول کرتے ہیں عمل کا لحاظ اس کے معنوی عناصر کے ساتھ کرتے ہیں نہ کہ فقط مادی عنصر کے ساتھ۔ یعنی اخلاقی عمل اس کے تمام عنصروں، منجملہ ان کے اس کا مادی پیکر کے ساتھ، فاعل کے مقصد اور نیت اور اس کے آگاہ ہونے اور نہ ہونے کے نتیجہ میں بدلہ اور کیفر کی صورت میں نتیجہ دیتا ہے اور یہ فقط اس کے مادی پیکر میں نہیں ہے۔

دوسری دلیل:

عقل، فریضہ سے متعلق علم وآگاہی کو فریضہ کی انجام دہی کے لئے تکوینی اور فلسفی شرط کے طور پر مانتی ہے اور اس بنا پر اس کے فقدان کی صورت میں فریضہ کی انجام دہی کو محال جانتی ہے۔ کیونکہ فرائض سے متعلق جہل کی حالت میں فریضہ سے متعلق پابندی کے لئے فاعل میں کوئی مقصد اور اسے تحریک کرنے والی کوئی چیز موجود نہ ہوگی اس طرح مقصد کے بغیر فعل کا صادر ہونا عقلی طور پر محال ہے[۲] اس کے علاوہ عقل اصولی طور پر انسان کی جواب دہی، بازپرس اور سزاؤں کو مجہول تکلیف (نامعلوم فریضہ) اور ان حالات کی بنا پر جن میں انسان نے اپنے اخلاقی فرائض سے آگاہی کے لئے پوری کوششیں کی ہیں، برا، ناپسند، اور حقیقت میں تشریعی عدالت کے خلاف جانتی ہے[۳] عقل کے اس فیصلہ کو علم اصول کے علماء قاعدہ "قبح عقاب بلا بیان" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔

۱۔ رک۔ آخوند خراسانی: کفایۃ الاصول، ص: ۳۴۳۔

۲۔ میرزا نائینی: فوائد الاصول (تقریر شیخ محمد علی کاظمی)، ج۳، ص۳۶۵۔ ۳۷۱۔

۳۔ آخوند خراسانی: کفایۃ الاصول۔

تیسری دلیل:

عقلائی اور عرفی وجدان، مجہول تکلیف (نامعلوم فریضہ) کے ترک کرنے پر سزا کا مستحق نہیں جانتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سماج کے عقلمند لوگ، اپنے ماتحت رہنے والوں کو اس دستور کی بنا پر جو ان کے لئے اعلان نہیں ہوا اور ان تک نہیں پہنچا ہے یا جس کی دستیابی میں ان لوگوں نے کوتاہی اور تقصیر نہیں کی ہے، جواب دہی اور سزا کا مستحق نہیں جانتے ہیں اور اُن لوگوں کو سزا دینا غیر مناسب اور برا مانتے ہیں۔

چوتھی دلیل:

کتاب وسنت میں مذکورہ قاعدہ (قبح عقاب بلا بیان) کی تائید کثرت کے ساتھ کی گئی ہے۔ نمونہ کے طور پر ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

خداوند عالم فرماتا ہے: "ہم نے جب تک پیغمبر کو مبعوث نہیں کرتے، اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے"۔ (۱)

معروف تفسیروں کے مطابق پیغمبر کو (بغیر کسی مقصد کے) بھیجنا اہم نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک ضروری علم وآگاہی کو لوگوں تک نہیں پہنچا دیا جاتا، ان لوگوں کو ذمہ دار نہیں جانا جاسکتا ہے اور سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔

دوسری جگہ پر فرماتاہے: "خدا کسی کو بھی تکلیف نہیں دیتا مگر صرف اتنی جتنی کہ اسے قدرت دی ہے"۔ (۲) اس آیت کے مطابق بھی انسان اسی قدر ذمہ دار ہے جس قدر اس نے کچھ حاصل کیا ہے یا حاصل کرسکتا ہے۔ خواہ علم وآگاہی ہو یا قدرت واستعداد۔

پیغمبر اکرم نے بھی فرمایا ہے:

"ہماری امت سے نو چیزوں (کے بدلہ) کو اُٹھا لیا گیا ہے: خطا، فراموشی، لاعلمی، ناتوانی، وہ امور جن کی خاطر قدرت نہیں ہے، وہ امور جن کو اضطرار یا اکراہ یا اجبار کی وجہ سے انجام دیا جاتا ہے، فال بد نکالنا، خلقت میں اور تفکّر وتدبّر میں وسوسہ پیدا ہونا اور حسد اس صورت میں کہ زبان یا ہاتھ سے ظاہر نہ ہو۔ (۳)

۱۔ سورۂ اسراء آیت ۱۵ (وَمَاكُنّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّىٰ نَبْعَثْ رَسُوْلاً)۔

۲۔ سورۂ طلاق آیت ۷ (لَايُكَلِّفَ اللهُ نَفْساً اِلّا مَا آتَاهَا)۔

۳۔ کلینی، کافی، ج ۲] کتاب الایمان والکفر، باب ما رفع عن الامۃ [ح ۲۔ صدوق، فقیہہ، ج ۱، ص ۳۶۔ خصال، ج ۲، ص ۴۱۷۔

اس حدیث میں انسان نوچیزوں سے متعلق اپنی اخلاقی ذمہ داری اور جواب دہی وسزا سے معاف ہوگیا ہے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ انسان ان تکلیفوں اور فرائض کے سلسلہ میں جواب دہ نہ ہوگا جن کے بارے میں علم وآگاہی نہیں رکھتا ہے مگر یہ کہ اس کی لاعلمی تقصیر اور کوتاہی کی بنا پر ہو، نہ کہ غلطی اور مجبوری کی بناپر۔ اس (غلطی کی) صورت میں بے خبر رہنا ذمہ داری کو ختم نہیں کرتا ہے۔اس وجہ سے کہ علم کا دوام اورباقی رہنا بھی اخلاقی ذمہ داری کے تحقق کے لئے مؤثر ہے اور عقلی طور پر بھولنے والے انسان کے لئے تکلیف اور ذمہ داری نہ ہونے کی دلیل کی بنا پر وہ انسان جو پہلے اپنی اخلاقی ذمہ داری سے متعلق علم رکھتا تھا لیکن ا سے انجام دیتے وقت غفلت اور فراموشی کا شکار ہوگیا، اخلاقی طور پرذمہ دار نہ ہوگا۔

٤۔قدرت

اس شرط کی بنیادپرانسان اُن چیزوں کے بارے میں جن کی پابندی کے لئے توانائی نہیں رکھتا اخلاقی طور پر ذمہ دارنہیں ہے۔ (خواہ وہ فعل کو انجام دینے کے لئے ہو یا ترک کرنے کے لئے) اور قیامت کے دن اس سلسلہ میں اس سے سوال وجواب نہ کیا جائے گا اور قابل توبیخ نہ ہو گا۔ اسلامی علوم میں یہ شرط "تکلیف مالایطاق" کے عنوان کے تحت محال اور قبیح ہے اور یہ مسئلہ تمام لوگوں کے نزدیک مشہور، رائج اور قابل قبول ہے۔

مسلمان حکما اور متکلمین نے اس شرط کو ثابت کرنے کے لئے اس کے عقلی پہلو (یعنی یہ کہ نا قابل برداشت تکلیف اور فریضہ کی انجام دہی کا حکم دینا عدالت کے باخلاف اور ظلم کے واضح مصداقوں میں سے ہے) پر زور دینے کے علاوہ الٰہی حکمت اور خدا کے افعال کے بامقصد ہونے کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ خدا کے تکوینی اور تشریعی افعال کے حکیمانہ ہونے کی مصلحت کی بناپر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُنہیں تکلیفوں کو بندوں کے لئے مقرر کرتا ہے جن کے نتیجہ میں مقصد حاصل ہو سکے۔یہ بات واضح ہے کہ یہ مقاصد اس صورت میں قابل مقدور ہونگے کہ مقررشدہ فرائض کی انجام دہی افراد کی طاقت و توانائی سے باہر نہ ہو۔ اس بناپر ایسے امور کے لئے تکلیف معین کرنا جو انسان کے لئے غیر مقدور و ناممکن ہے، بے کار و بے فائدہ اور حکمت و مصلحت کے خلاف ہے اور اُن کا حکیم پروردگار کی طرف سے نافذ ہونا محال ہے۔[1]

١۔ رک۔ سبحانی، جعفر، الٰہیات، ج ١، ص ٣٠١۔ شہید صدر: دروس فی علم الاصول، حلقہ دوم، ص٢٣٥تا ٢٤٠۔

یہ شرط کتاب وسنت میں بھی کئی بار تائید اور تأکید کے مرحلہ سے گذری ہے۔ اُن کی بعض مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

"خدا کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی قدر جتنی کہ اس کے پاس توانائی ہے۔ جو کچھ نیکی سے حاصل کیا اس کے لئے مفید اور جو کچھ برائی سے حاصل کیا اس کے لئے نقصان دہ ہے"۔ (۱)

"ہم کسی کو تکلیف نہیں دیتے مگر اسی قدر جتنی کہ اس کے پاس طاقت ہے۔ اور ہمارے پاس وہ کتاب ہے جو حق بیان کرتی ہے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا ہے"۔ (۲)

اس بات کے علاوہ کہ انسان کو اصل فعل کی انجام دہی پر قادر ہونا چاہیئے، یہ بھی ضروری ہے کہ اگر مکلّف کے لئے فریضہ کو انجام دینے میں وسائل ومقدمات فراہم کرنے کی ضرورت ہو تو مکلف کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مقدمات کو بھی حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہو، ورنہ حقیقت میں وہ اس فریضہ سے متعلق قدرت اور توانائی نہیں رکھتا۔ (۳)

یاد رہے کہ جس طرح علم کا فقدان اس صورت میں اخلاقی ذمہ داری کو معاف کرتا ہے جب انسان نے اپنی لاعلمی کے سلسلہ میں تقصیر اور کوتاہی نہ کی ہو، اسی طرح قدرت اور توانائی کی شرط کے سلسلہ میں بھی کہنا چاہیئے کہ ہم بہت سے مقامات پر قدرت وتوانائی حاصل کرنے کے لئے ذمہ دار ہیں (٤)، مثلاً ہمارا فریضہ ہے کہ اسلامی سرزمین اور ملکوں کی حفاظت اور ان کے دفاع کی قدرت وتوانائی اور آمادگی کے وسائل کو فراہم کریں۔

"(اے ایمان لانے والو!) تم سب ان کے مقابلہ کے لئے ہر ممکن طاقت (جنگی سامان) اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کر لو تاکہ اُن کے ذریعہ خدا کے دشمن اور خود اپنے دشمن اور اُن دشمنوں کو جن کو تم نہیں جانتے اور اﷲ جانتا ہے ڈرائو۔ (٥)

۱۔ سورہ بقرۃ، آیت ۲۸٦ ۔ علامہ طباطبائی: المیزان، ج ۲، ص٤٤۳، ٤٤٤۔

۲۔ سورۂ مومنون، آیت ٦۲۔ اور اسی طرح سورۂ انعام، آیت ۱٥۲ ۔ اور علامہ طباطبائی: المیزان، ج ۱٥، ص ٤۱تا٤۳۔

۳۔ ر، ک۔ شیخ طوسی، الاقتصاد فیما یتعلق بالاعتقاد، ص۱۱۹، ۱۱۸۔

٤۔ ر، ک۔ شہید مرتضیٰ مطہری: مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی (انسان درقرآن)، ص۲۷۷، ۲۷٦۔

٥۔ سورہ أنفال، آیت٦۰

۵۔ اضطرار (مجبوری) کا نہ ہونا

اضطرار (مجبوری) بہت سی جگہوں پر اخلاقی ذمہ داریوں کو ختم کردیتا ہے۔" مضطر"اس انسان کو کہتے ہیں جسے مشکل حالات کا سامنا ہو۔ جیسے یہ کہ کوئی انسان کسی بیابان میں عاجز وناتوان اور بھوکا ہو اور اسے کھانے کے لئے مردار کے علاوہ کوئی چیز نہیں ملتی۔

٦۔ اکراہ واجبار کا نہ ہونا

اکراہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب انسان کو کسی دوسرے جابر انسان یا گروہ کے ذریعہ دھمکی دی جاتی ہے اور وہ اپنی باطنی مرضی کے برخلاف ایسے فعل کو ترک کرنے یا انجام دینے پر مجبور ہوتا ہے جو اخلاقی لحاظ سے برا اور ناپسند ہے۔ جیسے یہ کہ اس سے کہا جائے کہ اگر تم نے اپنے روزہ کو نہیں توڑا تو تمہاری جان لے لوں گا یا یہ کہ اگر فلاں مسئلہ میں سچ بولوگے تم کو کام سے ہٹادیا جائے گا۔

وہ حدیث جسے حدیث رفع کہا جاتا ہے ایسے مختلف امور کو بیان کرتی ہے جن میں انسان کے لئے تکلیف اور ذمہ داری نہیں ہے، اُن امور میں سے ایک "ما استکرہوا علیہ" ہے یعنی وہ امور جنہیں انجام دینے یا ترک کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اکراہ اور اضطرار میں فرق یہ ہے کہ اضطرار میں دھمکی دینے والا کوئی نہیں ہوتا ہے بلکہ مجموعی حالات اس طرح ہوجاتے ہیں کہ وہ ناپسند حالات انسان کے اوپر بار ہو جاتے ہیں اور انسان ان نامطلوب حالات کو رفع کرنے کے لئے ناچار ہو جاتا ہے کہ اپنے اخلاقی فریضہ کے برخلاف عمل کرے اور اکراہ میں انسان اس مصیبت اور نقصان کو دفع کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ اپنے اخلاقی فریضہ کے برخلاف عمل کو انجام دے جو کسی دوسرے کی دھمکی کے نتیجہ میں اس کے سامنے ہے۔

اکراہ اور اضطرار مندرجہ ذیل دو بنیادی اسباب سے وابستہ ہے

ایک۔ ایسا صدمہ اور نقصان جس سے بچنا ضروری ہے۔

دو۔ اس تکلیف اور وظیفہ کی اہمیت کہ انسان اکراہ یا اضطرار کی بناپر اسے انجام دینے سے پرہیز کرتا ہے۔

اسلام کے اخلاقی نظام میں بعض اخلاقی فرائض کو اکراہ یا اضطرار کی بنا پر ہرگز ترک نہیں کیا جاسکتا ہے اور ہر حالت میں ان کی پابندی نہیں کی جاسکتی اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے نقصان کو برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے کبھی بھی اکراہ یا اضطرار کی بناپر دوسروں کی جانوں کو خطرہ میں نہیں ڈالا جاسکتا ہے یا سماجی مصلحتوں کے خلاف عمل نہیں کیا جاسکتا ہے یا دین کی اہم مصلحتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ [۱]

۷۔ قصد و عمد

اخلاقی طور پر ذمہ دار (جوابدہ) ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ انسان قصداً اور عمداً اپنے اخلاقی فریضہ کو نظر انداز کردے۔ اس بناپر جب بھول چوک کی وجہ سے اپنے اخلاقی فریضہ کو ترک کردے تو اخلاقی لحاظ سے وہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۱۔ رک۔ شہید مرتضیٰ مطہری: مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی، ۲۷۷۔۲۷۸۔

ج:۔ اخلاقی عمل کی پہچان

کار آمد اخلاقی نظام کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی تعیین کے لئے عقلی اصولوں اور معیاروں کو پہچنوانے کے علاوہ ان کے مصداقوں کی بھی واضح طریقہ سے پہچان کرائے۔ انسانی اخلاقی نظام کے ناقص ہونے کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اخلاقی فضائل ورذائل کو پہچنوانے کے لئے مفید قاعدوں، طریقوں اور راستوں کو پیش کرنے میں وہ ناکام ہیں حتی اگر یہ بھی قبول کر لیا جائے کہ اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کے سلسلہ میں اُن کی طرف سے پیش کردہ کلی اصول اور معیار صحیح ہیں۔(۱)

اسلام کے اخلاقی نظام میں اخلاقی فضائل ورذائل کے مصداقوں تک پہنچنے کے لئے اِن تین بنیادی طریقوں پر تاکید کی گئی ہے جو اپنی خاص ماہیت رکھتے ہیں:

ا۔ عقل(۲)

اعمال اور اشیاء کے ذاتی حُسن وقبح کو قبول کرنے اور اچھائی اور برائی کو درک کرنے اور پہچاننے کے لئے انسانی عقل کی توانائی کا اعتراف کرنے کے ساتھ انسانی عقل کو اسلام کے اخلاقی نظام میں ایک مستقل قاضی کی حیثیت سے مانا گیا ہے۔ عقلی راستہ ایک ایسا راستہ ہے جو وحی سے جدا اور مستقل طریقہ ہے اور یہ بہت سی اچھائیوں اور برائیوں کو پہچنوانے کے لئے ذاتی طور پر قادر ہے۔

۱۔ نمونہ کے طورپر کانٹ کے اخلاقی نظریہ میں جو ممتاز اخلاقی مکاتب میںسے ہے کہا گیا ہے کہ وہ عمل اخلاقی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے جو تکلیف اور فریضہ کا مصداق ہو اور فاعل کی نیت اور مقصد صرف فریضہ کو انجام دینا۔ وہ اس سوال کے جواب میں کہ فریضہ کو کس طرح پہچانا جاسکتا ہے ؟ جواب دیتا ہے کہ فریضہ ایک مطلق اور کلی بات ہے جو عام قانونی صورت میں مقرر ہوسکتا ہے۔ کانٹ اس بات کی تشخیص دینے کو انسان کی مشترک عقل یا وجدان کے سپرد کرتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ ضابطہ اور قانون بہت زیادہ کلی، غیر شفاف اور تفسیر کا محتاج ہے جس کے نتیجہ میں اس نظریہ کے کارگر اور مفید ہونے کو بہت زیادہ محدود کر دیتا ہے۔ (رجوع کیجئے: ایمانوئل کانٹ، ص۱۲ تا ۳٤)۔

۲۔یہاں پر "عقل" سے مراد عقلی احکام کی وہ قسم ہے جو قاعدۂ کلیہ: "حکم عقل وشرع کے درمیان ملازمہ" کے تحت قرار پا سکتی ہے اور اس قاعدہ کی مدد سے ارادۂ شریعت کی حکایت کرسکتی ہے۔ اس بات کے شرائط وکیفیات کو اصول فقہ کی کتابوں میں ملازمات عقلیہ کی بحث میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

انسانی عقل قطعی طور پر درک کرتی ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کا احترام کرنا چاہئے، ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے جو ان کے لئے مناسب ہے، دوسروں کے مال پر ان کی ملکیت کا احترام کرنا چاہئے، اپنے فائدہ کو دوسروں کے نقصان پہنچانے کا ذریعہ نہ بنائے، دوسروں کی زیادتیوں کی تلافی عادلانہ طریقہ سے کی جائے، افراد کے مخصوص حقوق کا احترام کیا جائے اور اس طرح کی دسیوں ایسی مثالیں ہیں جو اخلاقی فضیلتوں کے اصولوں میں سے ایک اصل ہیں۔ انسانی اور الٰہی اخلاقی مکاتب کے درمیان پائی جانے والی اخلاق کی بعض مشترک چیزیں، اخلاقی اچھائی اور برائی کے متعلق انسانی عقل کا حاصل کروہ نتیجہ اور معلول ہیں۔ البتہ اخلاق کی بہت سی جزئی چیزوں کو سمجھنے میں عقل کی ناتوانی کی بنا پروہ (عقل) ہر گز انفرادی حیثیت سے اخلاق کی جامع وکامل عمارت نہیں کر سکتی۔

۲۔ فطرت (۱)

اخلاق سے متعلق نیکیوں کی طرف فطرت کی رغبتیں اوربرائیوں سے باطنی طور پر نفرتیں آدمی کی سرشت میں ہیں اور یہ ایسا قابل اعتماد اور اطمینان بخش طریقہ اور راستہ ہے جس کا مقصد ومبداء انسانیت کا پاک اور غیر آلودہ گوہر قلب سلیم ہے۔ انسان کی فطری رغبتوں کو ان کے مثبت اور معنوی ہونے، ارادی اور زیادہ باخبر ہونے اور ان کا انسانی زندگی سے مخصوص ہونے جیسے معیا روں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ان غریزی اور طبیعی میلانات سے جدا کیا جاسکتا ہے جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو رائج عام تہذیب وتمدن اور علم و تعلیم و تربیت سے بے خبر ہیں لیکن اس (فطرت) کے جہاں بیں جام اور حق نما آئینہ کا نظارہ کرنے کی برکت سے مکارم اخلاق کے شفاف سرچشموں سے سیراب اور اخلاقی فضائل کے زیور سے آراستہ ہیں۔ اُویس قرنی وہ یمنی بادیہ نشین ہیں جو رسول خدا(ص) کے جمال کو دیکھے بغیر آپ کے فضائل ومکارم کے شیفتہ ہوجاتے ہیں اور آپ سے ملنے کے لئے اپنے وطن اورمال و دولت کو ترک کردیتے ہیں۔ سلمان فارسی فضیلت اور حقیقت کی جستجو میں ہر دَیر و خانقاہ کا چکر لگاتے ہیں اور عیسائی راہب اوریہودی خاخام سے جس کادل اس کے بارے میں خبر رکھتا تھا سوال کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ بے حد مشقت کا سامنا کرتے ہیں اور آخر کار یثرب کے اطراف نخلستانوں میں اپنی آرزئوں کی تجلی، امیدوں کی کرن اور اپنے گم گشتہ محبوب کو حبیب خدا کی صورت میں پالیتے ہیں اوریہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اہلبیت اطہار (ع) کے رازداروں میں شمار کئے جانے لگتے ہیں۔

۱۔یہاں فطرت سے مراد ایسے واضح، معلوم شدہ اور اختیاری، مثبت، عالی، غیر اکتسابی اور باطنی رجحانات ہیں جو تمام انسانومیں بالقوۃ پائے جاتے ہیں اور حالات کے فراہم ہونے پر فعلیت حاصل کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے معرفت کے سرچشموں اور ترقی کی راہوں کو اور اس سلسلہ میں آنے والی رکاوٹوں کو بار بار یاد دلایا ہے اور ان کی نشان دہی کی ہے۔ سورۂ شمس میں کئی بار قسمیں کھانے کے بعد، جس میں آخری قسم آدمی کی جان اور نفس کی قسم ہے، فرماتا ہے:

"پھر اُس کو بدی اور تقویٰ کا الہام کیا ہے"۔ [۱]

الہام سے مراد وہ علم ہے جو تصور اور تصدیق کی صورت میں انسانی جان کے سپرد کردیا گیا ہے۔ خدا کی طرف سے فجور اور تقویٰ کا الہام اس معنی میں ہے کہ انسانی رفتار کی اچھائی اور برائی کو فطری طور پر اسے بتایا اور سکھایا گیا ہے۔ مثلاً انسان واضح طور پر یتیم کا مال کھانے کی برائی کو اپنے مال کے استعمال سے جدا کرنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہے [۲]

خدا وند عالم سورۂ روم میں فرماتا ہے:

"بس (اے رسول!) اپنے رُخ کو دین توحید (اسلام) کی طرف رکھیئے اس حال میں کہ آپ دوسرے تمام ادیان ومذاہب سے منہ پھیرے رہیں اور حق پرست رہیں۔ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر خدا نے لوگوں کو خلق کیا ہے خدا کی خلقت (توحیدی فطرت) میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوسکتی یہی ہے سیدھا اور مستحکم دین۔ لیکن اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے ہیں"۔ [۳]

اس آیت میں اس دین کو جو عقائد اور اخلاق، حقوق وغیرہ کی تعلیمات کا مجموعہ ہے، ایک فطری بات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جسے پہچاننا اور اس کی طرف رغبت پیدا کرنا انسان کی سرشت میں ڈال دیا گیا ہے۔ [٤]

۳۔ وحی

گذشتہ دو طریقے اگرچہ بہت سی جگہوں پر مشکل کشائی کرتے ہیں لیکن اُن کا مفید وکارگر ہونا کلی اور اصولی امور تک منحصر ہے اور جزئیات کی تفصیل بتانے اور اُن کو معین کرنے کے مرحلہ میں سخت نقصاندہ، ناکام اور اختلاف کا باعث بنتے ہیں۔

۱۔ سورۂ شمس، آیت۸۔

۲۔ علامہ طباطبائی، المیزان، ج۲۰، ص۲۹۷، ۲۹۸۔

۳۔ سورہ رُوم، آیت ۳۰۔

٤۔ رک۔ علامہ طباطبائی، المیزان ج١٦، ص١٧٨۔

اسی بنیاد پر خدا پرستی پر مبنی اخلاقی نظام میں "وحی" پہچان کا تیسرا طریقہ جو گذشتہ دو طریقوں کو مکمل کرتی ہے۔ وحی کو اخلاقی مفاہیم کی تعیین و تفسیر میں اور ان کی جزئیات کو بیان کرنے کی قدرت رکھنے کی بنا پر اخلاقی عمل کو پہچنوانے کے سلسلہ میں پہلا مرتبہ حاصل ہے۔ اگرچہ یہ کبھی بھی اُن دونوں کو نظر انداز نہیں کرتی ہے بلکہ ہمیشہ اُن کی ترقی اور زیادہ مفید قرار دینے پر تاکید کرتی ہے۔

اسلام کے اخلاقی نظام میں اخلاقی فضیلتوں کو اِن عنوانات کے تحت پہچنوانا گیا ہے: حَسَنَہ (نیک، پسندیدہ)، حلال، اجر و ثواب کا باعث اور جو کچھ انسان کے بہشت میں جانے کا سبب ہے۔ اور اس کے ساتھ اخلاقی برائیوں کو ذنب (جرم)، اِثم (گناہ)، حرام، گھاٹے اور جو کچھ، جہنم میں جانے کا باعث ہے ان جیسے عنوانات کے ذریعہ شناخت کرائی گئی ہے۔ اسی طرح اخلاقی لحاظ سے تمام مثبت اور منفی مفاہیم کی اہمیت اور اس سلسلہ میں داخل نمایاں باتیں جیسے سہل و دشوار، پوشیدہ و آشکار، فاعل کے مقصد اور نیت کی حالت و حقیقت اور اس کے ہمراہ یا بعد میں آنے والے کمی اور کیفی آثار و نتائج پر توجہ کرتے ہوئے کافی دقت کے ساتھ تحقیق کی گئی ہے اور انھیں جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ کتاب و سنت میں اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی طبقہ بندی کے سلسلہ میں پائے جانے والے بہت سے نکات پر دقت کی ضرورت ہے، جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔

د۔ اخلاقی اقدار کا تزاحم اور ترجیح کا معیار

عمل کے مرحلہ میں اخلاقی قدروں کا تزاحم انسان کی اخلاقی مشکلات میں سے ایک ہے۔یعنی انسان ہمیشہ اپنی شخصی اور سماجی زندگی کے دوران ایک ہی وقت میں دو یا اس سے زیادہ اخلاقی تکلیفوں سے سامنا کرتا ہے اس طرح سے کہ اُن سب کی پابندی ایک وقت میںممکن نہیں ہوتی اور اُن میں سے بعض فرائض کی انجام دہی دوسرے زمانہ میں بھی نہیں ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر اس کے پاس اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ اُن میں سے ایک کا انتخاب کرلے۔ اس ناگزیر انتخاب کے سلسلہ میں ترجیح کا معیار کیا ہے ؟ کیا اسلام کے اخلاقی نظام میں اس طرح کے انتخابات کے لئے کوئی معیار وملاک بیان کیا گیا ہے؟ ایک مفید اخلاقی نظام سے یہی امید کی جاسکتی ہے کہ اس طرح کی مشکلوں کو حل کرنے لئے ایسے معقول معیار کا مشورہ دیا جائے جسے سمجھا اور بروئے کار لایا جاسکے ۔ اسی بنیاد پر فلسفۂ اخلاق کی بعض کتابوں میں اس بات پر توجہ کی گئی ہے۔[1]

۱۔ رک۔ فرانکنا: فلسفۂ اخلاق، ترجمۂ ہادی صادقی (فارسی) ص ۱۲۱؛ اٹکینسون: فلسفۂ اخلاق، ترجمہ سہراب علوی نیا، ص ۳۱، ۵۰۔

اسلامی علوم میں فرائض کے درمیان کا مسئلہ خواہ اخلاقی ہو یا حقوقی، علماء اصول کی توجہ کا خاص مرکز بنا ہوا ہے اور تزاحم کے باب میں اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ اِن لوگوں نے مقام عمل میں قدروں کے ٹکرائو اور تزاحم و کشمکش کی قسموں کو بیان کرنے کے علاوہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے معیاروں اور قاعدوں کو بھی بتایا اور پہچنوایا ہے۔[1]

اُن معیاروں میں سب سے زیادہ اہم اورقابل فہم مندرجہ ذیل ہیں:

اخلاق اور حقوق کے درمیان میں عقلی اور شرعی لحاظ سے ترجیح دینے کا بہترین معیار، ہر فریضہ کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہے۔ یعنی جب مجبور ہوجائیں کہ دو یا چند اخلاقی تکلیفوں میں سے کسی ایک کو اطاعت اورپابندی کے لئے

انتخاب کریں تو اُن میں سب سے زیادہ اہم تکلیف کا انتخاب کرکے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم تکلیف کا انتخاب کس طرح کیا جائے؟ کیا سب سے زیادہ اہم تکلیف کی تشخیص کے لئے کوئی معیار ہے؟ انسانی عقل بہت سی جگہوں پر سب سے زیادہ اہم تکلیف کی پہچان کرنے پر قادر ہے۔ (مثال کے طور پر) جب مجبور ہوجائیں کہ دوسرے کی گاڑی کو اس سے پوچھے بغیر استعمال کرکے ایک مریض کی جان کو (ڈاکٹر کے پاس جاکر) خطرہ سے بچایا جائے یا دوسروں کے مال کا احترام کرنے کے اصول کی پابندی کی جائے، اِن دونوں باتوں

میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے تو عقلاً بیمار کی جان کو بچانا اہم اورنہایت ضروری ہوگا۔ انسانی عقل یہاں اور اس طرح کی دوسری جگہوں پر انسان کے حق مالکیّت کو نظر انداز کرنے کو موجّہ اور معقول مانتی ہے۔ بہت سی جگہوں پر عقل اور انسان کے وجدانی اور باطنی معلومات کے درمیان تزاحم سے حل کا راستہ نہیں ملتا لیکن شریعت نے اپنے خاص طریقوں سے اصولوں کو بیان کرکے اور اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی درجہ بندی اور قدر وقیمت کو طے کرکے مہم تر فریضہ کی نشاندہی کی ہے مثلاً اسلام کے اخلاقی نظام میں جب بھی انسان کے ذمہ خدا سے متعلق اور بندوں سے مربوط فرائض میں ٹکرائو ہو تو لوگوں سے مربوط فریضہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اسی بناپر دین کی مقدس کتابوں میں لوگوں کی جان ومال وآبرو کو اہم امور میں شمار کیا گیا ہے جن کے سلسلہ میں دست درازی اور زیادتی

نہیں ہونی چاہیئے۔ اِن تینوں چیزوں میں سے لوگوں کی جان اور زندگی کی حفاظت بقیہ دو چیزوں پر مقدم ہے۔ اس بناپر اخلاقی مفاہیم کو کتاب وسنت میں موجود مطالب اور اُن کے سلسلہ میں پائی جانے والی تعبیرات اور نظریات پر توجہ کرتے ہوئے حاصل کرنا چاہیئے۔

۱۔ رک: نائینی فوائد الاصول(تقریر شیخ محمد علی کاظمی)، ج۱، ۲، ص۳۱۷، اور ۳۳۵۔

کبھی ممکن ہے عقلی اور وجدانی قاعدے اور دینی کتابوں کی تعبیریں ایک فریضہ کی دوسرے کے مقابلہ میں اہمیت اور برتری کو معین کرنے کے لئے موجود نہ ہوں تو ایسی جگہوں پر انسان کسی کو بھی حسب خواہش انتخاب کرسکتا ہے۔ اس طرح اسلام کے اخلاقی نظام نے اخلاق سے متعلق اچھائیوں اور برائیوں کی جزئیات اور مصادیق کو پہچنوانے کے سلسلہ میں ضروری تدبیروں پر غور وفکر سے کام لیا ہے جو ایک مفید اخلاقی نظام کے ارکان میں سے ہے اور اس سلسلہ میں بھی اس کی حیثیت بے مثال ہے۔

دوسرا باب:

اخلاق کے عام مفاہیم۔

پہلی فصل:

ہدایت کرنے والی نفسانی صفت

جیساکہ ذکر ہوچکا ہے اس طرح کی نفسانی صفتیں، انسان میں تاثیرگذار قوتوں کے طریقوں کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بنیادی اور اصلی مفاہیم یقین اور ایمان ہیں۔ جو ایک نیک اور قدر وقیمت والی نفسانی صفت کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔یقین ایمان کی سرپرستی میں عمل کرتا ہے۔ البتہ ناپسندیدہ صفات اور منفی مفاہیم بھی ہیں جو اسی نفسانی صفت کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کتاب میں گفتگو کا محور فضیلتیں ہیں اس لئے رذائل کے بارے میں گفتگو آفات اور موانع کے عنوان سے فضائل کی تشریح کے بعد ہوگی۔

ایمان

اخلاق اسلامی میں "ایمان" ہدایت کرنے والی سب سے زیادہ اہم نفسانی صفت کے عنوان سے بہت زیادہ مقبول ہے اور اس پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے علم ویقین کی طرح اس کے مبادی اور مقدمات کو حاصل کرنے کے لئے ترغیب و تشویق سے کام لیا گیا ہے اور اسلام کے اخلاقی نظام میں اُن ذرائع اور طریقوں کی خاص اہمیت ہے جو انسان کو ان نفسانی صفات تک پہنچاتے ہیں۔ جیسے پسندیدہ فکر، خاطرات وخیالات اور الہامات۔ نفسانی صفات کے سامنے ایسے موانع اور رکاوٹیں ہیں جو انسان کو باایمان ہونے سے روکتی ہیں جیسے جہل بسیط یا مرکب، شک اورحیرت، مکاری اور فریب کاری، ناپسندیدہ نفسانی خیالات اور شیطانی وسوسہ وغیرہ۔ اِن سب کی ہمیشہ سے مذمت ہوئی ہے اوران سے روکا گیاہے۔

ایمان کی حقیقت اور اس کی شرطوں کے سلسلہ میں زمانۂ قدیم سے الٰہی مکاتب کے پیرؤوں خاص طور سے مسلمان متکلمین کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہے [۱]۔

۱۔رک۔جواد محسن، نظریہ ایمان درعرصہ کلام وقرآن، ص۱۹ تا ۱۸۰۔

اخلاق اسلامی کے دو اصلی منابع یعنی قرآن کریم اور روایات میں ایمان کی اہمیت اور اس کے مرتبہ کے بارے میں بہت زیادہ گفتگو کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایمان کی اہمیت

ایمان کے بلند مقام و منزلت کو بیان کرنے کے لئے یہ حدیث کفایت کرے گی کہ پیغمبر نے اپنی نصیحتوں میں جناب ابوذر سے فرمایا:

"اے ابوذر! خداوند متعال کے نزدیک اس پر ایمان رکھنے سے اور ان چیزوں سے پرہیز کرنے سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہے جن چیزوں سے منع کرتا ہے"۔[۱]

یہ بات واضح ہے کہ خدا کے ذریعہ منع کی گئی چیزوں سے پرہیز، صرف اس پر ایمان کے سایہ میں ممکن ہے اور حقیقت میں یہ ایمان کی برکتوں میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"خداوند متعال دنیا کو، اُن لوگوں کے واسطے بھی قرار دیتا ہے جن کو دوست رکھتا ہے اور اُن لوگوں کے واسطے بھی جن پر غضبناک ہے لیکن ایمان نہیں دیتا مگر اُن لوگوں کو جنہیں دوست رکھتا ہے"۔ [۲]

حضرت امام جعفر صادق مومن کے مقام و منزلت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جب بھی لوگوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے گا اور وہ لوگ خدا اور بندۂ مومن کے درمیان وصال و رابطہ پر نظر کریں گے اس وقت اُن کی گردنیں مومنین کے سامنے جھک جائیں گی، مومنین کے امور اُن کے لئے آسان ہوجائیں گے اور اُن کے لئے مومنین کی اطاعت کرنا سہل اور آسان ہوجائے گا"۔[۳]

یہ تمام بلند درجات جو روایتوں میں ایمان کے لئے بیان ہوئے ہیں اس اثر کی وجہ سے ہیں جو ایمان انسان کے کمال اور سعادت میں رکھتا ہے۔ ایمان ایک طرف خلیفۂ الٰہی کی منزلت پانے کے لئے سب سے آخری کڑی اور قرب معنوی کا وسیلہ ہے اور دوسری طرف قرآن و روایات کے مطابق تمام پسندیدہ نفسانی صفات اور عملی نیکیوں کے لئے مبدأ اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۔ شیخ طوسی: امالی، ص ۵۳۱، ح۱۱۶۲۔

۲۔ کافی، ج۲، ص۲۱۵، ح٤، اور ح۳ بھی دیکھئے۔

۳۔ کافی، ج۸، ص۳٦۵، ح۵۵٦۔

۲۔ ایمان کی ماہیت

اگرچہ ایمان کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں مسلمان متکلمین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے پھر بھی اُس کی اہم خصوصیتیں یہ ہیں:

ایک۔ ایمان وہ قلبی یقین، تصدیق اور اقرار ہے جو ایک طرف سے کسی امر کی نسبت نفسانی صفت اور حالت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے خالص شناخت اور معرفت سے فرق رکھتا ہے۔(۱)

دو۔ ایمان کے محقق ہونے کی جگہ نفس اور قلب ہے اور اگرچہ اس کا قولی اور فعلی اثر ہے لیکن اس کا محقق ہونا قول یا عمل پر منحصر نہیں ہے۔

تین۔ اسلام اور ایمان کے درمیان کی نسبت عام وخاص مطلق جیسی ہے یعنی ہر مومن مسلمان ہے لیکن ممکن ہے بعض مسلمان صرف ظاہر میں حق کو تسلیم کئے ہوں۔

۳۔ ایمان کے اقسام اوردرجات

اوّلاً:

ایک قسم کے لحاظ سے ایمان کی دو قسمیں ہیں: "مستقر"اور" مستودع"(مستودع یعنی وہ ایمان جو عاریت اور امانت کے طور پر لیا گیا ہو)۔

قرآن کریم میںارشاد ہورہاہے:

"وہ وہی ہے جس نے تم کو ایک بدن سے پیدا کیا ہے۔ پھر تمہارے لئے قرارگاہ اورامانت کی جگہ مقرر کردی۔ بے شک ہم نے اپنی نشانیوں کو اہل بصیرت اور سمجھدار لوگوں کے لئے واضح طورسے بیان کردی ہیں"۔ (۲)

حضرت امام موسیٰ کاظم اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"مستقر ایمان وہ ایمان ہے جو قیامت تک ثابت وپائدار ہے اور مستودع ایمان وہ ایمان ہے جسے خداوند موت سے پہلے انسان سے لے لے گا۔ (۳)

۱۔ ر۔ک: سید مرتضیٰ: الذخیرۃ، ص ۵۳۶۔ شیرازی، صدرالدین: تفسیر القرآن، ج ۱، ص۲۴۹۔ شیخ مفید: اوائل المقالات، ص۴۸۔ اس بارے میں مزید اطلاع کے لئے محسن جوادی کی کتابت نظریۂ ایمان درعرصہ کلام وقرآن، ص ۱۱۹ تا ۱۵۸۔ کی طرف رجوع کیجئے۔

۲۔ سورۂ انعام، آیت ۹۸۔ ۳۔ تفسیر عیاشی، ج ۱، ص ۳۷۱، ح ۷۲۔ تفسیر قمی، ج ۱، ص ۲۱۲، ح ۱۔

حضرت علی ایمان کی قسموں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"کچھ ایمان دل کے اندر ثابت ہوتے ہیں اور کچھ، دل اور سینہ کے درمیان، مرتے وقت تک بطور عاریت اور ناپائدار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی سے بیزار ہو تو اتنی دیر انتظار کرو کہ اس کی موت آجائے۔ اس وقت میں اس سے بیزار ہونا بر محل ہوگا۔ [(۱)]

ثانیاً:

ایمان کی حقیقت کے مراتب اور درجات ہیں اور اس میں نقصان اور کمی کا بھی امکان ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نے اس حقیقت پر تاکید کرنے کے علاوہ ایمان کو زیادہ کرنے یا اس کے کم ہونے کے اسباب کو بھی کثرت سے بیان کیا ہے، منجملہ ان کے قرآن کریم میں آیا ہے: "مومنین وہی لوگ ہیں جن کے دل اس وقت ڈرنے اور لرزنے لگتے ہیں جب خدا کا ذکر ہوتا ہے اور جب اُن پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو اُن کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہیں"۔ [(۲)]

حضرت امام جعفر صادق نے اپنے ایک شیعہ سے فرمایا: "اے عبد العزیز! حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے دس درجے ہیں سیڑھی کی طرح کہ ا سے زینہ بہ زینہ طے کرنا چاہئے اور بلندی پر پہنچنا چاہئے۔ لہٰذا جس کا ایمان دوسرے درجہ پر ہے ا سے پہلے درجہ والے مومن سے نہیں کہنا چاہئے کہ تمہارے پاس ایمان نہیں ہے اور اسی طرح تیسرے درجہ والا دوسرے درجہ والے کو یہاں تک کہ دسویں درجہ والے تک کو بھی یہی چاہئے کہ ایسا نہ کہے اور جس کا ایمان تم سے کم ہے اسے ایمان سے جدا (بغیر ایمان کے) نہ سمجھو اگر ایسا ہوا تو جس کا ایمان تم سے بڑھ کر ہوگا اسے چاہئے کہ وہ تم کو ایمان سے جدا سمجھے۔ بلکہ اگر کسی کو اپنے سے کم دیکھو تو تمہیں چاہئے کہ ا سے مہر و محبت کے ساتھ اپنے درجہ تک لے آؤ اور جو کچھ اس سے ممکن نہ ہو ا سے اس پر بار نہ کرو کہ اس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور حق کی قسم اگر کوئی کسی مومن کی دل شکنی کرے تو اس پر لازم ہے کہ اس کا جبران کرے اور اس کی دلجوئی کرے۔ [(۳)] شیخ صدوق کتاب خصال میں اس روایت کے تمام ہونے پر تحریر فرماتے ہیں کہ مقداد ایمان کے آٹھویں درجہ پر، ابوذر نویں درجہ پر اور سلمان دسویں درجہ پر فائز تھے۔ البتہ اس بات پر توجہ ہونی چاہئے کہ اس روایت میں ایمان کے دس درجہ کو معین کرنا صرف دس مرتبہ تک منحصر کردینے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف ایمان کے درجات کی کثرت کو بیان کرنا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری روایتوںمیں ایمان کے لئے کمتر یا بیشتر درجات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ [(۴)]

۱۔ نہج البلاغہ، خ ۱۸۹ چاپ انصاریان ص: ۳٦۸۔ ۲۔ سورۂ انفال آیت ۲ ۔ سورۂ توبہ آیت ۱۲٤ ۔ مدثر ۳۱، آل عمران ۱۷۱ تا ۱۷۳ ۔ احزاب ۲۲ کی طرف رجوع کیجئے۔

۳۔ کلینی: کافی، ج: ۲ ص ٤۵، ح ۲؛ صدوق، خصال، ص ٤٤۷، ح ٤۸۔ ۴۔ رجوع کیجئے: صدوق: خصال، ص ۳۵۲، ح ۳۱، کلینی: کافی، ج ۲، ص ٤۲، ح ۱، جن میں ایمان کے لئے سات درجہ بیان کئے گئے ہیں۔ تفسیر عیاشی، ج ۱، ص ۲۰۵، ح ۱۰۵، درجات کو زمین وآسمان کے درمیان کے فاصلہ سے بیان کیا ہے۔

٤ ۔ ایمان کے متعلقات

اسلام کے اخلاقی نظام میں، ایمان کس چیز کے ذریعہ سے ہدایت، اخلاقی فضائل کی آراستگی اور معنوی رفتار کا سبب بنتا ہے ؟ قرآن کریم اور معصومین (ع) کی سیرت میں ایمان کے اصلی ترین متعلقات کے بارے میں جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ایک۔ عالم غیب پر ایمان :

قرآن کریم نے غیب اور غیبی طاقتوں یعنی ملائکہ (وغیرہ) پر ایمان کو کتاب الٰہی سے بہرہ مند ہونے اور ہدایت پانے کی شرطوں میں سے شمار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہورہا ہے:

"یہ وہ کتاب ہے جس کی حقانیت میں کوئی شک نہیں اور یہ ان متقین اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت کا وسیلہ ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ....."[۱]

عالم غیب سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جنہیں ظاہری حواس کے ذریعہ درک نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ عقلی سیر اور باطنی شہود کے ذریعہ ان تک رسائی ہوسکتی ہے، اصولی طور پر ایمان سے مشرف ہونے اور کفر والحاد ومادہ پرستی کی غلاظت و گندگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے غیب اور غیبی حقیقتوں، قوتوں اور امدادوںپر اعتقاد رکھنا ایک شرط ہے۔[۲]

صرف اسی شرط کے تحت حصول کے ذریعہ کتاب ہدایت کو پڑھا جاسکتا ہے اور اس کے نور کے پرتو میں کامیابی کی منزلوں کو طے کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۔

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۷۷ ، ۲۸۵۔

دو۔ خدا اور اس کی وحدانیت پر ایمان:

قرآن کریم متعدد آیتوں میں خدا وند متعال پر ایمان کی ضرورت کو یاد دلاتا ہے۔ مثلاً فرماتا ہے: "بس خدا اور اس کے پیغمبر اور اس نور پر جسے ہم نے نازل کیا ہے ایمان لائو اور تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔،،[۱]

رسول خدا نے ایمان کی علامتوں کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں فرمایا:

" ایمان کی نشانیاں چار ہیں: خدا کی وحدانیت کا اقرار، اس پر ایمان، اس کی کتاب پر ایمان اور خدا کے پیغمبروں پر ایمان۔، ، [۲]

تین۔ قیامت اور اس کی کیفیت پر ایمان:

قیامت اور اس کی کیفیت پر ایمان اخلاق اسلامی کی افادیت اور اس کے اجرا ہونے کی ضمانت ہے۔ قرآن کریم نے خدا اور اس کی وحدانیت پر ایمان کے بعد سب سے زیادہ تاکید قیامت اور اس کی کیفیت پر کی ہے۔ جیسے قبر میں ہونے والے سوالات، عذاب قبر، قیامت کا دن اور قیامت کا حساب و کتاب، اعمال کو پرکھنے کے لئے میزان کا وجود، پل صراط سے عبور اور جنت و جہنم پر اعتقاد و ایمان۔ ذیل میں بعض آیتوں اور روایتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ارشاد ہو رہا ہے:

" جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جو لوگ یہودی ، صابی اور عیسائی ہیں ان میں جو خدا و قیامت پر واقعاً ایمان لائے ہیں اور نیک کام انجام دیتے ہیں ان کے لئے کچھ بھی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ [۳]

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

" ایمان یہ ہے کہ انسان دین حق کو دل سے پہچانے اور زبان سے اقرار کرے اور اپنے اعضاء بدن سے اس کے فرائض کو انجام دے اور عذاب قبر، منکر و نکیر، موت کے بعد زندہ ہونے، حساب و کتاب، صراط اور میزان کو قبول کرے اور اگر خدا کے دشمنوں سے بیزاری نہ ہو تو ایمان موجود نہیں ہے"۔ [٤]

۱۔ سورئہ تغابن، آیت: ۸۔ اسی طرح سورئہ اخلاص آیت: ۱، سورئہ بقرہ، آیات ۱۳٦ ، ۲۸۵۔ سورہ آل عمران، آیت: ۸٤۔ سورئہ مائدہ، آیات ٦۹، ۱۱۱۔ سورئہ نساء آیت: ۱۳٦، ۱٦۲۔ سورئہ انعام، آیت: ۹۲۔ سورئہ شوریٰ، آیت: ۱۵ کی طرف رجوع کیجئے۔

۲۔ ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، ص: ۱۹۔

۳۔ سورئہ مائدہ، آیت: ٦۹ اسی طرح سورئہ بقرہ، آیت: ٤، کی طرف رجوع کیجئے۔

٤۔ صدوق: خصال، ص: ٦۰۹ ، ح۹۔

دوسری حدیث میں پیغمبر خدا کی فرمائش کے مطابق جنت و جہنم پر ایمان بھی معاد کے دو اہم رکن ہیں۔[۱]
اس بنا پر اخلاق اسلامی کی نظر میں معاد اور اس کے اساسی ارکان پر ایمان، رہنمائی کرنے والے دو اہم رکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چار۔ انبیاء (ع) کی رسالت اور آسمانی کتابوں پر ایمان:

دینی تعلیم سے بہرہ مند ہونے اور دین بالخصوص اخلاق اسلامی کی طرف متوجہ ہونے کے لئے انسان کا یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اپنے صحیح کمال اور سعادت کو پہچاننے اور ان تک پہنچنے کے لئے مناسب وسیلوں اور طریقوں کو انتخاب کرنے میں عاجز اور قاصر ہے، ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ قطعی طور پر جسے بھی اس حقیقت میں شک ہے وہ انبیاء کی رسالت اور ان کی دعوت کے مطالب پر ایمان و اطمینان حاصل نہیں کر سکتا اور اسی کے ساتھ اعتماد اور اطمینان کے بغیر کسی کی خیر خواہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا۔
اس وجہ سے اخلاق اسلامی میں رسولوں کی رسالت اور ان کی کتابوں پر ایمان رکھنے کے لئے بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ چونکہ سبھی انبیاء صرف ایک رسالت اور ایک ہی مقصد کے لئے کام کررہے تھے لہٰذا ان تمام انبیاء پر ایمان رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے: "خدا کے پیغمبر اُن کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تمام مومنین بھی خدا اور فرشتے اور کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اس کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں میں سے کسی کے ساتھ فرق نہیں کریں گے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ہم نے پیغام الٰہی کو سنا اور اس کی اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری بخشش کے محتاج ہیں اور ہم کو تیری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے،،۔[۲]

پانچ۔ امامت اور ائمہ (ع) پر ایمان:

شیعوں کے اصول عقائد کے مطابق امامت پر ایمان رکھنا اخلاق اسلامی کی بنیادوں اور کامیابی کی شرطوں میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ حدیثی کتابوں میں بہت سی روایات موجود ہیں۔

۱۔رجوع کیجئے: بیہقی: شعب الایمان، ج: ۱، ص: ۲۵۷، ح: ۲۷۸۔

۲۔ سورۂ بقرہ، آیت: ۲۸۵، ۱۳۶۔ اور اسی طرح سورہ آل عمران، آیت: ۸٤ کی طرف رجوع کیجئے۔

ان روایتوں کے علاوہ یہ بات قرآن کے ذریعہ اور اس کی تفسیر کے سلسلہ میں مسلّم الثّبوت تاریخی واقعات سے ثابت ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہورہا ہے:

الْيَوْمَ كْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمْ الِسْلاَمَ دِينًا[۱]

"آج کفّار تمہارے دین سے نا امید ہوگئے ہیں،لہٰذا ان سے خوف نہ کھاؤ۔ اور مجھ سے خوف کھاؤ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کردیا ہے اور اسلام کو تمہارے لئے دین کی حیثیت سے پسند کرلیا ہے۔"

اس آیت کے سلسلہ میں دو سوال قابل غور ہیں۔پہلا سوال یہ ہے کہ وہ خاص دن کون سا دن ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ واقعہ جو اس دن رونما ہوا اور اکمال دین اور بندوں پر خدا کی نعمت کے تمام ہونے کا سبب بنا، کیا تھا؟ نا قابل انکار تاریخی شواہد اور تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک وہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۰ ہجری کا دن تھا اور وہ واقعہ اس دن غدیر میں پیش آیا وہ پیغمبر کی طرف سے حضرت علی کو اپنی جانشینی کے لئے انتخاب کرنا اور سلسلۂ امامت کا شروع ہونا تھا۔[۲]

ہم انبیاء (ع) کی رسالت اور ان کی کتابوں پر ایمان کی ضرورت کو اصطلاح میں دین کے نام سے یاد کرتے ہیں اور مذکورہ آیت کی روشنی میں امامت کا سلسلہ دین کی تکمیل کے لئے ہے اور اس کے بغیر دین ناقص رہے گا لہٰذا قرآن کریم کی نظر میں امامت پر ایمان بھی ایک لازمی بات ہے اور اخلاق اسلامی کے مستحکم اور مضبوط پایوں میں شمار ہوتا ہے۔

۵۔ایمان کی شرط

قرآن و راویات کے مطابق نیک عمل کا انجام دینا ایمان کی بہترین شرط ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ایمان کو نیک عمل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اکثر آیتوں میں ایمان کے بعد بلا فاصلہ پسندیدہ اور صالح عمل کی گفتگو ہوئی ہے۔اگر چہ نیک عمل ایمان کے بنیادی عناصر میں سے نہیں ہے لیکن نیک عمل کے بغیر ایمان سے مطلوب اور مناسب فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس بنا پر شائستہ اور نیک عمل کو ایمان سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے شرط کے طور پر مانا جا سکتا ہے۔

۱۔سورۂ مائدہ، آیت:۳۔

۲۔مزید معلومات کے لئے علامہ امینی کی کتاب "الغدیر"، کی طرف رجوع کریں۔

قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے:

" اور جو کوئی ایمان لائے اور نیک عمل کو انجام دے اس کے لئے بہترین جزا ہے اور ہم بھی اس سے اپنے امور میں آسانی کے بارے میں کہیں گے" (۱) قرآن مجید نے نیک عمل کے بغیر، مومن ہونے کے دعوے کو جھوٹا قرار دیا ہے:

"اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے بعض لوگ منھ پھیر لیتے ہیں اور وہ لوگ واقعاً مومن نہیں ہیں۔، (۲) حضرت علیؑ نے بھی اس مطلب کو یوں بیان فرمایا ہے:

" جو خدا کے احکام پر عمل کرتا ہے فقط وہی مومن ہے۔، (۳) اس بنا پر اخلاق اسلامی کی نظر میں خدا کے احکام کی پابندی کے بغیر ایمان کا دعویٰ کرنا جھوٹ اور فریب ہے مگر یہ کہ مومن شخص عمل کرنے کی قدرت اور موقع نہ رکھتا ہو۔

٦۔ ایمان کے اسباب

دینی کتابوں میں ایمان کے وجود میں آنے، اور اس کے ثبات و کمال کے لئے مختلف عوامل بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض معرفت و شناخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے علم، عقل اور دین میں غور و فکر کرنا۔ یہ سب ایمان کے نظری مقدمات کو فراہم کرتے ہیں اور وہ عوامل علم کلام میں پائے جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے عوامل ایسے ہیں جو ایک اعتبار سے نفسیانی صفت اور ملکہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے تقویٰ، راہ خدا میں دوستی اور دشمنی، صبر، توکل، رضا وغیرہ اور کچھ ایسے ہیں جو انسان کے عمل سے مربوط ہیں۔ جیسے انفاق، نماز کے لئے اہتمام کرنا، دوسروں کے ساتھ احسان کرنا، گناہوں سے پرہیز کرنا وغیرہ۔

خاص نظری معارف جیسے دین میں غور وفکر، انسان کی مختلف نفسیانی صفتیں اور اعمال، ایمان کی آفرینش اور اس کے ثبات و کمال میں مؤثر ہوسکتے ہیں اور یہ بات اس حقیقت سے نہیں ٹکراتی ہے کہ ایمان اپنے لحاظ سے عمل صالح کی انجام دہی کے لئے مقدمہ فراہم کرتا ہے اور بہت سے نفسانی ملکات اور صفات کے وجود میں لانے کا موجب قرار پاتا ہے اور یہاں تک کہ انسان میں بعض نظری معارف کی پیدائش کے لئے باعث بنتا ہے۔ کیونکہ انسانی وجود کے تینوں شعبوں کے درمیان آپس میں تثیر اور تثر پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر ایمان ایک واضح نفسانی حالت کی حیثیت سے دوسرے شعبوں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور ان سے تثیر بھی قبول کرتا ہے۔

۱۔ سورۂ کہف، آیت: ۸۸۔ اسی طرح سورۂ طہٰ، آیت: ۸۲۔ سورۂ فرقان، آیت: ۷۰۔ سورۂ قصص، آیت: ٦۷۔ سورۂ انفال، آیت: ۳، ٤۔ سورۂ نسائ، آیت: ٦۵۔ سورۂ نور، آیت: ٤۷ کی طرف رجوع کریں۔ ۲۔ سورۂ نور، آیت: ٤۷۔ ۳۔ کلینی، کافی، ج: ۲، ص: ۳۸، ح: ٤۔

۷۔ ایمان کے فوائد

یہ آثار اور فوائد ایمان کے اسباب اور موجبات کی طرح علمی ماہیت بھی رکھتے ہیں۔ اور نفسانی حالات بھی اور بعض اعمال و عادات سے بھی متعلق ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

ایک۔ روحی تسکین:

انسان کے لئے اہم لذتوں میں سے ایک نفسانی تسکین اور اس کا آرام پانا ہے۔ بنی آدم کے لئے پریشانی اور اضطراب، سب سے بڑی تکلیف اور بہت سی گمراہیوں اور ناکامیوں کا سبب ہے۔ انسانی کوششیں اس جانکاہ درد سے نجات پانے کے لئے اس بارے میں تلخ تجربہ کی نشاندہی کررہی ہیں۔ خداوند متعال کی نظر میں انسان کو ایمان کے سایہ میں آرام و سکون میسّر ہوگا۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:

"وہی ہے جس نے مومنین کے قلوب کو سکون دیا تاکہ وہ اپنے ایمان میں مزید (ایمان کا) اضافہ کریں، ،۔ [۱]

"باخبر رہو کہ خدا کے دوستوں کے لئے نہ کچھ خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور پرہیز گاری سے کام لیتے ہیں۔ [۲]

خدا نے اس سے زیادہ واضح انداز میں قلبی سکون واطمینان کو اپنے ذکر اور یاد کے ذریعہ قابل تحصیل بتایا ہے اور اس سلسلہ میں وہ فرماتا ہے: " وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور ان کے قلوب یاد خدا سے سکون حاصل کرتے ہیں آگاہ رہو کہ یاد خدا سے ہی دلوں کو آرام ملتا ہے۔ ، [۳]

۱۔ سورۂ فتح، آیت: ٤۔

۲۔ سورۂ یونس، آیت: ٦٢، ٦٣۔ اور اسی طرح سورۂ مائدہ، آیت: ٦٩ کی طرف رجوع کیجئے۔

۳۔ سورۂ رعد، آیت: ۲۸۔

دو۔ بصیرت:

قرآن کی نظر یں‌ایمان، حق وباطل کے درمیان تمیز دینے کے لئے انسان کو بصیرت اور سمجھداری عطا کرتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہورہا ہے: " اے ایمان لانے والو! اگر خوف خدا رکھو گے تو خدا تم کو (حق وباطل کے درمیان) فرق کرنے کی قدرت وقوت عطا کرے گا۔،،[1] دوسری طرف ایمان نہ رکھنے والوں کو نابینا قرار دیتا ہے:

" جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کے کرداروں اور کارناموں کو ان کی نظر میں خوبصورت اور آراستہ بنا دیا ہے تا کہ وہ اسی طرح گمراہ وسرگرداں رہیں۔،،[2] ان دو آیتوں کا مقایسہ کرنے سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ایمان اور تقویٰ ایک طرف خود خواہی اور خود پسندی کو ختم کرنے کا سبب ہے تو دوسری طرف خدائی نور اور الٰہی ہدایت سے متصل ہونے کی وجہ سے بصیرت اور سمجھداری عطا کرتے ہیں۔[3]

تین۔ خدا پر بھروسہ:

خدا پر اعتماد اور بھروسہ کرنا کامیاب اور مفید زندگی کے ارکان میں سے ایک نادر اور قیمتی سرمایہ ہے۔ اس حالت کے ذریعہ انسان کی بہت سی الجھنیں اپنا بستر لپیٹ لیتی ہیں۔ اور حوادث کے ہولناک طوفان پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

حضرت علی فرماتے ہیں: "بندہ کا ایمان اس وقت تک سچّا نہیں ہوسکتا جب تک کہ خدائی خزانہ پر خود اپنے ہاتھ کی دولت سے زیادہ اعتماد نہیں رکھتا ہے۔،،[4]

چار۔ دنیوی برکتیں:

قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے: " اور اگر شہروں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم قطعی طور پر ان کے لئے آسمان وزمین سے برکتیں نازل کرتے۔،،[5]

یعنی ایمان نہ صرف اخروی مثبت آثار و فوائد کا حامل ہے بلکہ دنیاوی نعمتیں‌اور برکتیں بھی فراہم کرتا ہے۔ اگر کوئی صحیح طریقہ سے دنیاوی نعمتوں کی تلاش میں ہے تو اسے چاہئے کہ ایمان کی جستجو کرے۔

۱۔ سورۂ انفال، آیت: ۲۹۔ ۲۔ سورۂ نمل، آیت: ٤۔ ۳۔ علامہ طبا طبائی: المیزان، ج: ۱۵، ص: ۳٤۔ ناصر مکارم شیرازی: تفسیر نمونہ، ج: ۷، ص: ٤۰ کی طرف رجوع کریں۔

٤۔ نہج البلاغہ، حکمت: ۳۱۰۔ ۵۔ وَ لَو اَنَّ اَهلَ القریٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحنا عَلَیهِم بَرَکات مِنَ السَّماءِ وَ الأرضِ (سورۂ اعراف، آیت: ۹٦)۔

پانچ۔ نیک اعمال کی انجام دہی:

اس بات کے علاوہ کہ عمل صالح کی انجام دہی ایمان کی بنیادی شرط ہے، خود ایمان کے فوائد میں سے بھی ہے۔ کیونکہ ایمان، عمل کے لئے ظرف اور نیک عمل باطنی ایمان کا پھل اور نتیجہ ہے۔ علامہ طبا طبائی فرماتے ہیں:

ایمان عمل کے لئے مقدمہ فراہم کرتا ہے اور اس کے لئے لازمی شرط ہے اور عمل صالح کی سہولت یا دشواری انسان کے ایمان کے قوی یا ضعیف ہونے پر منحصر ہے اور اسی کے مقابلہ میں عمل صالح اور اس کی تکرار، ایمان کے عمیق اور زیادہ ہونے میں مفید اور مددگار ثابت ہوتی ہے اور یہ دونوں اپنے اپنے لحاظ سے ان اخلاقی ملکات کے وجود میں آنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں جو بے شک انسان سے صادر ہونے والے اعمال صالحہ کے انجام پانے کا سبب ہیں۔ [۱]

چھ۔ عوام میں محبوبیت:

ایمان کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ ایماندار انسان لوگوں کے دلوں میں محبوب ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان قلبی لحاظ سے محبوب ہونا سبھی پسند کرتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ لوگ انھیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھیں اور لوگ اپنے لئے محبت کے آثار کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے لئے دوسروں کے اظہار محبت کی لذّت کو اتنا زیادہ شیرین پاتے ہیں کہ کسی چیز کے مقابلہ میں اس کا سودا کرنے پر تیّار نہیں ہوتے۔ بیشک محبت ایک ایسی دنیاوی نعمت ہے کہ یہ ہر مشکل کو آسان اور ہر تلخی کو شیرین اور ہر کانٹے کو پھول میں تبدیل کر دیتی ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اگر خالص محبت کی تلاش میں ہو تو مومنین کی وادی میں داخل ہوجاؤ۔

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام انجام دیتے ہیں، جلد ہی (وہ) خدا (جو رحمن ہے) ان کے لئے لوگوں کے دلوں میں محبت قرار دے دے گا۔ [۲]

سات۔ اُخروی فلاح اور کامیابی:

ایمان کے فوائد کی انتہا مومنین کی اُخروی کامیابی پر ہوتی ہے اس سے بہتر انجام اور کیا ہوسکتا ہے؟

۱۔ علامہ طبا طبائی، فرازہائی از اسلام، ص۲۳۸۔

۲۔ سورئہ مریم، آیت: ۹۶۔

خدا وند متعال مومنین سے ایک معنی دار سوال کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اے ایمان لانے والو !کیا تمہیں ایک ایسی تجارت کی راہ دکھاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے گی ؟ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤاور خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو۔اس فداکاری کو اگر تم جان لو گے اور سمجھ لو گے تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔،،(۱)

حکیم لقمان اپنے فرزند کی خیر خواہانہ نصیحت میں فرماتے ہیں:

"اے میرے بیٹے !سچ ہے کہ یہ دنیا گہرے سمندر کی طرح ہے جس میں بہت سے علماء اور دانشور ہلاک ہوگئے ہیں۔ بس اس میں اپنی نجات کی کشتی، خدا پر ایمان ہونے کو قرار دو۔ "(۲)

۸۔ ایمان کے موانع

ایمان کے وجود میں آنے کے اسباب اور عوامل کے سلسلہ مینّجو کچھ بیان کیا گیا اس کے پیش نظر ایمان پر تاثیر ڈالنے والے عوامل بہت ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ہونا ایمان کے لئے رکاوٹ کاباعث ہوگا۔لیکن یہاں پر ایمان کے موانع سے مراد تنہا وہ عوامل ہیں جو ایمان کے بادیانہ جوہر سے ٹکراتے ہیں اور مشہور اسلامی کتابوں میں عقلی قوت سے مربوط صفتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔اس طرح کی مشہور موانع مندرجہ ذیل ہیں:

ایک۔ جہل:

جہل چاہے بسیط ہو یا مرکب، ایمان کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ جہل بسیط سے مراد یہ ہے کہ انسان علم نہ رکھتا ہواور اسے اپنے عالم نہ ہونے اور نہ جاننے کا یقین بھی ہو۔اس طرح کی جہالت شروع میں مذموم اور قابل مذمت نہیں ہے۔کیونکہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے مقدمہ ہے اور جب تک انسان خود کو جاہل نہ جانے اس وقت تک علم حاصل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔لیکن اس جہالت پر باقی رہنا اخلاقی لحاظ سے برا اور قابل مذمت ہے۔ (۳)

۱۔ سورئہ صف، آیت:۱۰ ، ۱۱۔ ۲۔ شیخ صدوق:فقیہ، ج:۲، ص:۲۸۲، ح:۲۴۵۷۔

۳۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج:۱، ص:۱۰۰۔

لیکن جہل مرکب سے مراد یہ ہے کہ انسان عالم نہیں ہے اور اس کے ذہن میں واقعیت اور حقیقت سے متعلق کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا خیال یہ ہے کہ وہ واقاً حقیقت تک پہنچ گیا ہے۔ جبکہ سچ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا ہے۔ (یعنی وہ اپنے جاہل ہونے سے بھی بے خبر ہے)۔ اس طرح وہ دو امر میں جاہل ہے۔ اسی وجہ سے اسے جہل مرکب کہا گیا ہے۔ اس طرح کی جہالت کو اخلاقی لحاظ سے سب سے بڑی برائیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں انسان اصلاً اپنی بیماری کے بارے میں نہیں جانتا بلکہ وہ خود کو صحیح وسالم تصور کرتا ہے۔ حالانکہ اصلاح کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم فساد اور خرابی کا یقین ہونا ہے۔[۱]

اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے: "بے شک میں پیدائشی اندھے انسان اور سفید داغ کا علاج کرنے سے عاجز نہیں ہوں لیکن احمق انسان کا علاج کرنے سے عاجز ہوں"۔[۲]

دو۔ شک وتردید:

ابتدائی شک، علم ویقین تک پہنچنے کے لئے ایک مبارک قدم ہو سکتا ہے۔ انسان جب تک کسی چیز کو پوری طرح جانتا ہے اور وہ کسی بھی گوشہ کو پنہان اور پوشیدہ نہیں سمجھتا اس کی کوئی خاص جستجو نہیں کرتا ہے۔ بہت سی گرانقدر حقیقتیں صرف ایک ابتدائی شک وتردید کی وجہ سے منظر عام پر آئی ہیں۔ اس بنا پر شک، علم ویقین اور ایمان تک پہنچنے کے لئے ایک با اہمیت اور بے مثال پل کی حیثیت رکھتا ہے اس طرح یہ اخلاقی لحاظ سے برا نہیں ہے۔ لیکن شک وتردید، کسی بھی حالت میں منزل نہیں ہے۔ شک 'مقصد اور منزل کے عنوان سے قطعی طور پر ایک اخلاقی برائی ہے اوریقین وایمان کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق اور باطل کی پہچان کرنے اور حق وباطل کو جدا کرنے کے لئے کمزور انسان کا نفس حیران وسرگرداں ہو جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر حضرت علی نے سختی کے ساتھ شک وتردید سے منع فرمایا ہے اور اسے ایمان کے خلاف اور کفر کا سبب قرار دیا ہے۔ مولائے متقیان حضرت علی ارشاد فرماتے ہیں:

"لا ترتابوا فتشکّوا 'ولا تشکّوا فتکفّروا"[۳]

(یعنی شک وتردید کو اپنے پاس جگہ نہ دو کہ شک میں پڑ جاؤ گے اور شک نہ کرو کہ کافر ہوجاؤ گے۔)

۱۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص: ۱۱۶۔

۲۔ مفید: اختصاص'ص: ۲۲۱۔

۳۔ کلینی: کافی'ج: ۱'ص: ۴۸'ح: ۶۔

تین۔ نفسانی خیالات اور شیطانی وسوسہ:

خیالات سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے قلب پر عارض ہوتی ہے اور اگر وہ انسان کو شر کی طرف دعوت دے تو وسوسہ ہے اور اگر وہ خیر کی طرف ہدایت کرے تو اسے الہام کہا جاتا ہے۔ شیطانی وسوسہ جو ایمان کی رکاوٹوں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی مختلف قسمیں اور متعدد اسباب ہیں اور ہر ایک سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس سے متعلق گفتگو اخلاق علمی یا تربیت اخلاقی کے ذیل میں ہونی چاہیئے۔[۱]

قرآن کریم، شیطانی وسوسہ کے بارے میں خود شیطان کی زبانی ارشاد فرما رہا ہے:

"میں تیرے بندوں کو سیدھے راستے سے گمراہ کروں گا اس وقت ان کے سامنے سے پیچھے سے' داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے پہنچ جائوں گا"[۲]

چار۔ علمی وسواس:

یہ دقت' جستجو، تحقیق اور عقلانیت میں افراط کی ایک قسم ہے جو ایمان کے لئے آفت اور اسے برباد کردینے کا سبب ہے۔ یہ بات کبھی عقلی دقت کے عنوان سے اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ سب سے ابتدائی بدیہیات وواضحات میں بھی خدشہ وارد ہوجائے یہاں تک کہ انسان کو سفسطہ اور واقعیات وحقائق سے انکار کے گڑھے میں بھی گرا دیتا ہے۔ واضح ہے کہ اس طرح کا وسوسہ ہلاکت اور نابودی کو ہمراہ لاتا ہے اور ہر طرح کے ایما ن اور اطمینان سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔[۳]

پانچ۔ کفر اور شرک:

یہ دونوں ایمان وتوحید کے مقابلہ میںہیں اور ایمان میں رکاوٹ کا باعث شمار کئے جاتے ہیں۔ کفر اور شرک کی ماہیت اور ان کے دوسرے ابعاد و جوانب کے متعلق بہت زیادہ بحثیں پائی جاتی ہیں جن میں سے بعض کو عقائد وکلام کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، ان سبھی کے بارے میں گفتگو کرنا اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔

۱۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص: ۱۴۲، ۱۵۸۔

۲۔ سورئہ 'اعراف' آیت: ۱۷، ۱۶۔

۳۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات، ج: ۱، ص ۱۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

دوسری فصل: مؤثر نفسانی صفات

گزشتہ بحث میں ان نفسانی صفات کے بارے میں جو انسان کی ہدایت کی ذمہ دار ہیں،نیزاخلاق اسلامی کے معروف مآخذمیں قوۂ عاقلہ سے متعلق قوت کے عنوان سے ان کا تذکرہ ہوا ہے، ہم نے اختصار سے گفتگو کی ہے۔ اس حصہ نیزبعد کے دو حصوں کی گفتگو میں صفات نفسانی کے دوسرے گروہ کے بارے میں جو انسانی نفس میں مؤثر قوت کے عنوان سے اپنا کردار ادا کرتی ہیں ہم ان کے بارے میں گفتگو کرینگے۔ اس طرح کے نفسانی صفات اخلاق اسلامی کے معتبر مآخذ اور مشہور کتابوں میں قوت غضبیہ اور قوت شہویہ سے متعلق صفات کے عنوان سے ذکر ہوتے ہیں۔یہاں سب سے پہلے اس نکتہ کی تاکید کی جاتی ہے کہ نفسانی صفات ان موارد میں جن کو ہم شمار کریں گے منحصر نہیں ہیں۔مؤثر نفسانی صفات کی طبقہ بندی: مؤثر نفسانی صفات کی بھی مختلف گروہوں میں طبقہ بندی کی جاسکتی ہے، ایک تقسیم بندی میں ان میں سے ہر ایک کے رجحان پر نظر کرتے ہوئے ان کو درج ذیل گروہوں میں جگہ دی جاسکتی ہے:

۱۔وہ صفات جو خدا وندعالم اور مبدأہستی کی نسبت انسان کے باطنی رجحان پر ناظرہیں جیسے توکل، تسلیم، اور رضا و....۔

۲۔وہ صفات جو معاد اور انسانی زندگی کے انجام کی نسبت اس کے باطنی رجحان کی طرف ناظرہیں جیسے خوف، امید و رجائ، مایوسی اور نا امیدی.......۔

۳۔ وہ صفات اور ملکات جو ہمارے رجحان کا تعلق خود ہماری ہی نسبت بتاتے ہیں؛جیسے عجب، خود پسندی، افتخار، عزت نفس، عصبیت، تعصب وغیرہ۔

٤۔ وہ صفات جو کل اور آئندہ کی نسبت ہمارے رجحان کو بتاتے ہیں؛ جیسے امیدیں، جلد بازی، ہمت، تسویف (ٹال مٹول) وغیرہ.....۔

۵۔ وہ صفات جو دنیوی مواہب پر ناظر ہوتے ہیں؛ جیسے زہد، حرص، حسرت اور قناعت وغیرہ.....۔

٦۔ وہ صفات جو دوسروں کی نسبت انسان کا رجحان کو بتاتے ہیں ؛ جیسے خیر خواہی، حسد کرنا، کینہ، انصاف وغیرہ..... ۔

۷۔وہ صفات جو نفس کی طبیعی اور متعادل آرایش کو بیان کرنے والے اور اس کے تحفّظ میں کردارادا کرتے ہیں جیسے سکون، وقار، عفت، حیا وغیرہ وغیرہ۔

اخلاق اسلامی میںان گروہوں میں سے ہر ایک کی حیثیت سے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے مبدأ و معاد سے متعلق رجحان کا سرچشمہ اس کا ایمان ہے اور تمام نفسانی رجحانات خود اس کی نسبت، دوسروں کی نسبت، طبیعی مواہب کی نسبت، آئندہ کی نسبت اور نفس کی مطلوب حالت کی نسبت، عالم کے آغاز و انجام کی نسبت نفس کے رجحان کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

الف۔ خدا کی طرف نفس کا مائل ہونا

بعض وہ نفسانی صفات جو خداوند متعال سے متعلق انسان کے باطنی رجحان اور مطلوب رابطہ کا کام کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ خداوندعالم کی محبت

بغیر کسی شک و تردید انسان کی قوت جاذبہ (جذب کرنے والی قوت) اور دافعہ (دفع کرنے والی قوت) محبتوں اور نفرتوں کے زیر اثر وجود میں آتے ہیں۔ جب انسان محبت و عشق کرتا ہے، تو لذت اور نیک بختی کا احساس کرتا ہے اور جب کراہت و نفرت کے عالم میں ہوتا ہے تو پریشانی، رنج و الم، درد و غم، کا احساس کرتا ہے۔ شاید اسی بنا پر اخلاق کے بعض بڑے حکماء اور فلاسفر نے انسان کی غایت اور اخلاق کا مقصد سعادت و خوش بختی یعنی لذت بخش حیات اور رنج والم سے دور زندگی کو جانا ہے۔ اس ہدف کی تکمیل صرف اور صرف محبت آمیز زندگی کے سایہ میں بالخصوص اس کے عالی مرحلہ یعنی عاشقانہ زندگی میں میسر اور ممکن تصور کرتے ہیں، ان تمام فضیلتوں کا راز " محبت "اور" عشق"کے الفاظ کے لئے اسی حقیقت میں تلاش کرنا چاہیے لیکن جو چیز اصل عشق و محبت سے بھی زیادہ اہم ہے محبوب اور معشوق کی شان و منزلت ہے۔ انسان کی سعادت کا معیار اس کے درجہ محبت سے وابستہ ہے اور محبت و عشق کے درجہ کو محبوب کے کمال و جمال کے اندازوں میں تلاش کرنا چاہیے نیز اس کے دوام وبقا کو بھی جمالِ محبوب کا ظہور اور غروب معین کرتا ہے۔اب اصلی سوال یہ ہے کہ سر و جان کا سودا کس حقیقت جمال و جلال کے عشق میں کرنا چاہیے تاکہ ابدی محبت اور بلند وبالا عشق مثمر ثمر ہو اور پایدار لذت اور دائمی نیک بختی حاصل ہو ؟

خدا پر اعتماد رکھنے والوں کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس سوال کا جواب خود اپنے خدا سے طلب کریں۔ اخلاق اسلامی کے نقطۂ نظر سے وہ وجود جو ایسی محبت کا حقدار ہے خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس کی محبت تخلیق عالم کی توجیہ کرنے والی اور عالم و بنی آدم کے اہداف و مقاصد کو پورا کرنے والی نیز ان کی آرزوؤں کی تکمیل کرنے والی ہے، اسی وجہ سے خداوندعالم فرماتا ہے:"والذین آمنوا اشدّ حبا اللہ"! [۱] "جو لوگ ایمان لاچکے ہیں وہ خدا سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں" اور یہ اعلان کرتا ہے " یحبھم و یحبونہ" [۲] "خدا انہیں دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ (بھی) خدا کو دوست رکھتے ہیں"۔

۱۔ سورۂ بقرہ ۱٦٥۔

۲۔ سورۂ مائدہ آیت ٥٤۔

دوسری طرف، خداکی محبت ایک ایسی جزا ہے کہ خداوند عالم قرآن میں اپنے خاص بندوں کو جس کی بشارت دیتا ہے، جیسے مجاہدین جو اس کے لئے اپنے سر اورجان کو فدا کردیتے ہیں:

"ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص"[۱]۔

"بے شک اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف باندھ کر جہاد کرتے ہیں جس طرح سیسہ پلائی ہوئی دیواریں"۔ اور جس طرح محسنین، توابین، مطھرین، مقسطین، صابرین اور متوکلین (احسان کرنے والے، توبہ کرنے والے، پاکیزہ افراد، عدل وانصاف کے خوگر، خدا پر توکل و بھروسہ کرنے والے) قرآن کریم میں خدا کے محبوب قرار دیئے گئے ہیں یہاں پر ہماری گفتگو کا موضوع انسان کا خداوند سبحان سے محبت کرنا ہے، لیکن چونکہ درحقیقت بندوں کی اپنے پروردگار سے محبت اور خدا کی ان سے، محبت کے درمیان ایک قسم کا ملازمہ پایاجاتا ہے لہٰذا ناگزیر دونوں ہی نظر سے موضوع کو دیکھنا چاہیئے۔

پہلی نظر: بندوں کی خدا سے محبت

الف۔ صرف خدا حقیقی محبوب ہے: درحقیقت صرف خدا ہے جو حقیقی محبت اور واقعی عشق کرنے کا سزاوار ہے دیگر اشیاء اور اشخاص اپنے اس رابطہ کے اعتبار سے جو اس سے رکھتے ہیںمحبوب واقع ہوتے ہیں۔

الف: محبت کی پیدائش کے اسباب:

علماء اخلاق کا نظریہ ہے کہ محبت اور اس کے شدید مراتب یعنی عشق درج ذیل اسباب ووجوہ کی بنا پر وجودمیںآتے ہیں:

۱۔ جو چیزیں انسان کی بقاء اور کمال کا سبب ہوتی ہیں:

اسی بنیادپر، انسان اپنے وجود کو عزیز اور دوست رکھتا ہے اور اس کی بقاء اور دوام کا خواہاں ہوتا ہے اور جو چیز بھی اسے اس بات میںمعاون و مددگار ثابت ہوتی ہے وہ اس سے محبت بھی کرتا ہے، اور وہ موت کے اسباب سے کراہت رکھتا ہے۔(۲)

۲۔ لذت:

لذت مادی ہو یا معنوی محبت کا سبب ہوتی ہے یعنی انسان جو کچھ لذت کا سبب ہوتا ہے اس کے لذت آور ہونے کی وجہ سے اسے دوست رکھتا ہے نہ کہ خود اس لذت مادی کی وجہ سے؛ جیسے انسان کی لذت کھانے پینے کی اشیاء سے متعلق نیز وہ تمام چیزیں جو اس کے تمام غرائز وخواہشات پورا کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ اس طرح کی محبت آسانی کے ساتھ ہاتھ آجاتی ہے لیکن تیزی سے ختم بھی ہوجاتی ہے۔

۱۔ سورۂ صف آیت ٤۔ ۲۔ فیض کاشانی، محسن؛ المحجۃ البیضاء، ج۸، ص۹ تا ۱۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۳٤، ۱۳۵۔

اس طرح کی محبتیں پست مادی اور سریع الزوال ہونے کی وجہ سے محبت کا سب سے ادنی درجہ شمار ہوتی ہیں [1] اور معنوی لذت ؛ جیسے انسان کا ایک فدا کار مجاہد سے محبت کرنا، اس لذت کی بناء پر جو اس کی دلاوری اور اس کے مظاہرہ جنگ سے محسوس کرتا ہے اور ایک فنکار اور ورزش کرنے والے انسان سے محبت اس لذّت کی وجہ سے جو ہنر نمائی کے میدان میں محسوس کرتا ہے اور امانت و پاکدامنی سے محبت اس لذّت کی وجہ سے جو انسان امانت داری اور پاکیزگی سے محسوس کرتا ہے نیز خداوندعالم کی یاد اوراس سے راز و نیاز اس بناپر کہ وہ اس بات سے سرشار لذت محسوس کرتا ہے، اس طرح کی لذتوں کی ان لوگوں کے لئے محبت آفرینی جو اس کے ایک گھونٹ سے سیراب ہوئے ہیں ایک واضح اور استدلال و برہان سے بے نیاز امر ہے، اس طرح کی لذتیں دراز عمر ہوتی ہیں، اگرچہ اس اعتبار سے خود مختلف درجات اور مراتب کی حامل ہیں، لیکن باقی اور دائم محبت کے خواہاں افراد اس کے پانے کی تمنا میں مادی لذتوں اور فانی محبتوں کا یکسر سودا کرتے ہیں۔

۳۔ احسان:

انسان احسان اور نیکی کا اسیر اور بندہ ہے اور فطری طور سے جو بھی اس کے ساتھ احسان کرتا ہے وہ اسے دوست رکھتا ہے اور جو انسان اس کے ساتھ برائی کرتا ہے وہ اس سے رنجیدہ خاطر اور بیزار ہوتا ہے اس بناء پر نیکی، منفعت اور احسان انسان سے

محبت کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ [۲]

٤۔ ظاہری و باطنی حسن و جمال:

خوبصورتی اور حسن و جمال کا ادراک محبت کا باعث ہوتا ہے؛ یعنی انسان خواہ مادی خوبصورتی ہو یا معنوی اسے دوست رکھتا ہے اور اس کی یہ محبت خوبصورتی اور حسن کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، نہ یہ کہ اس کے علائم اور لوازم سے اور وہ فطری اور باطنی سرچشمہ رکھتی ہے۔

٥۔ باطنی اور روحی توافق و مناسب:

کبھی انسان دوسروں سے محبت کرتا ہے، لیکن نہ اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور نہ ہی اس کے مال و مرتبہ سے امید اور لالچ رکھنے کے سبب بلکہ صرف اور صرف اس باطنی اور روحی تناسب اور توافق کے لحاظ سے جو اس کی روح و جان کے ساتھ رکھتا ہے۔

٦۔ الفت و اجتماع:

افراد کا اجتماع اور آپس میں معاشرت رکھنا اور ایک ساتھ زندگی گذارنا آپسی میل جول، اتحاد و الفت اور انس و محبت کا باعث بنتا ہے۔ انس و محبت کا سرچشمہ انسان کی طبیعت اور سرشت میں ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لفظ "انسان" اُنس سے ماخوذ ہے نہ کلمۂ "نسیان" سے۔ [۳]

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۳٦۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۱۳٦۔

۳۔ راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص۹٤ ملاحظہ ہو۔

۷۔ ظاہری اوصاف میں شباہت:

ایک یا چند ظاہری خصوصیات میں اشتراک محبت کے پیدا ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ بچوں کا ایک دوسروں سے لگاؤ اور بوڑھوں کا آپس میں تعلق نیز ہم پیشہ اور ہم صنعت افراد کا ایک دوسرے سے محبت رکھنا اسی وجہ سے ہے۔

۸۔ علیت کا رابطہ:

چونکہ معلول کا سرچشمہ علت ہے اور اس سے تناسب اور سنخیت اور جنسیت رکھتا ہے، لہٰذا علت محبوب واقع ہوتی ہے کیونکہ علت کے بعض اجزاء اور اس کے بعض ٹکڑوں کے مانند ہے، معلول بھی علت کو اس لئے دوست رکھتا ہے کہ در حقیقت علت اس کی اصل و اساس ہے، اس بنا پر ان میں سبھی ایک دوسرے سے محبت کرنے میں درواقع اپنے آپ سے عشق کرتے ہیں (۱)

اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ محبت ایجاد کرنے کے تمام اسباب و علل مذکورہ موارد میں خلاصہ ہوسکتے ہیں یا نہیں، اور مذکورہ اسباب میں سے ہر ایک کے استقلال یا تداخل سے چشم پوشی کرتے ہوئے حقیقی طور پر محبت آفرین تمام اسباب و علل صرف خداوند سبحان میں پائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ میں ان کا تصور کرنا ایک وہم اور خیال سے زیادہ نہیں ہے، اس حقیقت کے بیان میںکہاجاسکتاہے: ہر انسان کاوجود خداوند سبحان کے وجودکی فرع و شاخ ہے اور خداوندعالم کے وجود سے جدا کوئی ہستی اور وجود نہیں رکھتا، اور اس کے وجود کا کمال اس کے ذریعہ اور اس کی طرف سے ہے نیز لذت و احسان کا سرچشمہ خداوندعالم ہی کی ذات ہے، احسان کا خالق وہ ہے اور ہر احسان اس کے قدرت اور فعل کی خوبیوں میں سے ایک خوبی و حسن کا بیان کرنے والا ہے۔ بے شک کمال وجمال بالذات کا مالک صرف اور صرف وہ ہے اور یہ صرف اسی میں پایا جاتاہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل بصیرت کے لئے معنوی جمال زیادہ دوست رکھنے کے لائق اور خوبصورت ترین شئی ہے۔ اسی طرح انسان کی روح وجان اپنے پروردگار سے ایک مخفی اور باطنی راز و رمز کے ساتھ رابطہ رکھتی ہے، اور شاید آیۂ "قل الروح من امر ربی" (۲) ("کہو، روح ہمارے ربّ کے امر سے ہے") اسی باطنی رابطہ کی طرف اشارہ ہو۔ خدا اور انسان کے درمیان رابطۂ علیت کا وجود آشکار اور توضیح سے بے نیاز ہے۔ لیکن دو دیگر اسباب یعنی "مادی اجتماع" اور "ظاہری اوصاف میں اشتراک "پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں اسباب محبت آفرینی میں معمولی کردار ادا کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کا خداوند سبحان کی طرف نسبت دینا نقص کا باعث ہے، اور درحقیقت محال ہے لہٰذا حقیقی طور پر اور عالی ترین درجات میں محبت کے تمام اسباب خداوند عالم میںپائے جاتے ہیں اور چونکہ اس کے اوصاف میں کوئی شریک نہیں ہے لہٰذا کسی قسم کا شریک اس کی محبت میںبھی وجود نہیں رکھتا۔ (۳)

۱۔ نراقی، محمد مہدی: جامع السعادات،، ج۳، ص۱۳۹۔ ۲۔ سورئہ اسرائ، آیت ۸۵۔ ۳۔ فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج۸ ص ۱۶، ؛نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ص ۱۴۲، اور ۱۴۶ ملاحظہ ہو۔

ب۔ خداوند عالم سے محبت کی نشانیاں:

بلند و بالا، مقدس و پاکیزہ فضائل ہمیشہ جھوٹے دعویداروں سے روبرو رہے ہیں، یہ غیر واقعی خیالات اور دعوے کبھی کبھی اس طرح پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ حقیقت امر خود اشخاص پر بھی پوشیدہ ہوگئی، بہت سے طفل صفت ایسے ہیں جنہوں نے ابھی محبت خداوندی کا الفباء بھی نہیں سیکھا ہے، لیکن خود کو اللہ کے دوستوںمیں شمار کرتے اور اس سے عشق و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

خدا وند عالم کے دوستوں کی ظاہری اور ملموس نشانیوں کا بیان خود شناسی اور دیگر شناسی کے لئے ایک مناسب راستہ اور خدا کی محبت ودوستی کے جھوٹے اور سچے دعوؤں کا ایک معیار ہے۔ ان علامتوں میںاہم ترین علامتیں اخلاق اسلامی کی اوّلین کتابوں کی روایت کے اعتبار سے درج ذیل ہیں:

۱۔ موت کو دوست رکھنا:

سچا چاہنے والا اور حقیقی دوست اپنے محبوب کے دیدار کا مشتاق ہوتا ہے۔ اگر چہ موت خداوندعالم سے ملاقات کرنے اور اس کے جمال کے دیدار کی تنہا راہ نہیں ہے، لیکن عام طور پر اس ہدف کا تحقق اس راہ مرگ سے گذرے بغیر ممکن و میسر نہیں ہے۔ اگر کوئی انسان کسی مقصد سے عشق کرے، تو جو کچھ اس راہ میں راہنما واقع ہوگا وہ اس کا محبوب بنتا چلاجائے گا، قرآن کریم اس سلسلہ میںفرماتا ہے: " کہو: اے وہ لوگوں جویہودی ہوگئے ہو اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم لوگ خدا کے دوست ہو اور دوسرے لوگ دوست نہیں ہیںتو اگر اپنے قول میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو "۔(۱) البتہ جیسا کہ خدا وند سبحان کی محبت کے درجات ومراتب ہیں، موت کا چاہنا یا نہ چاہنا بھی افراد کی نظر میں درجات و مراتب رکھتا ہے۔

موت کو ناپسند کرنا خدا وند عالم کی محبت سے اس وقت سازگار نہیں ہے جب اس محبت کا سرچشمہ دنیاوی مظاہر جیسے اموال، اولاد، خاندان اور مقام و منصب ہو، لیکن جب دنیا میں باقی رہنے کا تعلق و لگاؤ پروردگار عالم سے ملاقات کے لئے آمادگی کا حصول اور نیک اعمال انجام دینا ہو تو خدا وندعالم کی دوستی سے منافات نہیں رکھتا۔ (۲)

۱۔ سورۂ جمعہ، آیت ٦۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص ١٧٤، ١٧٥۔

۲۔ خداوندعالم کی خواہش کو مقدم کرنا:

خداوندعالم کا حقیقی دوست اس کے ارادہ کو اپنے ارادہ پر مقدم رکھتا ہے حتی کہ اگر محبوب فراق اور جدائی کا ارادہ کرے تووہ اسے وصال پر ترجیح دے۔ اللہ کی محبت اس کے دستور اور قوانین کی پیروی کی طالب ہے اور محبوب کی رضایت کا حاصل کرنا اس کے لوازمات منیّسے ہے ۔ "کہو: اگر خداکو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو تاکہ خداتمہیں دوست رکھے اور تمہارے گنا ہونکو بخش دے خداوند بخشنے والا مہربان ہے"۔ [۱]

۳۔ یاد خداوندی سے غافل نہ ہونا:

محبوب کا ذکر، اس کی یاد اور جو کچھ اس سے مربوط و متعلق ہے اس کا تذکرہ ہمیشہ محب کے لئے لذت بخش اور دوست رکھنے کے قابل ہے، خدا کے دوست ہمیشہ اس کی اور اس کے دوستوں کی بات کرتے ہیں اور اس کی یاد کے ساتھ زندگی گذارتے ہیں اور اس کے کلام کی تلاوت سے لذت حاصل کرتے ہیں اور خلوت میں اس سے مناجات اور راز و نیاز کر کے انس حاصل کرتے ہیں۔ جیسا کہ خدا نے موسٰی ـ سے فرمایا: "اے عمران کے فرزند ! جھوٹ بولتا ہے وہ انسان جو خیال کرتا ہے کہ وہ مجھے دوست رکھتا ہے لیکن جب رات ہوتی ہے تو میری عبادت سے چشم پوشی کرتا ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر عاشق و دلدادہ اس بات کو دوست رکھتا ہے کہ وہ اپنے دلدار و عاشق سے خلوت کرے ؟ [۲]

٤۔ خوشی و غم خدا کے لئے:

خدا کے چاہنے والے محزون و مغموم نہیں ہوتے مگر اس چیز کے لئے جو انھیںمحبوب سے دور کردے اور خوشحال و مسرور نہیں ہوتے جز اس چیز سے جو انھیںان کی مراد اور مقصد سے نزدیک کردے۔ وہ لوگ اطاعت سے شاد و مسرور اور معصیت سے محزون وغمزدہ ہوتے ہیں اور دنیا کا ہونا اور نہ ہونا ان کے لئے خوشی اور غم کا باعث نہیں ہوتا۔" جوکچھ تمہارے ہاتھ سے ضائع ہو گیا ہے اس پر رنجیدہ خاطر نہ ہو اور جو تمہیں دیا گیا ہے اس کی (وجہ) سے شاد و مسرور نہ ہو"[۳]

۵۔ خدا کے دوستوںسے دوستی اور اس کے دشمنوںسے دشمنی:

"محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم" "محمد" خدا کے پیغمبر ہیں اور وہ لوگ کہ جو ان کے ساتھ ہیں کافروں کے ساتھ سخت اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مہربان ہیں [٤]

۱۔ سورۂ آل عمران، آیت ۳۱۔ ۲۔ شیخ صدوق، امالی، ص ۳۳۸، ح ۵۷۷۔ دیلمی، حسن ابی الحسن: اعلام الدین، ص ۲٦۳۔ ارشاد القلوب، ص ۹۳۔ ۳۔ سورۂ حدید، آیت ۲۳۔ ٤۔ سورۂ فتح، آیت ۲۹۔

٦۔ محبت و امید کے ساتھ خوف:

خدا کے دوست اس کے جمال کے شیفتہ ہونے کے باوجود اس کی عظمت کے ادراک کے نتیجہ میں خوفزدہ اور ہراساں رہتے ہیں کیونکہ جس طرح اللہ کے جمال کا ادراک محبت کا پیش خیمہ ہے اسی طرح اس کی عظمت کا ادراک بھی ہیبت اور ہراس کا سبب ہوتا ہے، یہ خوف و رجاء پروردگار کی بندگی میں مکمل تکمیل کا کردار ادا کرتے ہیں راہ الہی کے بعض راہرئووں نے کہا ہے: "خدا کی بندگی صرف محبت کے ساتھ اور بغیر خوف کے، امید کی زیادتی اور حد درجہ انبساط و سرور کی وجہ سے آدمی کی ہلاکت کا باعث ہوجاتی ہے۔ نیز عبودیت صرف خوف وہراس کے ساتھ بغیر امید کے وحشت کی وجہ سے پروردگار سے دوری اور ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے، خداوند ذوالجلال کی بندگی خوف و محبت دونوں کے ساتھ اس کی محبت اور تقرب کا سبب ہوتی ہے"۔ (۱)

٧۔ اللہ کی محبت کا کتمان اور اس کا دعویٰ نہ کرنا:

محبت محبوب کے اسرار میںسے ایک سر ہے اور بسا اوقات اس کے اظہار میں کوئی ایسی چیز کہی جاتی ہے جو واقع کے برخلاف اور محبوب پر افترا پردازی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی محبت پروردگار کے خاص دوستوں یعنی عظیم ملائکہ اور ان انبیاء و اولیاء کی محبت و اشتیاق کے مراتب کی نسبت قابل ذکر تحفہ نہیں ہے جو خود کو خدا کے شائستہ عشق و محبت میں ناکام تصور کرتے تھے، بلکہ حقیقی محبت کی علامت یہ ہے کہ اپنی محبت کے درجات کو ہیچ خیال کرے اور اسے قابل ذکر نہ سمجھے اور خود کو ہمیشہ اس سلسلہ میں قاصر اور عاجز خیال کرے۔

ج۔ خداوند عالم کی محبت کے علائم:

خداوند عالم کی محبت کے علائم کثرت اور فراوانی کے ساتھ انسان کے مختلف وجودی پہلوئوں میںپائے جاتے ہیں۔یہاں پر ان علائم کی طرف جو کہ نفسانی صفت کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں، اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ پروردگار سے انس:

جب انسان کادل اللہ کے قرب اور محبوب کے جمال مکشوف کے مشاہدہ سے شاد و مسرور ہوتا ہے تو انسان کے قلب میں ایک بشارت داخل ہوتی ہے کہ جسے" انس" کہا جاتا ہے۔ خداوندعالم سے انس کی علامت یہ ہے کہ گوشہ نشینی، خلوت اور اس کے ذکر میںمشغول ہونا خلائق سے انس اور ہم نشینی کرنے سے کہیں زیادہ بہتر اور خوشگوار ہے ایسا شخص لوگوں کے درمیان ہونے کے باوجود بھی در حقیقت تنہا ہے۔ اور جس وقت وہ خلوت میں ہوتا ہے ، حقیقت میں وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہمنشین ہوتا ہے۔ اس کا جسم تو لوگوں کے درمیان ہوتا ہے لیکن اس کادل ان سے الگ اور جدا ہوتا ہے۔ (۲)

۱۔ ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ۸، ص ٧٦ ، ٧٧۔ ۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص ۱۲٤ ، ۱۸۹ ، ۱۹۰۔

حضرت امیر المومنین علیؑ نے ایسے صفات کے حامل افراد کے متعلق فرمایا ہے: "انھیں علم نے بصیرت کی حقیقت تک پہنچا دیا ہے اور یہ یقین کی روح کے ساتھ گھل مل گئے ہیں، انھوں نے ان چیزوں کو آسان بنا لیا ہے جنھیں راحت پسندوں نے مشکل بنا رکھا تھا اور ان چیزوں سے انھیں حاصل کیا ہے جن سے جاہل وحشت زدہ تھے اور اس دنیا میں ان اجسام کے ساتھ رہے ہیں جن کی روحیں ملأ اعلیٰ سے وابستہ ہیں، یہی روئے زمین پر اللہ کے خلیفہ اور اس کے دین کے داعی ہیں"۔ (۱)

۲۔ خداوند عالم کی جانب اشتیاق:

جمال الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے خواہاں افراد جب وہ غیب کے پردوں کے پیچھے محبوب کے رخسار کا نظارہ کرنے بیٹھے ہوں اور اس حقیقت تک پہونچ چکے ہیں کہ اس کے جلال و عظمت کی حقیقی رویت سے قاصر و عاجز ہیںتو جو کچھ انہوں نے نہیں دیکھا ہے اس کے مشاہدہ کے لئے ان کی تشنگی اور شوق بڑھتا جاتا ہے، اس حالت کو "مقام شوق" کہا جاتا ہے بر خلاف مقام انس، جو محبوب کے کھلے چہرے کے مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے، مقام اشتیاق، محبوب کے محجوب (درپردہ) جمال و جلال کے ادراک کے شوق کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ (۲)

۳۔ قضائے الٰہی سے راضی ہونا:

"رضا" "سخط" یعنی ناراضگی کے مقابلہ میں ہے اور "رضا" سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے مقدر فرمایا ہے اس پر ظاہر و باطن، رفتار و گفتار میں اعتراض نہ کرنا۔ رضا اللہ کی محبت کے علائم و لوازم میںشمار ہوتی۔ کیونکہ محب جو کچھ محبوب سے صادر ہوتا ہے اسے خوبصورت اور بہتر سمجھتا ہے جو انسان مقام رضا کا مالک ہوجاتا ہے اس کے نزدیک فقر و غنا، آرام و تکلیف، تندرستی اور بیماری، موت اور زندگی وغیرہ وغیرہ یکساںہوتی ہے اوران میں سے کسی ایک کا تحمل بھی دشوار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ سب ہی کو محبوب کی طرف سے خیال کرتا ہے وہ ہمیشہ خود کو فرحت و سرور، آرام وآسائش میں محسوس کرتے ہوئے زندگی گذارتا ہے کیونکہ تمام چیزوںکو نگاہ رضایت سے دیکھتا ہے اور در حقیقت تمام امور اس کی مراد کے مطابق واقع ہوتے ہیں، نتیجہ کے طور پر ہر قسم کے غم و اندوہ سے دور ہوگا، قرآن کریم میں کئی جگہ اس مرتبہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، منجملہ ان کے "حزب اللہ" کی شناخت کراتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا وند رحمان ان سے راضی و خوشنود اور وہ اس سے راضی و خوشنود ہیں، یہ لوگ خدا کے گروہ ہیں، حزب خدا ہی کامیاب ہے"۔ (۳)

۱۔ نہج البلاغہ: حکمت ۱٤۷ ۔ ۲۔ ملا فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ۸، ص ۵۵۔

۳۔ مجادلہ ۲۲ ؛ بینہ ۸، ملاحظہ ہو۔

حضرت امام زین العابدین۔ مقام رضا کی عظیم شان ومنزلت کے بیان میں فرماتے ہیں: "زہد کا سب سے بلند درجہ ورع کا پست ترین درجہ ہے اور فدع کا بلند ترین درجہ یقین کا پست ترین درجہ ہے اوریقین کا بلند ترین درجہ رضا کا سب سے پست مقام و درجہ ہے"۔ [۱] اس وجہ سے خدا کے دوست جو کچھ وہ مقدّر فرماتا ہے اس پر رضا مندی کے ساتھ ہر قسم کے غم و اندوہ سے دور ہوتے ہیںاور نہایت سرور شادمانی کے ساتھ خوشگوارزندگی گذارتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم یہنمذکور ہے: "آگاہ ہوکہ خدا کے دوستونکو نہ کوئی غم و اندوہ ہے اور نہ ہی کوئی خوف وہراس انہوںنے اپنے تمام امور خدا کے حوالے کردیئے ہیںاور اس کے ارادہ کے سامنے سراپا تسلیم ہیں"۔ [۲]

د۔ محبت پروردگار کا انجام:

محبت الٰہی کا خاتمہ دیگرساری محبتوں کی طرح محبوب کے وصال پر منحصر نہیں ہے۔ اس رویت کا تحقق خداوندعالم کی معرفت پر موقوف ہے، جو خود ہی تطہیرباطن اوردنیوی لگاؤ سے دل کو پاک وصاف رکھنے کا محتاج ہے، محبت الٰہی کی راہ میں سیروسلوک کرنے والوں کے لئے دنیا میں اس کا حصول ہوتا ہے۔

اس ملاقات کی حقیقت کا سمجھنا ہمیشہ انسانی اذہان کے لئے دشوار رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے راہ انکار اختیار کرلی ہے۔

حضرت علی۔ سے خوارج میں سے ایک شخص نے سوال کیا: "کیا آپ نے اپنے رب کو اس کی عبادت کرتے وقت دیکھا ہے؟" آپ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: "تم پر وائے ہو! میں ان لوگوں میںسے نہیں ہوں جنھوں نے پروردگار کو نہ دیکھا ہو اور اس کی عبادت وپرستش کرتے ہوں" اس وقت سوال کرنے والے نے اس ملاقات کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں سوال کیا: کس طرح آپ نے ا سے دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا! "تم پر وائے ہو! نگاہیںدیکھنے کے وقت اس کا ادراک نہ کرسکیں لیکن قلوب حقایق ایمان کے ساتھ اسے دیکھتے ہیں"۔ [۳]

۱۔ اصول کافی، کلینی، ج۲، ص۱۲۸، ح۴۔

۲۔یونس ۶۲۔

۳۔ اصول کافی، کلینی، باب ابطال الروےۃ، ح۶، اسی طرح ملاحظہ ہو امام حسین کی دعائے عرفہ۔

دوسری نظر: خدا وند سبحان کی بندوں سے محبت

قرآن و روایات اہل بیت (ع) ان آیات وروایات کے حامل ہیں جو پروردگار کی اپنے بعض بندوں سے خاص محبت ودوستی کی عکاسی کرتی ہیں، اس محبت کے خاص علائم ہیں جو صرف اور صرف خاص بندوں کو شامل ہوتے ہیں۔

البتہ خداوند سبحان کی عام رحمت و محبت، دنیوی مواہب و احکام شرعی کے قالب میں سب کو شامل ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوچکا ہے کہ خدا وندعالم قرآن میںاپنی دوستی کو مجاہدین، نیکو کار افراد، زیادہ توبہ کرنے والوں، پرہیزگاروں، عدالت پیشہ افراد، صابروں، پاک وپاکیزہ افراد اورپروردگار پر اعتماد و بھروسہ کرنے والوں کی نسبت اعلان کرتا ہے۔[1]

جمال الٰہی کا دیداراور اس کا مشاہدہ اتنا لذت بخش اور سرور آور ہے جو ناقابل توصیف وتشریح ہے۔ جن لوگوں نے اس کے ادنیٰ مراتب کو بھی چکھا ہے وہ کبھی دیگر خیالی لذتوں سے اس کا سودا نہیں کرتے اسی وجہ سے انبیاء اور

اولیائے الٰہی نے اپنے محبوب سے اپنی مناجات میں مسلسل اپنے اشتیاق کااس کی بہ نسبت آشکار طور پر اظہار کیا ہے اورعرفاء اور سالکین نے اپنے اشعار اور قصائد میں جو انہوں نے بطور یادگار چھوڑے ہیں اپنے آتش عشق کے دلکش اور جاذب نظر مناظرکی، جمال محبوب کی مراد و ملاقات و شہود سے متعلق اظہار خیال کیا ہے نیز دوست کے فراق و جدائی کے غم انگیز اور حزن آور حالات کی منظر کشی کی ہے۔ ان کے نزدیک خدا کی ملاقات عرفان کی بلند ترین چوٹی اور سالکین کی سیر کا منتہیٰ ہے انھوں نے ایسی بہت سی کتابیں بھی تحریر فرمائی ہیں جن میں اس مقصد تک رسائی کے اسباب و ذرائع اور ان منازل ومراحل کو بیان کیا ہے جو اس راہ کے سالکوں کے لئے سرراہ پائے جاتے ہیں اور جو خطرات اس راہ میں ہیں ان سے بھی آگاہ کیا ہے نیز اس راہ میںجو زاد و توشہ کام آسکتا ہے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

خدا وند عالم کی داؤد پیغمبر سے گفتگو کے درمیان مذکور ہے: "اے داؤد! ہمارے زمین میں رہنے والے بندوں سے کہو ! میں اس کا دوست ہوں جومجھے دوست رکھتا ہے اور اس کا ہمنشین ہوں جو مجھ سے ہمنشینی کرتا ہے اور اس کا ہمدم ہوں جو میری یاد اور نام سے انسیت حاصل کرتا ہے اور اس کے ہمراہ ہوں جو میرے ہمراہ ہے، میں اس کا انتخاب کرتا ہوں جو میرا انتخاب کرتا ہے اور اس کا فرمانبردار ہوں جو میرا فرمانبردار ہے، جو انسان مجھے قلبی اعتبار سے دوست رکھتا ہے اور میں اس پریقین کرلوں تو ا سے اپنے ساتھ قبول کرلوں گا (اور اسے ایسا دوست رکھونگا) کہ میرے بندوں میں سے کوئی بندہ اس پر سبقت نہ کرپائے، جو انسان واقعی مجھے تلاش کرے تو پالے گا

۱۔ ترتیب وار رجوع کیجئے: سورئہ صف، ٤؛ بقرہ ١٩٥ ، ٢٢٢ ۔ آل عمران ٧٦، ١٤٦، ١٥٩ ؛ مائدہ ٤٢، اورتوبہ ١٠٨ ۔ منجملہ ان کے میرزاجوادملکی تبریزی کارسالہ، '' لقاء اللہ''ملاحظہ ہو۔

اور جو کوئی میرے علاوہ کسی دوسرے کو تلاش کرے تو مجھے نہیں پائے گا، لہذا اے اہل زمین! دنیا کے فریبوں اور اس کی باطل چیزونکو چھوڑدو، اور میری کرامت، مصاحبت، ہمنشینی کے لئے جلدی کرو اور مجھ سے انس اختیار کروتاکہ میں بھی تم سے انس اختیارکروں اور تم سے دوستی کے لئے جلدی کروں"۔ (۱)

۲۔توکل

اخلاق اسلامی میںایک دوسرا عام مفہوم جو نفسانی صفت پر ناظر اور انسان و خدا کے درمیان رابطہ کا بیان کرنے والا ہے"توکل"کامفہوم ہے۔ اس مختصرکتاب میںاس کے مقام و منزلت، ماہیت و درجات اور سعی و کوشش کے ساتھ اس کی نسبت کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

ایک۔توکل کی حقیقت و ماہیت:

توکل کی حقیقت و ماہیت کس طرح بیان کی جائے ؟ علماء اخلاق نے اس کی تعریف کے باب میں یہ ذکر کیا ہے: توکل یعنی اپنے تمام امور میں انسان کا خدا پر قلبی اطمینان اور اعتماد کرنا نیز تمام قدرتوں سے بیزاری اختیار کرنا ہے، البتہ انسان کے اندر اس حالت کا تحقق اس بات پر موقوف ہے کہ اس کا ایمان و یقین اور قوت قلب اس بات کو قبول کرے کہ عالم و بنی آدم کے کسی کام میں خدا کے علاوہ کوئی قوت اورطاقت موثر و کار ساز نہیں ہے اور تمام اسباب و علل قدرت الٰہی کے مقہور اور زیر اثرہیں اوراسی کے ارادہ کے تحت عمل کرتے ہیں کہ یہ خود توحید کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ اس وجہ سے "توکل"کی اصل واساس توحید ہے اور حصول توحید کے بغیر وہ وجود میں نہیں آسکتا۔ (۲) یہ اس اعتبار سے ہے کہ خداوند عالم نے امور کو ان کے اسباب و علل کی طرف اور کاموںکو ان کے فاعل کی طرف منسوب کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ایک طرح سے ہے اور علل اور فاعلوں کو حوادث اور افعال پر مسلّط کیا ہے؛ اگرچہ یہ تسلط اور غلبہ اصلی اور ذاتی نہیں ہے اور طبیعی علل اور انسانی فاعل تاثیرگذاری میں استقلال نہیں رکھتے، صرف خداوند عالم ہے جو مستقل سبب اور تمام اسباب سے بالاترہے۔ اس بناء پر جب ایک عاقل اور رشید انسان نے کسی کام کا ارادہ کیا اور اس کے عادی و معمول کے مطابق اسباب و وسائل کو فراہم کیا تو وہ جانتا ہے کہ تدبیر امور میں مستقل سبب تنہا خدا ہے اورکسی قسم کی اصالت اور استقلال کا اپنے لئے نیزان اسباب و علل کے لئے جن کا وہ استعمال کرتا ہے قائل نہیں ہے، لہذا وہ خداوند سبحان پر توکل کرتا ہے، اس بناء پر توکل کے معنی انسان یا طبیعی اسباب و علل کی جانب امور کے انتساب کی نفی کرنا اوراصالت و استقلال کو خدا سے مخصوص سمجھنا ہے (۳)

۱۔ سید بن طاؤوس، مسکن الفواد، ص ۲۷۔ ۲۔ اسی لئے بعض علماء اخلاق نے توکل اور توحید کو ایک ردیف میںذکرکیا ہے، رجوع کیجئے: فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ۷، ص ۳۷۷۔ ۳۔ علامہ طباطبائی کی المیزان، ج ۱۱، ص ۲۱۶ ، ۲۱۷ ملاحظہ ہو۔

دو۔ توکل کے درجات:

اخلاق اسلامی بعض علماء خداوند عالم پر توکل کے لئے تین درجات کے قائل ہیں کہ ان کا مختصر بیان درج ذیل ہے:

خداوندذوالجلال پرتوکل کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اس پر اعتماد و اطمینان رکھے۔ بعینہ اس اعتماد کی طرح جو کسی وکیل پر اپنے امور کی انجام دہی میں انتخاب کرکے رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ توکل کا سب سے ادنی درجہ ہے اور آسانی کے ساتھ دسترسی کے قابل ہے اور زیادہ دن تک باقی رہتا ہے نیز انسان کے اختیار اور تدبیر سے بھی منافات نہیں رکھتا۔

توکل کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اصل توکل سے غافل اور اپنے وکیل یعنی خداوند سبحان کے بارے میں فانی ہے، برخلاف پہلی قسم کے کہ انسان کی توجہ زیادہ تر وکالت کے قرار دادی رابطہ کی طرف ہوتی ہے۔ توکل کا یہ درجہ کم محقّق ہوتا ہے اور جلد ختم ہوجاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک دو دن سے زیادہ باقی نہیں رہتا ہے اور صرف خاص افراد کو حاصل ہوتا ہے انسان اس حالت میں اپنی بہتر سے بہتر کوشش گریہ اور خداوند عالم سے دعا ودرخواست میں صرف کرتا ہے۔

توکل کا بلندترین درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی تمام حرکات و سکنات کو خداوند عالم کے اختیار میں سمجھتا ہے۔ اس قسم اور قسم دوم میں فرق یہ ہے کہ اس میں انسان حتیٰ التماس، درخواست، تضرع و زاری اور دعا کو بھی نظر انداز کردیتا ہے اور اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ خداوند عالم اپنی حکمت سے امور کی تدبیر کرتا ہے اگرچہ وہ درخواست والتماس نہ کرے۔ اس توکل کا واقعی نمونہ حضرت ابراہیمؑ کا (خداپر) توکل کرنا ہے۔ کیونکہ جب نمرودیوں نے اُنھیں منجنیق میں رکھ کر آگ میں ڈالا تو الٰہی فرشتہ انھیں یاد آوری کرتا ہے کہ وہ خدا سے امداد کی درخواست کریں، لیکن وہ جواب میں کہتے ہیں: "خداوندعالم کا میرے حال سے آگاہ ہونا، مجھے اس سے نجات کی درخواست کرنے سے بے نیاز کرتا ہے"۔[۱]

البتہ ایسی قسم ندرت سے دیکھنے میں آتی ہے اور نہایت کمیاب ہے۔ یہ صدیقین کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہوتی ہے اور اگر واقع ہو بھی گئی تو جلد ہی زائل ہوجاتی ہے اور چند لحظہ سے زیادہ اس کو دوام نہیں رہتا۔[۲]

۱۔ تفسیر قمی، ج۲، ص ۷۳ ملاحظہ ہو۔

۲۔ فیض کاشانی المحجۃ البیضائ، ج۷، ص ۴۰۸، ۴۰۹؛ نراقی، ج۳، ص ۲۲۳ تا ۲۲۵۔

دوسرے رخ سے، لوگ خداوند عالم پر توکل و اعتماد کرنے میںیکساں مراتب و درجات نہیں رکھتے۔ ہر ایک کو چاہئے کہ اپنے توکل کے بقدر اپنے مقاصد تک پہنچنے میں اسباب و علل سے چارہ جوئی کرے۔ خداوند عالم ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے بالکل اسباب و علل طبیعی سے اپنا قطع تعلق کرلیا ہے اسی اعتماد کے تناسب سے برتائو کرے گا۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق۔نے فرمایا ہے: "خدا نہیں چاہتا ہے کہ مومنین کی روزی اس جگہ سے فراہم کرے جہاں سے وہ گمان نہیں رکھتے"[1] خداوند عالم کا یہ برتائو ان مومنین سے مخصوص ہے جو توکل کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں؛ لیکن جو لوگ اس درجہ پر فائز نہیں ہوئے ہیں اور ان کا خداوند عالم پر اعتماد کے ساتھ ساتھ طبیعی اسباب و علل پر بھی اعتماد باقی ہے، خداوند عالم بھی اسباب و علل کے ذریعہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرے گا۔[2]

تین۔ توکل کی اہمیت:

قرآن کریم نے دسیوں بار صراحت اور کنایہ کے ساتھ انسان بالخصوص مومنین کو خداوند عالم پر توکل کی دعوت دی ہے اور بندوں کے اس اعتماد و اطمینان کے مقابل ان کے امور کی کفالت سے متعلق خداوند عالم کے وعدہ کا اعلان کیا ہے۔ منجملہ ان کے قرآن میں ذکر ہے: "مومنین کو چاہئے کہ صرف اور صرف خدا پر توکل کریں"۔[3] "خداوند عالم توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔[4] اسی طرح خدا پر اعتماد اور توکل کے انجام کی نسبت اطمینان حاصل ہونے کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: "جو خدا پر اعتماد کرتا ہے اس کے لئے وہی کافی ہے"[5] احادیث نبوی اور اہل بیت (ع) کے ارشادات ان عبارتوں سے بھرے پڑے ہیں جن میں توکل کی اہمیت اور فضیلت بیان ہوئی ہے، مثال کے طور پر حضرت امام جعفر صادق۔نے فرمایا: "بے شک بے نیازی اور عزت گردش کی حالت میں ہیں وہ جیسے ہی توکل کی منزل سے گذرتی ہیں اس جگہ کو اپنا ٹھکانہ اور وطن بنالیتی ہیں"۔[6]

۱۔ کلینی، کافی، ج۵، ص۸۳، ح۱۔ ابن شعبہ حرانی، تحف العقول، ص۶۰۔ شیخ طوسی، امالی، ص۳۰۰، ح۵۹۳۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص۲۲۹، ۲۳۰۔

۳۔ سورئہ آل عمران، آیت ۱۲۲، ۱۶۰۔ مائدہ، آیت ۱۲، ۲۶۔ توبہ آیت ۵۲۔ ابراہیم، آیت ۱۱۔ مجادلہ، آیت ۱۰۔ تغابن، ۱۳۔

٤۔ سورئہ آل عمران، آیت ۱۵۹۔

۵۔ سورئہ طلاق، آیت ۳۔

٦۔ کلینی، کافی ج۲، ص ٦۵، ح۳۔

چار۔ سعی وکوشش اور توکل:

اگر چہ توکل کی حقیقت کے بارے میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ توکل سعی وتلاش اور اسباب ووسائل سے استفادہ کرنے سے منافات نہیں رکھتا لیکن کبھی ایسا شبہہ پیش آتا ہے کہ اس کی جانب اشارہ کرنا مفید ہے۔ انسان ان امور کی نسبت جن کے اسباب و علل اس کے ارادہ سے خارج ہیں وہ توکل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رکھتا لیکن ان حوادث کی نسبت جن کے اسباب و علل کی ایجاد اس کے ہاتھ میں ہے باوجودیکہ توکل کے سبب اسباب ووسائل کے لئے مستقل تاثیر کا قائل نہیں ہے، لیکن اس کا فریضہ ہے کہ ان کی فراہمی کے لئے کوشش کرے اور جس چیز کی سببیت کے لئے یقین یا گمان رکھتا ہے اس کا استعمال کرے اور اس حیثیت میں اپنی عقل و ہوش سے استفادہ کرے۔ کیونکہ خدا کی سنت اس بات پر قائم ہے کہ امور عالم اپنے خاص اسباب و علل کے ساتھ آگے بڑھیں، اسی بنیاد پر اس نے فرمایا ہے: "جنگ کے موقع پر خاص طریقہ اور اسلحہ کے ساتھ نماز پڑھو"[1] "اور اپنے لئے دفاعی قوت پیدا کرو"۔[2] موسیٰ۔ کو حکم دیا کہ "ہمارے بندوں کو شب (کے سناٹے) میں فرعونیوں کی نگاہوں سے بچا کر شہر سے نکال لو"۔[3] پیغمبر اکرم نے جب ایک اعرابی کو دیکھا کہ اس نے خداوند عالم پر توکل کے بہانہ اپنے اونٹوں کو جنگل میں چھوڑدیا تو فرمایا: "اعقلھا و توکّل"[4] "اونٹ کو باندھ دو اور خدا پر توکل کرو"۔

۳۔ شکر

یہ مفہوم بھی چند لحاظ سے تحقیق کے قابل ہے:

ایک۔ شکر کی ماہیت اور درجات:

شکر کی ماہیت کے سلسلہ میں متعدد عبارتیں استعمال کی گئی ہیں" نعمت کا تصور اور اس کا اظہار "[5] "منعم کی نعمت کی شناخت اور اس کی بہ نسبت سرور و شادمانی، اس سرور کے مقتضیٰ کے مطابق عمل کرنا امور خیر پر عزم کے ساتھ، منعم کی شکرگذاری اور خداوند عالم کی راہ بندگی میں نعمت کا استعمال" [6] اور "اظہار نعمت"[7] یہ ساری تعریفیں شکر کے لئے بیان کی گئی ہیں ان تمام تعریفوںکو یکجا کرکے کہا جاسکتا ہے کہ در حقیقت شکر وہی "نعمت کا اظہار" ہے۔

۱۔ سورئہ نساء ۱۰۱۔ ۲۔ سورئہ انفال ۶۱۔ ۳۔ سورئہ دخان ۲۳۔ ٤۔ طوسی، امالی، ص ۱۹۳، ح ۳۲۹۔ ۵۔ راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ۲۷۲۔

٦۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۳۳۔ اسی طرح ملا حظہ ہو فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج۷، ص ٤٤ تا ١٤٦۔

۷۔ علامہ طباطبائی، المیزان، ج٤، ص ۳۸، اور ج٦، ص ۲۱۵۔

نعمت کا اظہار ایک طرف اس کے تصورو ادراک کا مستلزم ہے اور دوسری طرف یہ اظہار مختلف مراتب اورپہلوؤں کا حامل ہے کیونکہ نعمت کے اظہار سے مراد اس کا ایسی راہ میں استعمال کرنا ہے جس میں منعم نے ارادہ کیا ہو، اسی طرح اس کی کا ذکر اور اس کی نعمت کے لئے اس کی مدح وثنا کرنا ہے۔ اس وجہ سے شکر سہ گانہ مراتب کا حامل ہے قلبی: (یاد کرنا)، زبانی (مدح وثنا) اور عملی۔ شکر خداوندی سے مراد یہ ہے کہ انسان پہلے دل میں ہمیشہ اس کی نعمتوں کی طرف متوجہ ہو اور اس کی نعمتوں کو یادرکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی بیکراں نعمتوں سے استفادہ کرنے کے وقت اللہ کی حمد و ستائش کے لئے زبان کھولے۔ تیسرے خدا کی نعمتوں اور اس کی برکتوں کواس راہ میں استعمال کرے جس میں اس کی مرضی اور خواہش ہو۔[1] شکر کے مقابل کفر ہے جو کہ اللہ کی نعمتوں کو پوشیدہ و مخفی کرنے کے معنی میں ہے۔ البتہ واضح ہے کہ اللہ کی بے شمار نعمتوں کی بہ نسبت اللہ کے شاکر بندے بھی شکر گزاری سے عہدہ بر نہیں ہو سکتے، اس کے باوجود ادب بندگی اقتضاء کرتا ہے کہ اس راہ میں اپنی انتھک کوشش کرے۔ قرآن اللہ کی نعمتوں کی وسعت اورنوع بشر کے میزان شکر کے بارے میں فرماتا ہے: "اور تم نے جو کچھ مانگا اس نے عطا کیا، اور اگر خدا کی نعمتوں کو شمار کرو تو ان کا شمار نہیں کرسکتے یقینا انسان بڑا ظالم اور ناشکرا ہے"۔[2]

دو۔ شکر کی اہمیت:

آیات و روایات میں شکر کی شرح یوں ذکر ہوا ہے: شکر گزاری خدا کے صفات میں سے ہے "اور خدا شکر گزار اور بردبار ہے"۔[3] شکر گزاری جنت میں رہنے والوں کے کلام کی ابتدا و انتہا ہے: "شکر اس خدا کا جس نے ہم سے کئے گئے اپنے وعدہ کو ہم پر سچ کردکھایا "[4] اور ان کی مناجات کا آخری کلام یہ ہے: "الحمد للہ رب العالمین "۔[5] خداوند عالم نے شکر گزاری کو ایمان کے ساتھ ساتھ عذاب سے روکنے کا باعث قرار دیا ہے: "اگر شکر گذار بنو اور ایمان لے آؤ تو خدا تم پر عذاب کر کے کیا کرے گا ؟"[6]

۱۔ شکر کے مراتب کو معتبر و مستند احادیث کے مضامین سے استنباط کیا جا سکتا ہے؛ جیسے کافی، ج۲، ص۹۶، ح۱۵، اور ص۹۵، ح۹، ۱۱۔

۲۔ سورئہ ابراہیم، آیت ۳٤، اسی طرح ملاحظہ ہو سورئہ اعراف، آیت ۱۰ اور۱۷، سورئہ یونس، آیت ٦۰ اور سورئہ غافر، آیت ٦۱۔

۳۔ سورئہ تغابن، آیت ۱۷ اسی طرح ملاحظہ ہو سورئہ نساء آیت ۱٤۷۔

٤۔ سورئہ زمر ۷٤۔ ۵۔ یونس ۱۰۔ ٦۔ نساء ۱٤۷۔

شکر گزاری کی فضیلت یہناتنا ہی کافی ہے کہ خداوندعالم صریحی طور پر بندوںکو اس کا حکم دیتا ہے: " اور میرا شکر بجا لاؤ اور میرے ساتھ ناشکری نہ کرو "[۱] حضرت امام زین العابدین۔ کے بقول خداوند عالم کا شکر ادا کرنا انسان کو اللہ کی خاص محبت کے دائرہ میں قرار دیتا ہے: " حقیقت یہنخداوندعالم ہر محزون وغمزدہ دل اور ہر شکر گذار و قدرداں بندہ کو دوست رکھتا ہے " ۔[۲] اس وجہ سے حق شناسی اور شکر گزاری خداوند عالم اور انسان کے درمیان رابطہ بر قرار کرنے والے اساسی وبنیادی عناصر میں سے ہے یہ انسان کا خدا کے ساتھ رابطہ ہے جس کی اصل الٰہی نعمتوں اور برکتوں کے ادراک اور ان کی نسبت قلبی اعتراف میں پوشیدہ ہے۔قابل ذکر بات ہے کہ "شکر" اپنے مجموعی مفہوم کے اعتبار سے لوگوں کی شکر گزاری بھی لوگوں کی خدمتوں کے سلسلہ میں شامل ہے اس طرح کے شکر کے سلسلہ میں اخلاق معاشرت کی بحث یہنگفتگو کی جاتی ہے۔

تین۔ شکر خداوندی کا دنیوی نتیجہ:

سب سے اہم دنیوی اثر جو دینی کتابوں میں شکر گزاری کے لئے بیان کیا گیا ہے، پروردگار کی نعمتوں کا زیادہ ہونا ہے۔ قرآن کریم میں ذکر ہوا ہے: "جب کہ تمہارے رب نے اعلان کیا کہ اگر شکر کروگے تو (نعمت) کو تم پر زیادہ کردوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو یقینا میرا عذاب سخت ہے"۔ [۳] یہ حقیقت بہت سی روایات میں بیان ہوئی ہے ؛ منجملہ ان کے حضرت علی۔ نے فرمایا: "خداوند عالم کسی بندہ پر شکر گذاری کا دروازہ نہیں کھولتا، اس حال میں کہ نعمت کا دروازہ اس پر بند کردے " ۔ [٤]

یہ سوال ہمیشہ ہوتا رہتا ہے کہ آیا خداوند سبحان کی شکر گزاری بندوں کے لئے مقدور ہے؟ کیونکہ سپاس گذاری کی توفیق اور اس کی قوت خود خدا کی ایک نعمت ہے اور دوسرے شکر کا مستلزم ہے۔ اگر اس فریضہ کا انجام دینا انسان کے امکان سے خارج ہے، تو پھر کس طرح انسان کو اس کے کرنے کا حکم دیتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں حضرت امام جعفر صادق۔ فرماتے ہیں: "وہ باتیں جن کی خداوندعالم نے موسیٰ۔ کو وحی کی تھی ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ موسیٰ میرا شکر ایسا ادا کرو، جو میرے شایان شان ہو " موسیٰ۔ نے جواب میں پوچھا: خدایا! کس طرح تیری شکرگذاری کا حق ادا کروں جب کہ ہر طرح میری شکرگذاری خود ہی ایک دوسری نعمت ہے ؟ خدا نے جواب میں فرمایا: اب (جب کہ تم نے جان لیا کہ تمہارا شکر کرنا خود ہی ایک دوسری نعمت ہے) تم نے میرے شکر کا حق ادا کردیا " ۔[۱] یعنی شکر الٰہی کا حق یہ ہے کہ انسان اپنی آخری کوشش کو اس راہ میں صرف کرے، اسی کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ کے شایان شان شکر ادا نہیں ہوسکتا۔

۱۔ بقرہ ۱۵۲ اسی طرح ملاحظہ ہو سورئہ اعراف ١٤٤ اور سورئہ زمر ٦٦۔ ۲۔ کافی، کلینی، ج۲، ص۹۹ ح۳۰۔ ۳۔ ابراہیم ۷۔ ٤۔ نہج البلاغہ، حکمت ٤٣٥؛ کافی، ج ۲، ص ٩٤، ح۲ اور ص ۹۵، ح ۹ ؛ امالی، ص ٥٩۔

ب۔ نفس کا اپنی عاقبت کی طرف رجحان

بعض عام اخلاقی مفاہیم انسان کے نفسانی حالات کے نظام کو اپنی عاقبت اور انجام کار کے لئے وجود میں لاتے ہیں وہ اہم ترین مفاہیم جو اس باب میں ذکر ہوئے ہیں یہ ہیں: خوف، رجائ، مایوسی، نا امیدی اور تدبیر خداوندی سے حفاظت۔ چونکہ یاس و نا امیدی "خوف و خشیت" کے لئے نقصاندہ اور تدبیر خداوندی سے حفاظت، امید و رجاء کے لئے بلا شمار ہوتی ہے، نتیجہ کے طور پر بحث و گفتگو کا موضوع اس حصہ میں" خوف و امید" ہے اور دیگر مفاہیم انھیںدو عنوانوں کے تحت زیر بحث قرار پائیں گے۔

۱۔ خوف

الف۔ خوف کا مفہوم:

خوف یعنی مستقبل میں یقینی یا ظنّی علامتوں کی بنیاد پر انسان کے لئے کسی ایسے ناگوار واقعہ کے پیش آنے کا احتمال[۲] جو فطری طور پر دردمندی اور پریشانی کا باعث ہے۔[۳] اس بنا پر "خوف" "بزدلی" سے اساسی فرق رکھتا ہے کیونکہ" جبن (بزدلی) " سے مراد ہے خود کو دفاع اور انتقام وغیرہ سے ایسی جگہوں پر روکنا جہاں شرعی اور عقلی دونوں لحاظ سے اس کا اقدام کرنا جائز اور بہتر ہے۔[٤]

۱۔ کافی، کلینی، ج۲، ص۹۸، ص۹۸، ح۲۷ملاحظہ ہو۔

۲۔ راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ۱۶۱۔

(۳۔ ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ۷، ص ۲٤۹؛ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص۲۰۹۔

٤۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۰۹۔

علماء اخلاق نے پہلی تقسیم میں خوف کو دو پسندیدہ اور ناپسندیدہ قسم میں تقسیم کیا ہے۔ ناپسند خوف وہی خدا کے علاوہ کسی دوسری چیز سے خوف کھانا ہے اور خوف پسندیدہ عذاب خداوندی اور برے انجام سے خوف کھانا ہے اور حقیقت میں اپنی بری رفتار اور اعمال کے ناگوار عواقب سے خوف کھانا ہے۔ یہاں پر ہماری بحث کا موضوع پسندیدہ خوف ہے۔

ب۔ خوف کے درجات:

اخلاق اسلامی کی مشہور کتابوں میں "ورع" "تقویٰ" اور "صدق" کو "خوف" کے درجات میں شمار کیا گیا ہے اس طرح سے خوف کا سب سے معمولی درجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا باعث ہو کہ انسان اخلاقی ممنوعات و منہیات کے ارتکاب سے پرہیز کرے۔ "خوف" کے اس درجہ کو "ورع" کہتے ہیں۔ اور جب خوف کی قوت اور طاقت یئنا اضافہ ہوجائے اور وہ اس بات کا باعث ہو کہ انسان محرمات کے ارتکاب کے علاوہ مشکوک و مشتبہ چیزوں سے بھی پرہیز کرے تو اسے تقویٰ" کہتے ہیں۔ تقویٰ میں صداقت یہ ہے کہ حتی بعض جائز و مباح امور کے ارتکاب سے بھی پرہیز کرے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ حرام کے ارتکاب کی راہ ہموار کردے اور آخر کار جب انسان خدا سے شدت خوف کی وجہ سے سراپا آمادئہ خدمت ہوتا ہے اور ضرورت سے زیادہ کوئی گھر نہیں بناتا اور نہ کوئی مال ذخیرہ کرتا ہے اور اس مال کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ اسے ایک دن چھوڑ جائے گا اور کوئی سانس بھی غیر خدا کی راہ میں نہیں لیتا تو در حقیقت اس نے "صدق" کی وادی یئنقدم رکھ دیا ہے اور ایسے مرتبہ کے مالک کو صدّیق کہتے ہیں اس بنا پر مقام "صدق" اپنے اندر تقویٰ و ورع بھی رکھتا ہے اور تقویٰ و ورع کا حامل بھی ہے البتہ "ورع" عفّت کے ساتھ بھی ہے کیونکہ عفّت نفسانی شہوات و خواہشات سے پرہیز کرنے کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے لیکن اس کے برعکس صادق نہیں ہے۔[۱]

ج۔ خوف کی اہمیت:

اولاً

خدا کا خوف انسان کے لئے سعادت حاصل کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ پہلے بیان کئے گئے مباحث کی روشنی میں انسان کی سعادت پروردگار سے ملاقات اور اس کے جوار میں سکونت اختیار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ بات انس و محبت الٰہی کے سایہ ہی میں ممکن و میسر ہے اور وہ خود معرفت الٰہی پر منحصر ہے اور معرفت خود فکر کی مرہون منت ہے اور انس محبت وذکر پر منحصر ہے۔

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ ملا فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ۷، ص ۲۷۰، ۲۷۱۔

فکر وذکر الہی اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے دل کو دنیاوی محبت سے الگ کرلے اور دنیا سے قلبی لگاؤ کو قطع کرنے کے لئے شہوتوں اور لذتوں سے کنارہ کشی کرنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اور خوف خدا وندی کی آگ لذتوں اور شہوتوںکی راہ میں ایک کارآمد اسلحہ ہے۔ (۱) نتیجۃً خوف الہی انسان کا مقصد کی طرف حرکت کرنے کا پہلا سنگ بنیاد ہے۔

ثانیاً،

بہت سی آیات وروایات مختلف انداز سے خدا کے خوف کی اہمیت و منزلت پر تاکید کرتی ہیں۔ منجملہ ان کے قرآن نے خدا سے خوف کرنے والوں کو رحمت و رضوان و ہدایت کا وعدہ دیا ہے: "ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب کا خوف رکھتے تھے ہدایت و رحمت تھی"۔ (۲) "خدا ان لوگوں سے راضی و خوشنود ہے اور وہ لوگ بھی اس سے راضی و خوشنود ہیں یہ جزا اس کی ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے"۔ (۳) اسی طرح قرآن خوف کا دعوی صرف حقیقی عالموں سے قبول کرتا ہے: "خدا کے بندوں میں صرف علماء ہیں جو اس سے ڈرتے ہیں"۔ (٤) دوسری جگہ خوف کو ایمان کے لوازم میں شمار کیا ہے: "مومنین وہی لوگ ہیںکہ جب خدا کاذکر ہو تو ان کے دل خوفزدہ ہوں" (٥) سرانجام قرآن نے خدا ترس لوگوں سے بہشت کا وعدہ کیا ہے: " اور رہے وہ جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ہراساں ہیں اور اپنے نفس کو ہواو ہوس سے روک رکھا ہے، اس کا ٹھکانہ بہشت ہے "۔ (٦) خداوندعالم کی حضرت عیسیٰ سے گفتگو میں مذکور ہے: "اے عیسیٰ ! مجھ سے ڈرواور میرے بندوں کو میری نسبت خوف دلاؤ، شاید گناہگار لوگ جو وہ گناہ کرتے ہیں اس سے باز آجائیں اور نتیجہ کے طور پرہلاک نہ ہوں سوائے ان کے جو جانتے ہیں"۔ (۷)

۱۔ ایضاً۔

۲۔ اعراف ١٥٤۔

۳۔ بینہ ۸۔

٤۔ فاطر ۲۸۔

٥۔انفال ۲ ۔ آل عمران ۱۷۵۔

٦۔ نازعات ٤٠، ٤١۔

۷۔) کافی، ج ۸، ص ۱۳۸، ح ۱۰۳۔

د۔ خوف کے بارے میں ہوشیاری:

خداوند ذو الجلال سے خوف کھانا وادی قرب الہی میں بندوں کے سلوک کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ جیسا کہ اس تازیانہ کا کمزور ہونا یا فقدان، الہی راہ کے سالکوں کے لئے بے زادو راحلہ بنادیتا ہے، حد سے زیادہ اس کی زیادتی بھی امید کی کرن کو اس کے دل میں منزل مقصودتک پہونچنے کے امکان میں خاموش کردے گی اور حرکت کرنے کی طاقت بھی اس سے سلب کرلے گی۔ لہٰذا خدا وند عالم سے خوف میں افراط کرنا رحمت الہی سے قنوط ومایوسی ہے جو خوف خدا کی عظیم آفت ہے۔ اور اخلاقی برائی شمار ہوتی ہے]بعض ارباب لغت نے قنوط کو مایوسی کا شدید درجہ سمجھتے ہیں ۔[1] اسی بنیاد پر قرآن کریم رحمت خداوندی سے مایوسی کو محض گمراہی تصور کرتا ہے: "کون ہے جز گمراہوں کے جو رحمت خداوندی سے مایوس ہوتا ہے ؟ "[2] اور دوسری جگہ رحمت خداوندی سے مایوسی کو کا فرونکا شیوہ تصور کرتا ہے: "یقینا کافروں کے سوا کوئی رحمت الہی سے مایوس نہیں ہوتا "۔[3] بہت سے مواردمیںانسان کا خوف زندگی کے برے انجام اور شوم عاقبت سے ہوتا ہے ؛ خوف اس بات کا کہ کہیں انسان کفر کی حالت یا خدا کے انکار یا شک وتردید کی حالت میں دنیا سے چلا جائے یا ایسے حال میں دنیا چھوڑے کہ اس کا دل خدا کی محبت اور اس کے انس سے خالی ہو، نتیجہ کے طور پر اپنے اعمال سے شرمندہ اور عذاب الہی میںگرفتار ہو۔ واضح ہے کہ جو بھی ایسا خوف وہراس دل میں رکھے گا اسی وقت سے اپنی را ہ وروش اور گفتار کو بدلنا چاہے گا اور یہ وہی خدا سے خوف رکھنے کی فضیلت کا رمز ہے۔

۲۔ امید

الف۔ امید کا مفہوم: "رجائ" ("امید") سے مراد قلبی سکون کا احساس ہے اور وہ کسی ایسے امر کے تحقق کے انتظار کے نتیجہ میں ہے جو محبوب اور خوش آیند ہے، البتہ ایسی صورت میں جبکہ اس محبوب امر کے اکثر اسباب اور موجبات محقق وثابت ہوں۔ لیکن جب اسباب کا وجود یا عدم معلوم نہ ہو تو ایسے انتظار کو "تمنا" اور "آرزو" کہا جاتا ہے۔ اگر امر محبوب کے وجود کے اسباب و علل فراہم نہ ہوں اور اس کے باوجود انسان اس کے تحقق کا انتظار رکھتا ہو تو ایسے انتظار کو "فریب" اور "حماقت" کہتے ہیں اور کبھی اس پر رجاء و امید کا مفہوم صادق نہیں آتا ہے۔ "امید" بھی "خوف وہراس" کے مانند ایسی جگہ ذکر کی جاتی ہے جہاں واقعہ کا ظاہر ہونا عام طور سے محتمل ہو نہ کہ قطعی۔ اس وجہ سے امید سورج کے طلوع یا غروب کے متعلق جس کا تحقق قطعی ہے ، صحیح نہیں ہے۔[4]

۱۔ ملاحظہ ہو ابوہلال عسکری اور نور الدین جزائری کی کتاب معجم الفروق اللغوےۃ، ص ۴۳۵، ۴۳۶۔ ۲۔ سورئہ حجر، آیت ۵۶۔ ۳۔ سورئہ یوسف، آیت ۸۷۔ ٤۔ ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ۷، ص ۲۴۹۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲٤٤۔

ب۔ امید کی اہمیت:

قرآن وروایات میں رحمت خداوندی اور نیک انجام سے امید مختلف جہات اور اسالیب میںمورد تاکید وترغیب واقع ہوا ہے کہ ذیل میں ان کے صرف اصلی محور کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

۱۔ وہ آیات وروایات جو رحمت خداوندی سے اس مایوسی اور نا امیدی کی مذمت میںجو "امید" کے مقابل ہے، وارد ہوئی ہیں، ان میں سے بعض بیان ہوچکی ہیں۔

۲۔ وہ آیات وروایات جو بندوں کو واضح طور پر فضل خداوندی کا امیدوار بناتی ہیں اور اس کی تشویق وترغیب کرتی ہیں؛ منجملہ ان کے یہ ہے کہ خداوند ذوالجلال رسول اکرم سے فرماتا ہے: "عمل کرنے والے (مومنین) ان اعمال پر اعتماد نہ کریں جو میرے ثواب کے حصول کے لئے انجام دیتے ہیں، کیونکہ اگر اپنی تمام عمر میری عبادت کے لئے کوشاں ہوںاور زحمت کریں اس کے بعد بھی کوتاہی کی ہو اور میری عبادت کی کنہ و حقیقت کو کہ جس کے سبب سے وہ کرامت جو میرے نزدیک ہے اور میری بہشت کی نعمتوںکو تلاش کرتے ہیں، نہیں پہونچ سکتے، بلکہ انھیںچاہیئے کہ میری رحمت پر اعتماد کریں اور میری بخشش کے امیدوار رہیں"۔ (۱)

۳۔ قرآن وروایات میں مذکور ہے کہ فرشتے اور اللہ کے انبیاء ہمیشہ مومنین کے لئے خداوند عالم سے عفو و بخشش طلب کرتے رہتے ہیں اور یہ خود رحمت خداوندی سے امید رکھنے کا باعث ہے۔

قرآن میں مذکور ہے: "فرشتے اپنے پروردگار کی حمد میں تسبیح پڑھتے ہیں اوران لوگوںکے لئے جو زمین میں ہیں عفو وبخشش طلب کرتے ہیں"۔(۲)

٤۔ وہ آیات وروایات جو اللہ کے بے کراں عفو ومغفرت پر دلالت کرتی ہیں: "یقیناً تمہارا رب لوگوں کی نسبت ان کے ستم کے باوجود بخشنے والا ہے"۔ (۳)

اسی طرح جو کچھ پیغمبر اکرم کی شفاعت کے بارے میں ان کی امت کی نسبت وارد ہوا ہے، (٤) یا وہ آیات وروایات جو اس بات کو بیان کرنے والی ہیں کہ جہنم صرف اور صرف کافروں کے لئے فراہم کی گئی ہے، (۵) یا مومنین کے آتش (جہنم) میں ہمیشہ رہنے کی نفی کرتی ہیں، اسی طرح گناہگاروں کو عفو و گذشت کی درخواست میں جلدی کرنے کی دعوت دیتی ہیں یہ تمام آیات وروایات درحقیقت خداوندعالم سے امید رکھنے اور حسن عاقبت کی تشویق کرتی ہیں۔ (٦)

۱۔ کافی، ج۲، ص۷۱، ح ۱۔ ۲۔ سورۂ شوری، آیت ۵۔ ۳۔ سورۂ رعد، آیت ٦۔ ٤۔ سورۂ ضحی کی پانچویںآیت کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

۵۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۱۔ ٦۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲٤۷ تا ۲۵٤۔

ج۔ امید کے نقصانات:

خداوندعالم کی رحمت سے امید اور نیک انجام کی توقع رکھنے سے دو لحاظ سے شدت کے ساتھ خطرہ محسوس ہوتاہے کہ ذیل میںّا ن کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

۱۔ بغیر عمل کے امیدوار ہونا:

"امید "کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ کسی خوش آیند امر کے تحقق کے انتظار کے نتیجہ میں قلبی کو اس صورت میں امیدواری کا نام دیا جاتا ہے کہ جب اس کے اکثر وبیشتر اسباب وعلل فراہم ہوں ورنہ خوش آیند سر انجام کا انتظار بغیر اس کے اسباب کے تحقق کے " حماقت "اور"غرور" کے سوا کوئی چیز نہیں ہوگی۔

امیدواری کی ایک اہم ترین مشکل درواقع جھوٹی اور بے بنیاد امیدیں ہیں، اسلام کے اخلاقی نظام میں سعادتمندی اور نیک بختی صرف عمل صالح کی راہ سے گذرتی ہے لیکن بہت سے ایسے افراد ہیں جو بغیر کوشش اور نیک عمل کے، نیک اور اچھے انجام کی امیدکے داعویدار ہیں۔ حضرت علی اس گروہ کو ہوشیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں"کیا تم امید رکھتے ہو کہ تمھیںخدا متواضع افراد جیسا اجر دے دیگا جب کہ تم اس کے نزدیک سرکشوں میں شمار سے ہو اور صدقہ دینے والوں کے ثواب کی آرزو رکھتے ہو جب کہ تم نعمت سے مالامال ہو اوراسے بے چاروں اور بیوہ عورتوں پر خرچ کرنے سے دریغ کرتے ہو !آدمی نے جو کچھ کیا ہے وہ اسی کی جزا پاتا ہے اور جو اس نے پہلے روانہ کیا ہے اسی پر وارد ہوتا ہے"۔ (۱)

۲۔ تدبیر خداوندی سے اپنے کو محفوظ سمجھنا:

خداوند رحمان کی بخشش کا حد درجہ امیدوار ہونا تدبیر خداوندی (سزائے الہی) سے بے خوفی کا احساس دلاتا ہے جو کہ اخلاقی رزائل میںسے ایک ہے۔ خود کو اللہ کے عذاب سے محفوظ سمجھنا خوف الہی سے منافات رکھتا ہے، نیز تدبیر الہی سے امان کا احساس انسان کو گناہ و عصیان میںغوطہ لگانے کا آغاز ہے۔ اسی بنیاد پر انبیاء واولیاء خود کو امن وامان میں نہیں سمجھتے تھے اور ہمیشہ عذاب خداوندی سے خوفزدہ رہتے تھے۔ قرآن کریم تدبیر خداوندی سے امان کے احساس کی مذمت میں فرماتا ہے:"آیا انہوں نے خود کو تدبیر خداوندی سے امان میں خیال کیا ہے ؟ (باوجودیکہ) خسارہ اٹھانے والے لوگوں کے علاوہ کوئی بھی خود کو تدبیر الہی سے محفوظ نہیں سمجھتا"۔ (۲)

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۲۱، اور ملاحظہ ہو خطبہ ۱۶۰، حکمت ۱۵۰ حرانی، تحف العقول، ص ۲ ۔ کافی، کلینی، ج۲، ص ۶۸، ح ۵۔

۲۔ اعراف ۹۹۔

۳۔ خوف ورجاء کے درمیان مناسبتیں:

اس سلسلہ میں دورخ سے توجہ کی جا سکتی ہے: ایک قلب انسان پر ان میں سے ہر ایک کی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے، دوسرے یہ کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل کیا مقام ومنزلت اور کیا اہمیت رکھتے ہیں ،یعنی یہ کہ آیا امید، خوف سے زیادہ اہم چیز ہے یا اس کے عکس (خوف امید سے زیادہ اہم ہے؟)

پہلی بات تو یہ ہے کہ خوف ورجاء گذشتہ مفہوم کے اعتبار سے اصل وجود میں ایک دوسرے کی نسبت لازم وملزوم ہیں ؛ کیونکہ "خوف" کسی ناگوار امر کے وقوع اور آئندہ ممکن الحصول چیز کے انتظار کے نتیجہ میں قلبی گھبراہٹ اور پریشانی ہے ، اس وجہ سے جس طرح اس کا واقع ہونا احتمال رکھتا ہے اسی طرح اس کاواقع نہ ہونا بھی احتمال رکھتا ہے نیز جس طرح اس کا واقع ہونا ناگوار اور نا خوش آیند ہے اسی طرح اس کا واقع نہ ہونا بھی خوش آیند اور اس کے عدم کا انتظار خودہی مایۂ امید ہوگا۔ اس وجہ سے ہر امید اپنے دامن میں خوف وہراس رکھتی ہے اور اس کے برعکس ہر خوف وہراس بھی اپنے دامن میں امید رکھتا ہے۔ رہا اس سوال کا جواب کہ ان دونوں کا اثر انسان پر کس درجہ ہے؟ کہا جا سکتا ہے: یہ نسبت اسی اندازہ اور میزان کے ساتھ ہونی چاہیے کہ ان دونوںمیں سے کوئی بھی دوسرے کے اثر حرکت اور کارآمد ہونے کو کم نہ کرے، کیونکہ خوف و رجاء عمل صالح اور خداوند عالم سے تقرب کا ذریعہ ہیں، اور یہ اس وقت ثابت ہوگا جب دونوں ہی تعادل وتوازن کے ساتھ (میانہ حالت پر) ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہمیت کے اعتبار سے جب دونوں کا ایک دوسرے سے مقایسہ کیا جائے تو یہی ذہن میں آتا ہے کہ اس قیاس کو دو سطح میں انجام دیا جا سکتا ہے: ۱ فرداًفرداًافراد اور مصادیق کے اعتبار سے، ۲ مصادیق سے صرف نظر کرکے تنہا خوف ورجاء کی حقیقت پر غور کرتے ہوئے افراد کی نسبت ان دونوںمیں سے ہر ایک کا مقدم ہونا فرد کی حالت سے وابستہ ہے۔ بعض کو "امید" متحرک کردیتی ہے تو بعض کو "خوف" متحرک بنادیتا ہے۔ واضح ہے کہ مناسب دوا ہر ایک کے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن معین افراد واشخاص سے قطع نظر اور خوف و رجاء کی حقیقت کے پیش نظر بعض آیات [1] و روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اگر عمل خداوندرحمان پر امید کے ذریعہ انجام پائے تو اس عمل پر جو خوف کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ برتری رکھتا ہے۔ منجملہ ان کے حضرت علی ـسے نقل ہوا ہے: "رحمت الٰہی کی امید خوف الٰہی سے زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ خداوندعالم سے تمہارا خوف کھانا تمہارے گناہوں سے پیدا ہوتا ہے لیکن خدا سے تمہاری امید اس کی بخشش سے پیدا ہوتی ہے، لہٰذا خوف تمہاری طرف سے ہے اور امید اس کی طرف سے"۔ [2] دعائے جوشن کبیر میں وارد ہوا ہے: "یا من سبقت رحمته غضبه" اے وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

۱۔ فصلت ۲۳ اور فتح ۱۲۔ ۲۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید معتزلی، ج۲۰، ص ۳۱۹، ح ٦٦٦۔

ج۔ نفس کا خود اپنی طرف رجحان

نفس انسانی کے اپنی نسبت رجحان کا تعادل وتوازن بعبارت دیگر اپنے کام سے متعلق صحیح جانچ پڑتال رکھنا اخلاق اسلامی میں عام مفاہیم کے دوسرے گروہ کا ہدف ومقصد ہے۔ سب سے اہم وہ مفہوم جو انسانی کے اپنی نسبت مثبت رجحان اور صحیح جانچ پڑتال کا ذریعہ بیان کرتا ہے وہ " انکساری " یا " خود شکنی " اور " تواضع " ہے۔

۱۔ انکسار نفس

نفس کی انکساری اور خود شکنی سے مراد یہ ہے کہ انسان بغیر اس کے کہ اپنا کسی غیر سے مقایسہ کرے خود کو سب سے حقیر چھوٹا سمجھے نیز خود پسند اور اپنے آپ سے راضی نہ ہو، خود شکنی تواضع کا سرچشمہ ہے اور بغیر اس کے تواضع محقق نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جو کچھ تواضع کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں بیان کیا جائے گا وہ سب فروتنی اور خود شکنی کی فضیلت پر بھی دلالت کرے گا، اور شاید اسی وجہ سے آیات و روایات میں زیادہ تر "تواضع " کے سلسلہ میں تاکید کی گئی ہے اور انکساری نفس اور خود کو حقیر شمار کرنے کے بارے میں کم ذکر آیا ہے۔ انکساری نفس کی فضیلت کے مختلف پہلوؤں کو جب اس کے موانع سے مقایسہ کریں اور ان کے متضاد مفاہیم پر غور کریں تو بخوبی دریافت کرسکتے ہیں، یہ موانع درج ذیل ہیں:[۱]

پہلی نظر عُجب (خود پسندی)

عُجب خود ستائی اور غرور فروتنی اور خودکو حقیر شمار کرنے کے اصلی و بنیادی موانع میں سے ایک ہے، چونکہ خودستائی حقیقت میں خود پسندی کی علامت اور اس کے ملحقات میں سے ہے لہذا ہم موانع کی بحث کو خود پسندی اور غرور کے محور پر بیان کریں گے۔

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۳۴۳ ملاحظہ ہو۔

الف۔ عُجب کا مفہوم:

عُجب یعنی خود کو اس کمال کی وجہ سے عظیم اور بلند سمجھنا ا جو وہ اپنے اندر سمجھتا ہے خواہ وہ کمال واقعاً اس میں پایا جاتا ہو یا نہ پایا جاتا ہو، نیز جس چیز کو وہ کمال تصور کررہا ہے واقعاً بھی کمال ہو یا نہ ہو اس وجہ سے خود پسندی میں بھی انکسار نفس اور فروتنی کے مانند دوسرے سے مقایسہ نہیں پایا جاتا ہے اور بغیر اس کے کہ انسان اپنا دوسروں سے مقایسہ کرے اپنے اندرپائے جانے والے واقعی یاخیالی کمال کے تصوّر کی وجہ سے نیز اس بات سے غفلت کے سبب کہ ہر کمال خدا کی جانب سے ہے، اپنے آپ پر مغرور اور راضی و خوشنود ہے اور اپنی حالت کو پسند کرتا ہے۔ بر خلاف "کبر" کے کہ متکبر انسان اپنے آپ سے راضی و خوشنود ہونے کے علاوہ خود کو دوسروں سے مقایسہ کرکے اور اپنے آپ کو غیروں سے بہتر سمجھتا ہے نیز اپنے لئے دوسروں کے مقابل حق اور اہمیت و امتیاز کا قائل ہے (۱)

اس بنا پر، "کبر" کا محقق ہونا اس بات کا مستلزم ہے کہ" عُجب" بھی پایا جائے، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں عُجب و خود پسندی ہووہاں کبر بھی ضروری ہو۔ کبھی انسان کی خود پسندی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ جو اس کے اندر کمال پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے اپنے لئے خدا وند عالم سے حقوق اور مطالبات کا انتظار کرتا ہے اور اپنے لئے خدا کے نزدیک حیثیت و مرتبہ کا قائل ہو جاتا ہے، اس طرح سے کہ ناگوار حوادث کا وقوع اپنے لئے بعید سمجھتا ہے ایسی حالت کو "ادلال" کہا جاتا ہے ،در حقیقت یہ حالت خود پسندی کا سب سے بڑا اور بدترین درجہ ہے۔ (۲)

ب۔ خود پسندی کی مذمت :

قرآن کریم میں بارہاخود پسندی کی مذمت کی گئی ہے، منجملہ ان کے جنگ حنین میں مسلمانوں کی شکست کی علّت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "یقیناً خداوندرحمان نے تمہاری بہت سے مواقع پر مدد کی ہے اورحنین کے روز بھی جب کہ تمہاری کثرت تعداد نے تمہیں فخر وناز میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم دشمن کی طرف پیٹھ کرکے فرار کر گئے"۔ (۳)

اس آیت میں خود پسندی کا ذکر اخلاقی برائی کے عنوان سے ہوا ہے جو کہ لشکر اسلام کی شکست کا باعث بن گئی ۔ پیغمبر اکرم سے منقول ہے کہ خدا وند عالم نے حضرت داؤد سے فرمایا: "اے داؤد! گناہگاروں کو بشارت دے دو اور صدیقین (سچے اور پاک باز لوگوں کو) ڈراؤ۔

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۳۲۱، ۳۲۲ملاحظہ ہو۔ ۲۔ ایضاً، ص۳۲۲۔۳۔ سورئہ توبہ، آیت۲۵۔ اسی طرح ملاحظہ ہو سورئہ حشر، آیت ۲۔ سورئہ کہف، آیت ۴۰۔ اور سورئہ فاطر، آیت ۸۔

داؤد نے عرض کی: گناہگاروں کو کس طرح مژدہ سنائوں اور صدیقین کو کیسے ڈراؤں ؟ خدا نے فرمایا: اے داؤد! گنہگاروں کو اس بات کی خوش خبری دو کہ میں توبہ قبول کروں گا اوران کے گناہوں کو معاف کردوں گا اور صدیقین کو ڈراؤ کہ اپنے اعمال پر اترائیں نہیں، کیونکہ کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کا محاسبہ کروں مگر یہ کہ وہ ہلاک ہو۔[۱]

بے شک خود پسندی اور خود بینی اخلاق اسلامی کی رو سے نہ صرف ایک غیر اخلاقی عمل ہے بلکہ اخلاقی رذائل کی ایک شاہراہ ہے اورجو تعبیریں دینی کتابو ںمیں اس کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں وہ اس مختصر کتاب کی گنجائش سے باہر ہیں۔[۲]

ج۔ خود پسندی کے اسباب:

اسلامی اخلاق کے عالمو ںنےخود پسندی کے بہت سے اسباب و عوامل ذکر کئے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین درج ذیل ہیں:

۱۔ جسمانی بنیاد پر خود پسندی، جیسے خوبصورتی، جسم کا تناسب، اس کی صحت اور اس کا قوی ہونا، خوش آواز ہونا ِاور اس کے مانند۔

۲۔ اقتداراور قدرت کے احساس کی بنا پر خود پسندی، جیسا کہ خدا وندعالم قوم عاد کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ لوگ اسی طرح کے توہم کا شکار ہوکر بولے: "ہم سے زیادہ قوی کون ہے[۳] ؟" اس طرح کی خود پسندی عام طور پر جنگ اور ظلم و ستم ایجاد کرتی ہے۔

۳۔ عقل ودانش، ذہانت و آگاہی اور دینی اور دنیوی امور کے بارے میں دقیق اور وسیع علم رکھنے کی بنیاد پر خود پسندی۔ اس طرح کی خود پسندی کا نتیجہ خود رائی، ہٹ دھرمی، مشورہ سے بے نیازی کا احساس، دوسروں کو جاہل خیال کرنا اور عالموں اور دانشوروں کی باتوں کو سننے سے پرہیز کرنا ہے۔

٤۔ انتساب کی وجہ سے خود پسندی یعنی باشرف نسب اور با عظمت بزرگوں کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر جیسے بنی ہاشم کی طرف منسوب ہونا اور سید ہونا یا بزرگ خاندان سے تعلق یا شاہان و سلاطین کی طرف انتساب۔ انسان کا ایسا خیال اپنے لئے لوگوں کی خدمت گذاری کی چاہت پیدا کرتا ہے۔

۱۔ اصول کافی، کلینی، ج۲، ص ۳۱٤، ح۸۔

۲۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۲۲۸تا ص ۲۳۵۔ کافی، ج ۲، ص ۳۱۳، ۳۱٤۔

۳۔ سورۂ فصلت، آیت ۱۵۔

۵۔ اولاد غلام، قبیلہ وخاندان، رشتہ دار اور پیروی کرنے والوں کی کثرت سے اترانا، چنانچہ خداوندعالم نے کافروں کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا ہے: " انہوں نے کہا ہماری دولت اور اولاد سب سے زیادہ ہے اور ہم عذاب میں بتلا نہیں ہوں گے" ۔[۱]

٦۔ ایسی خود پسندی جو مال و دولت کی فراوانی سے پیدا ہو۔ قرآن دومالکین باغ میں سے ایک کی زبانی نقل کرتا ہے: "میرا مال تم سے زیادہ ہے اور افراد کے اعتبار سے بھی میں تم سے قوی ہوں "[۲] اس نے اپنے مال و متاع کو اپنی جانب سے خیال کیا اور اسے اپنی برتری کا سبب جانا خداوند عالم نے بھی جو کچھ اسے دیا تھا چھین لیا مجموعی طور پر جب بھی انسان خود کو صاحب کمال خیال کرے، خواہ جیسے اس نے کمال سمجھا ہے واقعاً کمال ہو یا نہ ہو اور اس بات کو بھول جائے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے خدا کا دیا ہوا ہے اور اسی کی رحمت و توفیق سے میسر ہوا ہے تو یہ امر اس کے اندر خود پسندی کا سبب بن سکتا ہے، حتی اگر خدا کی عبادت اور تقویٰ سے فیضیاب ہونے اور خدا سے ڈرنے کا احساس بھی ہو۔[۳]

د۔ خود پسندی کے نقصان دہ اثرات: جیسا کہ اشارہ ہوا، خود پسندی بہت سی اخلاقی برائیوں کی کنجی ہے ذیل میں ان میں سے بعض اہم ترین برائیوں کی طرف اشارہ کررہے ہیں:

۱۔ خود پسندی "کبر" کا سرچشمہ نیز اس کے علاوہ بہت سے دوسرے رذائل کا بھی منبع ہے۔ اور کبر خود بینی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا ۔

۲۔ خود بینی گناہوں کے فراموش کرنے کا باعث ہے۔ اگر انسان اپنے بعض گناہوں کی طرف متوجہ بھی ہو، تو انھیں معمولی اورقابل مغفرت شمار کرکے ان کی تلافی کی کوشش نہیں کرتا۔

۳۔ خود پسند انسان خود بینی کے بالا ترین مراحل میں اپنے کو بہت زیادہ خدا سے نزدیک سمجھتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود کو عذاب الٰہی سے محفوظ جانتا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے اعمال کی اصلاح اور اس کے نقائص کو برطرف کرنے کی کوشش نہیں کرتا آخر کار اپنے اعمال کو ضائع کردیتا ہے۔

۱۔ سورۂ سبا ئ، آیت ۳۵۔

۲۔ سورۂ کہف، آیت ۳٤۔

۳۔ ملافیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج ٦، ص ۲۸۲تا ۲۸۹۔

٤۔ خود پسند انسان چونکہ خداوند عالم سے اپنے لئے کچھ مطالبات رکھتا ہے لہٰذا شکر گذاری اور قدر شناسی کو اپنا فریضہ نہیں سمجھتا اور اللہ کی نعمتوں کی نسبت نا شکرا ہو جاتا ہے۔

٥۔ خود پسند انسان چونکہ اپنے اعمال سے خوش بین رہتا ہے اس لئے وہ اپنی کمزوری اور احتیاج کا احساس نہیں کرتا نتیجہ یہ ہوتاہے کہ خود کو سوال کرنے اور مشورہ سے بے نیاز سمجھتا ہے۔

٦۔ خود پسند انسان چونکہ اپنے اندر کوئی کمی اور نقص اور عیب نہیں سمجھتا، لہٰذا خود کو دوسروں کی نصیحت اور خیر خواہی سے بے نیاز تصور کرتا ہے اور ان کی نصیحتوں پر توجہ نہیں کرتا۔ [۱]

٧۔ خود ستائی یعنی اپنی آپ تعریف کرنا خود پسندی کا ایک دوسرا اثر ہے۔ خود بین انسان کو جو بھی موقع ہاتھ لگتا ہے وہ صرف اپنی تعریف میں زبان کھولتا ہے اور جو کچھ اس سے متعلق ہے اسے اچھے عنوان سے ذکر کرتا ہے۔ [۲] جب کہ آدمی کا حسن اوراس کی خوبی یہ ہے کہ خود کو نقائص، عیوب، گناہوں اور خطاؤں سے بری نہ جانے اور ہمیشہ بارگاہ خداوندی میں اپنے جرم و گناہ کی معذرت کرتا رہے۔ قرآن کریم میں خود ستائی کی مذمت میں ارشاد ہوتا ہے: "لہٰذا اپنے آپ کو پاکیزہ خیال نہ کرو وہ اس انسان (کے حال) سے جس نے پرہیز گاری اختیار کی ہے زیادہ آگاہ ہے"۔ [۳]

ہ۔ خود پسندی کا علاج: ہر درد کا علاج اس کے اسباب و علل کو برطرف کرنا ہے، لہٰذا جو انسان اپنے حسن و جمال اور جسمانی صحت پر مغرور ہو گیا ہے، اسے چاہئے کہ وہ اپنے آغاز پیدائش اور اپنے انجام پر نظر کرے اور یہ جان لے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ سریع الزوال اورفانی ہے۔ صاحب قدرت کو معلوم ہوناچاہیے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ ایک روز کی بیماری میں نابود ہوجائے گا اور ہر آن اس بات کا امکان ہے کہ جو کچھ خدا نے اسے دیا ہے واپس لے لے گا۔ صاحب علم و عقل بھی جان لے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اللہ کی امانت ہے لہٰذا ممکن ہے کہ ایک معمولی حادثہ کے زیراثر اپنے تمام علم و شعور کو کھو دے۔ اسی طرح صاحبان حسب و نسب بھی جان لیں کہ دوسروںکے کمال کے سبب اظہار فضیلت و بلندی عین جہالت اور بیوقوفی ہے کیونکہ خدا کی بارگاہ میں کرامت وبزرگی تقویٰ وپرہیز گاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

١۔ المحجۃ البیضائ، ص٢٧٥، ٢٧٦ ملاحظہ ہو۔

٢۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ١، ص ٣٦٥، ٣٦٦۔

٣۔ سورئہ نجم، آیت ٣٢۔

مال ودولت کے مضر اثرات کے بارے میں غور وفکر کرنا کافی ہے تاکہ دولتمندوں کو خودپسندی کے خواب سے بیدار کردے۔ اہل عبادت اور تقویٰ کو بھی توجہ کرنی چاہیئے کہ عبودیت کی غایت خدا کے سامنے تواضع و انکساری کے سوا کچھ نہیں ہے اور عبودیت خودبینی، خودپسندی سے میل نہیں کھاتی ۔[1]

دوسری نظر۔ غرور

"غرور" جوکچھ نفسانی خواہشات کے موافق ہے اس کی نسبت قلبی سکون و اطمینان نیز انسانی طبیعت کا اس کی طرف مائل ہونا ہے۔ اس صفت کا سرچشمہ یا تو جہالت ہے یا شیطانی وسوسہ ہے۔ اس وجہ سے جو شخص اوہام اور شبہات کی بنیادپر خودکو خیر و صلاح پر تصور کرتا ہے حقیقت میں وہ دھوکہ کھاگیا ہے اور مغرور ہو گیا ہے، وہ اپنا اور اپنے امور کا صحیح اندازہ لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ جیسے کوئی حرام طریقہ سے مال حاصل کرے اور وہ اسے راہ خیر مثلاً مسجد بنانے، مدرسہ تعمیر کرنے اور بھوکوں کو سیر کرنے میں خرچ کرے اس خیال سے کہ وہ راہ خیر اور نیکی میں قدم اٹھا رہاہے، جب کہ وہ مغرور اور دھوکہ کھایا ہوا ہے۔ اس وجہ سے "غرور" کے دو اساسی رکن ہیں:

۱۔ جہل مرکب: یعنی اس کا قلبی اعتقاد یہ ہے کہ اس کا عمل نیک ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

۲۔ برخلاف اس کے کہ جو وہ ظاہر میں دعویٰ کرتا ہے اس کا اصلی سبب خیر و سعادت نہیں ہے، بلکہ خواہشات و غضب کی پیروی اور انتقام جوئی ہے۔ قرآن و روایات میں غرور کی شدت سے مذمت کی گئی ہے۔ قرآن اس سلسلہ میں انسان کو ہوشیار کرتا ہے: "تمہیں یہ دنیاوی زندگی دھوکہ ہرگز نہ دے اور شیطان تمہیں ہرگز مغرور (فریب خوردہ) نہ بنائے "۔[2] دوسری جگہ غرور کا سبب دنیا دوستی اور دنیا طلبی جانتا ہے: "دنیوی زندگی مایۂ فریب کے سوا کچھ اور نہیں ہے"۔[3] اگرچہ لوگوں کے تمام گروہوں میں فریب خوردہ اور مغرور لوگ پائے جاتے ہیں، لیکن بعض گروہ کچھ زیادہ ہی غرور میں مبتلا ہیں یا بعبارت دیگر بعض امور زیادہ تر غرور کا باعث بنتے ہیں۔ اسی وجہ سے علماء اخلاق سب سے اہم ان گروہوں کو جو غرور میں مبتلا ہوتے ہیں، درج ذیل گروہ جانتے ہیں:

الف۔ کفار:

کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا کا نقد آخرت کے ادھار سے بہتر ہے۔ اسی طرح دنیا کی یقینی لذت آخرت کی وعدہ شدہ لذت سے بہتر ہے۔

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۳۲۶ تا ۳۴۲۔ ۲۔ سورۂ لقمان، آیت ۳۳۔ اسی طرح ملاحظہ ہو سورۂ حدید، آیت ۱۴۔ ۳۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۵۔ سورۂ حدید، آیت ۲۰۔

ب۔ فاسق اور گناہگار مومنین:

کیونکہ یہ لوگ اس بہانہ سے کہ خداوندعالم عظیم اور وسیع رحمت کا مالک ہے، ان کے گناہ اس کے عفو و رحمت کے مقابل ناچیز ہیں، لہذا یقیناً رحمت خداوندی ان کے شامل حال ہوگی۔

ج۔ علمائ:

کیونکہ ممکن ہے کہ یہ تصور کریں کہ علم ودانش، نجات وکامیابی کا ذریعہ ہے اور یہ سونچ کر اپنے علم پر عمل نہ کریں۔

د۔ مبلغین اور واعظین:

کیونکہ شاید یہ گمان کریں کہ ان کی نیت لوگوں کی ہدایت ہے جب کہ وہ اپنے نفس کو راضی کرنے کے چکر میں ہیں اور اس راہ میں خلاف واقع امور کی دین کی طرف نسبت دینے سے بھی گریز نہ کریں۔

ہ۔ اہل عبادت اور عمل:

چونکہ ممکن ہے کہ حقیقت میں وہ ریا اور خود نمائی کر رہے ہوں، لیکن تصور کریں کہ ان کی غرض اللہ کی رضا اور اس کے معنوی تقرب کا حصول ہے۔

و۔ عرفان کے دعویدار افراد:

کیونکہ شاید یہ تصور کریں کہ صرف اہل معرفت کا لباس پہن کر اور ان کی اصطلاحیں استعمال کر کے (بغیر اس کے کہ وہ اپنی حقیقت اور باطن کو تبدیل کریں) سعادت و حقیقت تک پہونچ گئے ہیں۔

ز۔ مالدار اور ثروت مند افراد:

کیونکہ یہ لوگ کبھی راہ حرام سے تحصیل کر کے لوگوں کو دکھانے کے لئے امور خیریہ میں اس کا مصرف کرتے ہیں اور اس کو اپنی سعادت ونیک بختی کا ذریعہ سمجھ کر اپنے دل کو خوش رکھتے ہیں۔[1]

۲۔ تواضع

تواضع کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دوسروں کے مقابل اپنے امتیاز اور فوقیت کا قائل نہ ہو۔ کسی انسان میں اس حالت کا وجود باعث ہوتا ہے کہ دوسروں کو بزرگ اور مکرم سمجھے۔[2] تواضع کبر وتکبر کے مقابل ہے اور یہ دونوں تواضع کے لئے مانع کے عنوان سے زیر بحث واقع ہوں گے۔

ایک۔ تواضع کی اہمیت:

خدا وند عالم قرآن کریم میں تواضع وفروتنی کو اپنے واقعی مومن بندوں کی خصوصیات میں جانتا ہے اور فرماتا ہے:

"اور خدا وند رحمان کے بندے وہ لوگ ہیں جو روئے زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ونادان لوگ ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کا پیغام دیتے ہیں"[3]

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۳، ۳۳۔

۲۔ ایضاً، ج۱، ص۳۵۸، ۳۵۹۔

۳۔ سورۂ فرقان، آیت ٦٣۔ اسی طرح ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ، آیت ٥٤۔

دوسری جگہ خدا وند عالم پیغمبر اکرم سے فرماتا ہے: اپنے ماننے والونکے ساتھ خاضعانہ رفتار رکھیں:

"اور ان مومنین کے لئے جنہوں نے آپ کی پیروی کی ہے اپنے شانوں کو ان کے لئے جھکا دیجئے"[1] حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: خداوند عالم نے موسیٰ کو وحی کی: اے موسیٰ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اپنی تمام مخلوقات میں تم کو اپنے سے بات کرنے کے لئے کیوں انتخاب کیا؟ موسیٰؑ نے عرض کی: خدایا! اس کی علت کیا ہے؟ خدا نے جواب دیا: "اے موسیٰ! میں نے اپنے بندوں میں اپنے سامنے تم سے زیادہ کسی کو متواضع اور منکسر نہیں دیکھا۔ اے موسیٰ! جب تم نماز پڑھتے ہو تو اپنے رخسار کو خاک پر رکھتے ہو"۔[2]

رسول خدا نے اپنے اصحاب سے فرمایا: "کیا بات ہے کہ تم میں عبادت کی شیرینی نہیں دیکھتا؟" انہوں نے سوال کیا: عبادت کی شیرینی کیا ہے؟ فرمایا: "عاجزی وانکساری"۔[3]

دو۔ تواضع کی علامتیں: بعض روایات میں متواضع اور خاکسار انسان کے لئے نشانیاں بیان کی گئی ہیں اگر چہ یہ نشانیاں نمونہ کے طور پر ہیں اور اس کا مفہوم صرف انھیںنشانیوں میں منحصر ہونا نہیں ہے، انھیںنشانیوں میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱۔ متواضع اور خاکسار انسان بیٹھنے میں بزم کے آخری حصہ میں بیٹھتا ہے۔[4]

۲۔ متواضع انسان سلام کرنے میںدوسروں پر سبقت کرتا ہے۔[5]

۳۔ جنگ وجدال سے بازرہتا ہے خواہ حق اس کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔[6]

٤۔ وہ اس بات کو دوست نہیں رکھتا کہ اس کی پرہیزگاری کی تعریف کی جائے۔

تین۔ فروتنی کے موانع: کبر و تکبر، فخر و مباہات، تعصب، طغیانی و سرکشی، ذلت و رسوائی، فروتنی کے سب سے اہم موانع میں شمار ہوتے ہیں، اختصار کے ساتھ ان میں سے بعض کی توضیح دے رہے ہیں۔

الف) کبر:

فروتنی کی راہ میں سب سے بنیادی و اساسی مانع "کبر" ہے۔

۱۔ سورۂ شعرائ، آیت ۲۱۵۔ ۲۔ کافی، کلینی، ج۲، ۱۲۳، ح۷۔ ۳۔ ورام بن ابو فراس: تنبیہ الخواطر، ج۱، ص۲۰۱۔

٤۔ کافی، ج۲، ص ۱۲۳، ح۹۔ ۵۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج۷۵، ص۱۲۰، ح۹۔ ٦۔ ایضاً، ص۱۱۸، ح۳۔

کبر کا مفہوم:

کبریہ ہے کہ انسان عُجب و خود پسندی کے نتیجہ میں مقابلہ و مقایسہ کے موقع پر خود کو سب سے برتر اور بہتر خیال کرے اس وجہ سے کبر خود پسندی اور عُجب کا معلول ہے (یعنی کبر عُجب و خود پسندی کی وجہ سے وجود میں آتا ہے) اور اس ییٔں دوسروں سے مقایسہ پوشیدہ ہے۔ اگر خود کو بڑا اور برتر سمجھنے کی کیفیت ایک حالت کے عنوان سے فقط انسان کے اندر باطن میں پائی جائے تو اسے "کبر" کہتے ہیں، لیکن اگر خارجی اعمال و رفتار میں ظاہر ہو تو اسے "تکبر" کہتے ہیں، جیسے کسی کے ساتھ بیٹھنے یا کھانا کھانے سے پرہیز کرے، اور دوسروں سے سلام کا انتظار کرے اور گفتگو کرتے وقت مخاطب کی طرف نگاہ کرنے سے اجتناب کرے وغیرہ...۔(۱)

تکبّر کی مذمت:

خداوند عالم نے قرآن کریم میں ان لوگوں کی نسبت جو اللہ کی عبادت میں تکبّر کرتے ہیں، جہنم کا وعدہ دیا ہے "در حقیقت جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب وہ لوگ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں چلے جائیں گے"۔ (۲) دوسری جگہ اعلان کرتا ہے کہ سرائے آخرت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو زمین میں فوقیت و برتری کے خواہاں نہ ہوں: "اس دار آخرت کو ہم ان لوگوں سے مخصوص کردتے ہیں جو زمین یںفوقیت وبرتری اور فساد کے طالب نہ ہوں"۔ (۳)

تکبّر کی قسمیں:

جس کی نسبت تکبّر کیا جاتا ہے اس کے اعتبار سے تکبّر کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:

ایک۔ خداوندعالم کے مقابل تکبّر کرنا: جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: "جو انسان اس کی پرستش سے امتناع کرے اور کبر کا اظہار کرے عنقریب ان سب کو اپنی بارگاہ میں محشور کرے گا"۔ (٤)

دو۔ پیغمبر کے مقابل تکبّر کرنا:

پیغمبر کے مقابل تکبرّ اس معنی میں ہے کہ انسان اپنی شان و منزلت کو اس بات سے افضل وبرتر تصور کرے کہ آنحضرت کی دعوت اور فرامین پر گردن جھکائے ۔جیسا کہ قرآن کفار کے ایک گروہ کے بارے میں اس طرح فرماتا ہے: "آیا ان دو بشر پر جو کہ ہمارے ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں"۔ (٥)

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج۱، ص ۳٤٤۔ ۲۔ سورۂ مومن، آیت ٦۰۔ ۳۔ سورۂ قصص ۸۳۔ جاثیہ ۳۷۔ اعراف ۱۳، ۱٤٦۔ ص ۷۳، ۷٤۔ سورۂ اسرائ، آیت ۳۷۔ لقمان ۱۸۔ فرقان ٦۳۔ نحل ۲۹ اور ۲۳۔ غافر، آیت ۳۰، ٥٦، ٦۰۔ انعام، آیت ۹۳، سورۂ زمر، آیت ۷۲۔

٤۔ سورۂ نسائ، آیت ۱۷۲۔ سورۂ مریم، آیت ٦۹۔ نحل، آیت ۲۳۔ ٥۔ سورۂ مومنون، آیت ٤۷۔

تین۔ لوگوںکے مقابل تکبرّ: یعنی خود کو عظیم اور دوسرے لوگوں کو معمولی اور ذلیل و خوار سمجھنا۔ ایک روایت میں اس طرح کے تکبرّ کو واقعی جنون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [1]

تکبرّ کا علاج:

علماء اخلاق نے تکبرّ کے علاج کے لئے علمی اور بعض عملی راہیں بتائی ہیںکہ وہ اسباب تکبرّ سے اجتناب یا ان کا برطرف کرنا ہے۔ چونکہ حقیقت میں تکبرّ کے اسباب وہی خودپسندی کے اسباب ہیں، لہذا جو کچھ خودپسندی کے علاج سے متعلق بیان کیا گیا ہے، وہی تکبرّ کے علاج کے لئے بھی کار آمد ہوگا۔

ب) ذلت وخواری:

جس طرح بزرگ طلبی اور برتری جوئی (کبر وتکبرّ) تواضع کے لئے مانع ہے اسی طرح ذلت وخواری بھی تواضع کے لئے مانع ہے اور عزت نفس سے بھی منافات رکھتی ہے اگر تکبرّ اپنی اہمیت جتانے میںافراط اورزیادتی تو ذلت خواری بھی اس امر میں تفریط ہے [2] اسی بنیاد پراخلاق اسلامی میں متکبرّین کے مقابل تواضع اور خاکساری کرنے کو شدت کے ساتھ منع کیا گیاہے کیونکہ متکبرّ انسان ہرطرح کی خاکساری و فروتنی کو مقابل شخص کی پستی اورخواری شمار کرتا ہے۔ [3]

۱۔ شیخ صدوق، خصال، ص ۳۳۲، ح ۳۱۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۳۶۲۔

۳۔ ورام بن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ج ۱، ص ۲۰۱ ملاحظہ ہو۔

تیسری فصل: مؤثر نفسانی صفات

د۔ نفس کی توجہ آئندہ کی نسبت

اخلاق اسلامی کے مفاہیم میں سے بعض یہ ہیں جو انسان کے نفس کی توجہ کو آئندہ سے متعلق بتاتا ہے۔ سب سے پہلے آئندہ کے متعلق نفس کے پسندیدہ رجحان پھر اس کے بعد اس کے موانع کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

۱۔ آئندہ کی نسبت نفس کا مطلوب رجحان

یہ رجحان درج ذیل شرح کے ساتھ چند مفاہیم کے قالب میں بیان ہوگا:

الف۔ حزم:

حزم لغت میں محکم و استوار کام کرنے اور امور کو متقن و محکم بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔[۱] روایات میںبھی حزم اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس کے مصادیق کثرت سے بیان کئے گئے ہیں، منجملہ آج کی اصلاح، کل کا تدارک، آج کا کام کل پر نہ چھوڑنا، موت کے لئے آمادہ رہنا، ضد اورہٹ دھرمی نہ کرنا، صاحبان نظر سے مشورہ کرنا، کسی چیز کے طے کرنے میں قاطعیت کا اظہار، مشکوک امور میںتوقف کرنا، احتیاط اور عاقبت اندیشی۔ اس طرح سے آئندہ کے بارے میں غورو خوص کرنا اور دور اندیشی حزم کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے قریب وبعید مستقبل کا تدارک مطلوب صورت میں اسلام کے عالی اخلاقی فضائل میں شمار ہوتا ہے اس سے اخلاق اسلامی کی اصل کتابوں میں حزم کو چالاکی،[۲] ایک نوع سرمایہ اورپونجی،[۳] ہنرمندی[٤] جیسے اوصاف سے یاد کیا گیا ہے اور مومنین کے اوصاف میں سے ایک وصف شمار کیا گیا ہے۔

۱۔ ابن اثیر، نہایہ، ج۱، ص۳۷۹۔

۲۔ شیخ صدوق، خصال، ج۲، ص۵۰۵، ح۳۔

۳۔ غرر الحکم، ح۹۔

٤۔ ایضاً، ح۱۱۷۔

[1] خلاصہ یہ کہ آئندہ کی نسبت نفس کی مطلوب توجہ (حزم) یہ ہے کہ پہلے اپنے کل کی حالت اور ان حوادث وواقعات کو جو آئندہ پیش آئیں گے منجملہ ان کے اپنی موت وزندگی کو نظر میں رکھے۔ دوسرے آج کی اپنی خواہشات ومیلانات کو کل کی بہ نسبت آمادہ کرے۔

ب۔ آرزوؤں کو کم کرنا:

کل ہمارے آج کی آرزوؤں کا بستر ہے، سارے انسان جس مقدار میں اپنی بقا و زندگی کے لئے آئندہ امید رکھتے ہیں اسی قدر اپنی آرزوؤں کے دائرہ کی نقشہ کشی کرتے ہیں۔ نیز کبھی کبھی آدمی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا دامن اس کی آئندہ زندگی کے دوران کی نسبت امید کو تحت تاثیر قرار دیتا ہے۔ بہر صورت یہ دونوں عامل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں، اخلاق اسلامی میںکوشش کی گئی ہے کہ انسان کی آرزوئیں اور اس کی امیدیں کو اس کی باقی بچی عمر کی نسبت فطری حقیقتوں اور گراں قیمت اخلاقی معیاروں کے مطابق شکل اختیار کرے۔ ایک طرف انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ آئندہ زندگی کے لئے کوئی اطمینان و ضمانت نہیں ہے اور ہردن اور ہر آن ممکن ہے کہ اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہو لہذا اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے دنیوی مطالبات وخواہشات اور آخرت کے لئے اپنی ضرورتونکو انھیںواقعیتوں کی بنیاد پر استوار کرے۔ دوسری طرف ا سے یاددلاتا ہے کہ اپنی ہمت کو بلند رکھے اور اپنی انسانی منزلت کا کھانے پینے، سونے اور زودگذر لذتوں، اعتباری منصبوں نیزا یسے لوگوں کی تعریف و توصیف سے جو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں، سودا نہ کرے۔

اخلاق اسلامی کی تاکید آرزوؤں کو کم کرنے کے سلسلہ میں اسی ہدف کی تکمیل کے پیش نظر ہے، کیونکہ علماء اخلاق کے بقول، طولانی آرزوؤنکی بنیاد دو چیزیں ہیں: ایک طولانی عمر پر اعتقاد اور دوسرے طویل مدت تک دنیوی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کی رغبت۔ اس بنا پر طولانی آرزوئیں ایک طرف انسان کی جہالت اور اس کی موت سے غفلت کا باعث ہیں اور دوسری طرف دنیا سے لگاؤ اور محبت کا باعث ہیں۔ [2] یہ دونوں نہ تنہا رذیلت ہیں، بلکہ بہت سے اخلاقی رذائل کی کنجی ہیں۔ آیات وروایات میںطولانی و دراز آرزوؤں کی مختلف انداز سے مذمت کی گئی ہے۔ خداوند جبار نے حضرت موسیٰ سے فرمایا: "اے موسی! دنیا میں دراز آرزوئیں نہ رکھو کہ سخت دل ہوجاؤ گے اور سخت دل انسان مجھ سے دور ہے"۔[3]

١۔ کلینی، کافی، ج۲، ص۲۲، ۲۲۹۔ ۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ص۳۲، ۳۵۔ ۳۔ شیخ کلینی، کافی، ج۲، ص ۳۲۹، ح۱۔

حضرت علی نے فرمایا: "جو شخص یقین رکھتا ہے کہ ایک دن اپنے دوستوں سے جدا ہوجائے گا اورخاک کے سینہ مینچھپ جائے گا اور اپنے سامنے حساب وکتاب رکھتا ہے اور جو کچھ اس نے چھوڑا ہے اس کے کام نہیں آئے گا اور جو کچھ اس نے پہلے بھیجا ہے اس کا محتاج ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ آرزؤوں کے رشتہ کو کوتاہ اور عمل کے دامن کودراز کرے"[1] حضرت امام محمد باقر نے بھی فرمایا ہے: "آرزو کو کم کرکے دنیا سے رہائی کی شیرینی حاصل کرو"۔ [2]

ج۔ موت کی یاد:

اسلام کے تربیتی اخلاق میں بہت کارآمد وسیلہ ہے وادی معرفت کے سالک اور محبت پروردگار کے کوچہ کے دلدادہ افراد نے موت کی یاد سے متعلق قیمتی تجربے ذکر کئے ہیں، نیز آیات وروایات میں بھی ذکر موت، تربیت اخلاقی میں ایک مفید حکمت عملی اور تدبیر کے عنوان سے موردتاکید واقع ہوا ہے۔جیسا کہ کہا گیا ہے: طولانی عمر سے استفادہ کرنے کا یقین درازمدت آرزؤونکے ارکان میں سے ہے جو کہ دنیا سے محبت اور ذخیرہ آخرت سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ اخلاق اسلامی اپنے بہت سے ارشادات سے "یادمرگ" کی نسبت اور اصل موت اور اس کے ناگہانی ہونے کے بارے میں دائمی نصیحت سے، ہمارے نفسانی رجحان کو کل کی نسبت ہمیں آمادہ کرتے ہے۔ ہماری کل کی زندگی کی امیدوں کی تصحیح کرکے ہمارے موقف اور ہماری رفتار کو آج کی نسبت بھی اصلاح کرتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر۔نقل فرماتے ہیں کہ لوگوںنے پیغمبر اکرم سے سوال کیا: سب سے زیادہ چالاک مومنوں میں کون ہے ؟ رسول خدا نے جواب دیا: وہ انسان جوسب سے زیادہ موت کو یاد کرے اور سب سے زیادہ خودکو موت کے لئے آمادہ کرے۔ [3]

حضرت علی۔نے فرمایا: جب تمہارے نفوس تمہیں خواہشات اور شہوات کی جانب کھینچیں، تو موت کو کثرت سے یاد کرو کیونکہ موت سب سے بہتر واعظ ہے رسول خدا اپنے اصحاب کو موت کی یاد کی بہت زیادہ تاکید فرماتے تھے اور فرماتے تھے: موت کا کثرت سے ذکر کرو، کیونکہ وہ لذتوں کو درہم برہم کرنے والی اور تمہارے اور تمہارے خواہشات کے درمیان حائل چیز ہے۔ [4]

۱۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج۷۳، ص ۱٦۷، ح ۳۱۔

۲۔ حرانی، تحف العقول، ص ۲۸۵۔

۳۔ شیخ کلینی، کافی، ج۳، ص ۲۵۸ز۔

٤۔ شیخ طوسی، امالی، ص ۲۸، ح ۳۱۔

د۔ بلند ہمتی:

آرزوؤں کے کوتاہ کرنے اور موت کے انتظار کی ضرورت کا ذکر ہونے کے بعد ممکن ہے کہ یہ تصور پیش آئے کہ بلند آرزوؤں کا فاقد انسان، مستقبل کے لئے سعی و کوشش کا کوئی سبب اور تدبیر، دور اندیشی اور محرّک نہ رکھے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طرف اگرچہ اسلام آرزوؤں کے کوتاہ کرنے کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف انسان کی امید اور بلند ہمتی کو گراں قیمت الٰہی آرزوؤں اور امیدوں کی سمت موڑ دیتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ بلند ہمت افراد کی مذمت کرتا نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اخلاقی فضیلت بتاتا ہے اور بلند ہمتی کو خدا کی دوستی اور محبت کی طلب میں جانتا ہے، جیسا کہ حضرت امام زین العابدینؑ خدا سے مناجات کرتے وقت فرماتے ہیں: "خدایا! مجھے روحانی جسم، آسمانی دل اور ایسی ہمت جو مسلسل تجھ سے وابستہ ہو اور اپنی محبت میں صادق یقین عطا فرما۔ "[۱] دوسری مناجات یہ بیان کرتے ہیں: اے وہ ذات! جس نے عارفین کو طولِ (یا عطرِ) مناجات سے مانوس کیا اور خائفین کو ولایت و دوستی کا لباس پہنایا، کب خوش ہوگا وہ انسان جس کی ہمت تیرے علاوہ دوسرے کی طرف متوجہ ہو اور کب وہ انسان آرام محسوس کرے گا جو تیرے علاوہ دوسرے کا عزم و ارادہ رکھتا ہے۔ معلوم ہوا سعادت وکمال حاصل کرنے کی راستہ میں سعی وکوشش اور بلند ہمت کی اسلام میں نہایت تاکید کی گئی ہے کہ جس کا راستہ اسی دنیا سے گذرتا ہے اور بہت سے دنیاوی عطیوں سے استفادہ کرنا اور بہرہ مند ہونا اس تک پہونچنے کی شرط ہے۔پیغمبر اسلام ان دونوں کے درمیان (جو بظاہر متعارض ہیں) جمع کرنے کے عنوان سے فرماتے ہیں: "اپنی دنیا کے لئے اسی طرح کام کروکہ گویا ہمیشہ زندہ رہوگے اور اپنی آخرت کے لئے اسی طرح کام کروکہ گویا کل مرجاؤگے۔ "[۲]

۲۔ موانع

سب سے اہم موانع جو کل کی نسبت نفس کے مطلوب رجحان کے مقابل ہیں،درج ذیل ہیں:

الف۔ طولانی آرزوئیں:

دراز آرزوویں عام طور پر آئندہ سے متعلق انسان کو غیر واقعی تصویر دکھاتی ہیں، انسان کی دنیا سے محبت اور اس کی خوشیوں پیۃاضافہ کرتی ہیں اور دنیاوی محبت بھی دسیوں اور سیکڑوں اخلاقی رذیلتوں کا باعث ہے جیسا کہ رسول خدا نے فرمایا: "حب الدنیا رأس کل خطیئۃ"[۳] "دنیا سے دلبستگی تمام گناہوں کی اصل و اساس ہے۔ " اسی بنیاد پر دراز آرزوؤں کی شدت کے ساتھ ملامت کی گئی ہے۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۱۹۹۔ ۲۔ ورام بن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ج۲، ص۲۳٤؛ شیخ صدوق، فقیہ، ج ۳، ص ۱۵٦، ح ۳۵٦۹؛ خزار قمی، کفایۃ الاثر، ص ۲۲۸؛ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ٤٤، ص ۱۳۹، ح٦۔ ۳۔ شیخ صدوق، خصال، ج ۱، ص ۲۵، ح ۸۷؛ حرانی، تحف العقول، ص۵۰۸۔

قرآن کریم ایک گروہ کی مذمت میں فرماتا ہے: "انہیں چھوڑ دو تا کہ کھائیں اور مزے اڑائیں اور امیدیں انھیں غفلت میں ڈالے رہیں، عنقریب وہ جان لیں گے"۔ [۱]

اسی طرح طولانی خواہشات انسان کو "تسویف" میں مبتلا کرتی ہیں یعنی انسان ہمیشہ پسندیدہ امور کو کل پر ٹالتا رہتا ہے۔ حضرت علیؑ اپنے اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "دنیا کو چھوڑ دو کہ دنیا کی محبت اندھا، بہرہ، گونگا اور بے حال بنادیتی ہے۔ لہذا جو کچھ تمہاری عمر کا حصہ باقی بچا ہے اس میں گذشتہ کی تلافی کرو اور کل اور پرسوں نہ کہو (ٹال مٹول نہ کرو) اس لئے کہ تم سے پہلے والے جو ہلاک ہوئے ہیں لمبی آرزوؤں اور آج اور کل کرنے کی وجہ سے، یہاںتک کہ اچانک ان تک فرمان خداوندی آپہنچا (انھیں موت آگئی) اور وہ لوگ غافل تھے"۔ [۲]

ب۔ پست ہمتی:

پست ہمتی انسان کو بلند مقامات اور عالی اہداف و مقاصد تک پہونچنے سے روک دیتی ہے،

آئندہ کے بارے میں غور وفکر اور عاقبت اندیشی کی نوبت نہیں آنے دیتی اور صرف آج کی فکر اور وقتی فائدہ حاصل کرنے کی عادی بنادیتی ہے۔ آئندہ کی سعادت اور اس کے خوشگوار ہونے کی فکر کرنا اور ابھی سے کل کی مشکلات کا استقبال کرنا بلند ہمت اور عظیم روح کے مالک افراد کا ہنر ہے، اپنے مستقبل کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں روشن اور درخشاں دیکھنا اور ابھی سے مستقبل کے لئے چارہ اندیشی کرنا بلند ہمت افراد کی شان ہے۔ اس وجہ سے مستقبل کی نسبت اور آج سے کل کی اصلاح کے متعلق نفس کے پسندیدہ رجحان کے لئے ایک مانع کے عنوان سے پست ہمتی کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے۔ منجملہ ان کے حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "تین چیزیں انسان کو مقامات عالیہ اور بلند اہداف تک پہونچنے سے روک دیتی ہیں: پست ہمتی، عدم تدبیر، غور وفکر میں تساہلی۔ [۳]

۱۔ سورۂ حجر، آیت ۳۔

۲۔ شیخ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۳۶، ح۲۳۔

۳۔ حرانی، تحف العقول، ص۳۱۸۔

ہ۔ دنیوی نعمتوں کی طرف نفس کا رجحان

انسان کے بہت سے اعمال ورفتار دنیا کی نسبت ان کے نفسانی رجحان سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ رجحان بہت سے نفسانی صفات اور ملکات کی پیدائش کا سرچشمہ ہے ایسا لگتاہے کہ اخلاق اسلامی میں مواہب دنیوی کی نسبت نفسانی مطلوب کا رجحان زہد کے محور پر گھومتا ہے اور وہ تمام عام مفاہیم جو اس باب میں ذکر ہوئے ہیں جیسے قناعت، عفت، حرص، طمع و حسرت وغیرہ ان سب کو زہد کی بنیاد پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

زہد

ایک۔ زہد کا مفہوم

ارباب لغت کی نظر میں کسی چیز کی نسبت زہد اختیار کرنے کے معنی اس چیز سے اعراض اور اس سے بہت کم خوش ہونا ہے۔ [۱] علماء اخلاق کے فرہنگ میں "زہد" نام ہے دنیا سے قلبی اور عملی اعتبار سے کنارہ کشی اور اعراض کرنے کا مگر اتنی ہی مقدار میں جتنی انسان کو اس کی ضرورت ہے۔

بعبارت دیگر زہد یعنی آخرت کے لئے دنیا سے روگردانی اور خدا کے علاوہ ہر چیز سے قطع رابطہ کرنا ہے۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً، زہد اس شخص پر صادق آتا ہے جس کے یہاں دنیا کے تحصیل کرنے اور اس سے بہرہ مند ہونے کا امکان پایا جاتا ہو۔ دوسرے، دنیا سے روگرداں ہونا آخرت کی بہ نسبت دنیا کی پستی اور حقیر ہونے کے اعتبار سے۔ جب بھی دنیا کا ترک کرنا امکان تحصیل نہ ہونے کی وجہ سے ہو (یعنی دنیا کی تحصیل کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہ ہو) یا خدا کی رضایت اور تحصیل آخرت کے علاوہ کوئی اور ہدف و مقصد ہو جیسے لوگوں کی خوشنودی اور دوستی جذب کرنے کے لئے ہو یا اس کی تحصیل میں سختی اور مشقت سے فرار کرنے کی وجہ سے ہو تو اسے "زہد" نہیں کہا جائے گا۔ [۲]

۱۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص ۳۸٤؛ ابن منظور، لسان العرب، ج ۳، ص ۱۹٦ اور ص ۱۹۷۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادت، ج ۲ ص ٥٥ اور ص ٥٦۔

دو۔ زہد کی اہمیت

آیات و روایات میں زہد اختیار کرنے کی نسبت جو تعبیریں وارد ہوئی ہیں نیز وہ علائم جو اس نفسانی صفات کے لئے بیان کئے گئے ہیں سب کے سب اسلام کے اخلاقی نظام میں دنیا کی نسبت اس کے بلند و بالا مرتبہ کو بیان کرنے والے ہیں۔

جیسا کہ پیغمبر اکرم نے فرمایا: "دنیا میں زہد اختیار کرنا جسم و دل کے سکون کا باعث ہے"۔ [۱] حضرت امام جعفر صادق۔نے بھی فرمایا ہے: "دنیا سے بے رغبتی اور بے توجہی آخرت کی جانب متوجہ ہونے کے لئے دل کی فراغت و سکون کا باعث ہے"۔ [۲] خلاصہ یہ کہ پیغمبر اکرم اعلان فرماتے ہیں: "دنیا سے بے توجہ ہوئے بغیر تمہارے دلوں پر ایمان کی چاشنی حرام ہے"۔ [۳]

تین۔ زہد کے مراتب اور درجات

علماء اخلاق نے مختلف اعتباروں سے زہد کے انواع اور درجات ذکر کئے ہیں، اختصار کے ساتھ ہم انھیںذکر کررہے ہیں۔

۱۔ زہد کے شدت و ضعف کے اعتبار سے مراتب:

زہد کو دنیا سے کنارہ کشی کی شدت و ضعف کے اعتبار سے تین درجوں تقسیم کرتے ہیں:

الف۔ انسان دنیا سے روگرداں ہے اس حال میں کہ اس کی طرف مائل ہے اور حقیقت میں زحمت، مشقت اور تکلّف کے ساتھ خود کو دنیا سے دور کرتا ہے۔

ب۔ انسان خواہش، رغبت اور آسانی کے ساتھ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کی طرف کوئی میلان ہو کیونکہ اس کی نظر میں دنیا اخروی لذتوں کے مقابل حقیر و پست ہے، در حقیقت اس نے ایک ایسے معاملہ کا اقدام کیا ہے جس میں معمولی اور کم اہمیت چیز کو اس سے قیمتی جنس کی امید میں چھوڑ دیا ہے لیکن اس معاملہ سے وہ راضی و خوشنود ہے۔

۱۔ شیخ صدوق خصال، ص۷۳ ح ۱۱٤۔

۲۔ کافی، کلینی، ج ۲، ص ۱٦، ح ۵۔

۳۔ کافی، ص ۱۲۸، ح ۲۔

ج۔ زہد کا سب سے بلند درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہش اور شوق سے دنیا کو ترک کرے اور کبھی کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے کا احساس نہ کرے۔یعنی احساس نہ کرے کہ کوئی معاملہ ہوا ہے، اسی طرح جیسے کوئی ایک مشت خاک کو چھوڑ دے تاکہ یاقوت حاصل کرے، وہ کبھی احساس نہیں کرتا کہ کوئی چیز اس نے قیمتی چیز کے مقابل گنوائی ہے اور کوئی معاملہ کیا ہے۔

۲۔ زہد کے مراتب اعراض کی جانے والی چیزوں کے اعتبار سے:

اس اعتبار سے زہد کے چند درجے درج ذیل بیان کئے گئے ہیں:

الف۔ محرَّمات سے اعراض کرنا ؛یعنی محرَّمات سے دوری اختیار کرنا کہ جسے " واجب زہد" کہتے ہیں۔

ب۔ شبہوںسے اعراض کرنا اور ان کی نسبت زہد اختیار کرنا جو کہ انسان کو ارتکاب گناہ اور محرمات سے سالم رکھنے کا باعث ہیں۔

ج۔ حلال چیزوں سے ضرورت سے زیادہ مقدار کی نسبت زہد اختیار کرنا، یعنی غذا، پوشاک، رہائش، زندگی کے ساز و سامان وغیرہ میں اور ان کو حاصل کرنا کے اسباب و ذرائع جیسے مال وجاہ میں ضرورت بھر پر اکتفا کرنا۔

د۔ زہد اختیار کرنا ان تمام چیزوں کی نسبت کہ جو نفس کی لذت کا باعث ہوتے ہیں، حتیٰ کہ دنیا سے ضرورت بھرچیزوں میں بھی اس معنی میں کہ ضروری مقدار سے فائدہ اٹھانا اور فیضیاب ہونا بھی اس کی لذت کے لئے نہ ہو، نہ یہ کہ دنیا کی ضرورت بھر چیزوں کو بھی ترک کردے کہ اصولی طور پر ایسی چیز کا امکان ہی نہیں ہے۔ زہد کا یہ درجہ اور اس سے ماقبل تیسری قسم حلال میں زہد اختیار کرنا ہے۔

رسول خدا نے فرمایا: "وہ لوگ مبارک وخوشحال ہیں جو خدا کے سامنے فروتنی کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے لئے حلال کیا گیا ہے اس میں زہد اختیار کرتے ہیں بغیر اس کے کہ وہ میری سیرت سے رو گرداں ہوں"۔ (۱)

ہ۔ جو کچھ خدا کے علاوہ ہے اس سے روگرداں ہونا، حتیٰ خود سے بھی، لیکن بعض اشیاء کی طرف بقدر ضرورت توجہ جیسے خوراک، پوشاک اور لوگوں سے معاشرت زہد کے اس درجہ سے منافات نہیں رکھتی، کیونکہ خداوند رحمان کی جانب توجہ انسان کے زندہ اور باقی رہے بغیر ممکن نہیں ہے اور انسان کی زندگی کے لئے ضروریات حیات ضروری ہیں۔

۱۔ کافی، ج۸، ص۱۶۹، ح ۱۹۰ ۔ حرانی، تحف العقول، ص۳۰۔ اسی طرح ملاحظہ ہو صدوق، فقیہ، ج٤، ص ٤٠٠، ح ٥٨٦١، اور تفسیر عیاشی، ج۲، ص ۲۱۱، ح٤۲۔

جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق سے منقول ہے: "زہد جہنم سے برائت اور جنت کے دروازہ کی کنجی ہے اوروہ ہر اس چیز کا ترک کرنا ہے جو انسان کو خدا سے غافل کردے، دنیا کے گنوادینے پر افسوس نہ کرنا اور اس کے ترک کردینے پر خود پسندی میں بتلانہ ہونا ہے"۔ (۱) حضرت علی زہد کی تعریف کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: "سارا زہد قرآن کے دو کلموں میں جمع ہے، خداوند سبحان نے فرمایا ہے: "تاکہ جو کچھ تمہارے ہاتھوںسے چلا ہو گیا ہے اس پر افسوس نہ کرواور جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے اس پر شادمان اور مسرور نہ ہو" (۲) اور جو شخص گذشتہ پرافسوس نہ کرے اور آئندہ پر مسرور نہ ہو تو اس نے دو طرف سے زہد اختیار کیا ہے"۔ (۳)

۳۔ زہد کے مراتب اس چیز کے اعتبار سے کہ انسان جس کی طلب میں دنیا سے روگرداں ہوتا ہے:

اس وجہ سے زہد کے درج ذیل تین درجے ہیں:

۱۔ خداترس لوگوں کا زہد: انسان آتش جہنم سے نجات اور اخروی عذاب سے بچنے کے لئے دنیا سے روگرداں ہوتا ہے۔

۲۔ امید واروں کا زہد: یعنی دنیا سے اس امید میں روگرداں ہونا کہ خدا کا ثواب اور جنتی نعمتیں حاصل ہوں۔

۳۔ عرفاء کا زہد: نہ ہی درد والم کی طرف توجہ رکھتا ہے تاکہ اس سے نجات طلب کرے اور نہ ہی لذتوں کی اعتناء کرتا ہے تاکہ ان سے فیضیابی کا طالب ہو۔ بلکہ صرف اور صرف خدا سے ملاقات اور اس کے دیدار کا اشتیاق رکھتاہے۔ ایسا زہد صرف اہل معرفت کی شان ہے ۔(٤)

جو کچھ زہد کی تعریف اور اس کے درجات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اس کے اعتبار سے معلوم ہوتاہے کہ دنیا سے مرادصرف مال وثروت، خوراک وپوشاک نہیں ہے، کیونکہ ان تمام امور سے اعراض ایسے افراد کے لئے جو شہرت کے طالب اورپارسائی کی تعریف کو دوست رکھتے ہیں۔ بہت آسان ہوجائے گا بلکہ دنیا تمام مرتبہ وریاست نیز وہ تمام نفسانی استفادے جو دنیا سے ممکن ہیں سب کو شامل ہے۔ حقیقی زہد یعنی مال و مرتبہ سے بے تعلق ہونا اوراس سے روگرداں ہونا ہے۔ سچا زہد وہ ہے جس کی نظر میں فقر و غنا، تعریف و برائی، عزت وذلت جو لوگوں کے نزدیک پائی جاتی ہیں، سب یکساں ہوں، اور وہ صرف محبت خداوندی اور رضائے الٰہی کا طالب ہو۔

۱۔ گیلانی، عبدالرزاق، مصباح الشریعۃ، ص ۱۳۷۔

۲۔ بقرہ ۲۳۷۔ ۳۔ نہج البلاغہ حکمت ٤۳۹ اسی طرح ملاحظہ ہو: کافی، ج۲، ص ۱۲۸، ح٤۔ شیخ صدوق، امالی، ص ۷۱٤، ح ۹۸٤ ۔ خصال، ص۴۳۷، ح ۲٦۔

٤۔ نراقی، جامع السعادات، ج ۲، ص ٦۵ تا ص ۷٤ ۔ فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، ج۷، ص ۳۵۷ تاص۳٦٤۔

چار۔ زہد کے علائم

زہد کے بعض اہم علائم کہ جو اپنی جگہ پر خود بھی ایک عام اخلاقی مفہوم ہیں، درج ذیل ہیں۔

۱۔ قناعت:

عربی ادب میں بخشش کی معمولی مقدار پر راضی ہونے[۱] اور اپنے سہم پر رضایت دینے کے معنی میںہے[۲] اخلاق اسلامی کے مشہور مآخذ میں "قناعت" "حرص" کے مقابل استعمال ہوئی ہے اور اس سے مراد وہ نفسانی ملکہ ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی ضرورت بھر اموال پر راضی اور خوش رہتا ہے اور خود کو اس سے زیادہ کی تحصیل کے لئے زحمت و مشقت میں بتلا نہیں کرتا۔[۳]

قناعت کے خود بہت سے مفید علائم ہیں اور دوسری طرف بہت سے اخلاقی رذائل بلکہ حقوقی جرائم سے بچنے کا ذریعہ ہے، اسی وجہ سے اسلام کے اخلاقی نظام میں اس کی تشویق وترغیب کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا: "اور خبردار ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو جو زندگانی دنیا کی رونق سے مالا مال کردیا ہے اُس کی طرف آپ نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں کہ یہ اُن کی آزمائش کا ذریعہ ہے اور آپ کے پروردگار کا رزق ہی بہتر اور پائدار رہے"۔[٤] حضرت علی ـ قناعت کی اہمیت کے بارے میںفرماتے ہیں: "میں نے تونگری تلاش کی لیکن اسے قناعت کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا۔ لہٰذا قانع رہو تاکہ مالدار و تونگر ہو جائو "[٥]

قناعت نہ یہ کہ صرف خود اخلاقی فضیلت ہے، بلکہ بہت سے اخلاقی اقدار کی حامل ہے۔ امام علی رضا سے جب کسی نے قناعت کی حقیقت کے بارے میںسوال کیا تو آپ نے جواب میں اس کے علائم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "قناعت اپنی ضبط نفس، عزّت وبلندی، حرص و طمع کی زحمت سے آسودہ ہونے اور دنیا پرستوں کے مقابل بندگی کا باعث ہے۔ دو انسان کے علاوہ کوئی قناعت کا راستہ طے نہیں کرسکتا ہے: ایسا عبادت گذار جو آخرت کی اجرت کا خواہاں ہے، یا ایسا بزرگ و شریف انسان جو پست لوگوں سے دوری اختیار کرتا ہے۔[٦]

۱۔ ابن اثیر، نہایۃ، ج٤، ص ١١٤ ۔ ٢۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ٨، ص ٢٩٨۔

٣۔ نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج٢، ص ١٠١ ۔ ٤۔ سورۂ طہٰ: آیت ١٣١۔

٥۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ٦٩، ص ٣٩٩، ح ٩١۔ ٦۔ بحار الانوار، ج٧٨، ص ٣٤٩، ح٦۔

درحقیقت انسان دنیا میں قناعت اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رکھتا ورنہ وہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص و ہوس اور حسرت و یاس کی آگ میں جلتا رہے گا۔ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق۔ سے شکوہ کیا کہ روزی حاصل کرتا ہے لیکن قانع نہیں ہوتا اور اس سے زیادہ کا خواہش مند رہتا ہے اور اس نے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز سکھائیے جس سے میری مشکل حل ہوجائے تو حضرت نے فرمایا:" اگر اس قدر جو تیرے لئے کافی ہو اور تجھے بے نیاز کردے تو دنیا کی تھوڑی سی چیز بھی تجھے بے نیاز کردے گی اور اگر جو کچھ تیرے لئے کافی ہے وہ تجھے بے نیاز نہ کر سکے تو پھر پوری دنیا بھی تجھے بے نیاز نہیں کر سکے گی"۔ (۱)

لیکن کس طرح قناعت کو اختیار کیا جا سکتا ہے ؟ عام طریقوں کے علاوہ بعض خاص طریقے بھی ذکر کئے گئے ہیں، منجملہ ان کے حضرت امام جعفر صادق۔ اس سلسلہ میںراہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اپنے سے کمزور تر انسان کو دیکھو اور اپنے سے مالدار تر کو نہ دیکھو، کیونکہ یہ کام تمہیں اس چیز پر جو تمہارے لئے مقدر کیا گیا ہے، قانع کردے گا"۔ (۲)

۲۔ لوگوں کے اموال سے بے نیازی اور عفت:

عربی ادب میں " عفّت " نا پسند امور اور شہوتوں کے مقابل صبر وضبط کرنے کو کہتے ہیں ۔ (۳)

جنسی عفّت اور کلام میں عفّت کے علاوہ عربی ادب اور دینی کتابوں میں دوسروں سے اظہار درخواست کرنے سے پرہیز کرنے کو بھی عفّت کہتے ہیں۔ (٤) دنیا میں زہد کے علائم میں سے ایک علامت لوگوں کے اموال سے بے نیازی اور عفّت اختیار کرنا ہے، قرآن کریم ایسے صاحبان عفّت کے بارے میں فرماتا ہے: یہ صدقہ "ان فقرائ" کے لئے ہے جو راہ خدا میںگرفتار ہوگئے ہیں اور وہ(اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے) زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ان کی حیا وعفّت کی بنا پر ناواقف شخص انھیں تونگراور مالدار خیال کرتا ہے، حالانکہ انھیںتم ان کی علامتوں سے پہچان لوگے، اصرار کے ساتھ وہ لوگوں سے کوئی چیز نہیں مانگتے"۔ (۵)

۱۔ شیخ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۳۹، ح ۱۰۔

۲۔ کافی، ج۸، ص ۲٤٤، ح ۳۸۸۔

۳۔ ابن فارس، مقاییس اللغۃ، ج ٤، ص ۳۔

٤۔ ابن منظور، لسان العرب، ج۹، ص ۲۵۳، ملاحظہ ہو۔

۵۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۳۔

حضرت امام جعفر صادقؑ لوگوں سے بے نیازی اختیار کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں: "مومن کا شرف تہجّد سے اور اس کی عزّت لوگوں سے اس کے بے نیاز رہنے میں ہے"۔[1] اور حضرت علیؑ اس بات کے بیان میں کہ لوگوں سے بے نیازی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ان سے معاشرت اور راہ و رسم نہ رکھی جائے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے مغائرت نہیں رکھتی فرمایا ہے: "تمہارے دل میں لوگوں سے بے نیازی اور ان کی ضرورت و نیاز دونوں ہی ہونی چاہیے ان کے ساتھ تمہاری نیاز اور ضرورت تمہاری نرم کلامی اور خوشروئی میں ہے اور تمہاری بے نیازی آبرو کی حفاظت اور عزت کے باقی رہنے میں ہے"۔[2] بے شک مالی امور میں یہ بے نیازی اور عفّت زہد اور دنیا سے قطع تعلق ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پانچ۔ زہد اختیار کرنے کے موانع

انسان کی پارسائی اور زہد اختیار کرنے کے مقابل دو بنیادی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں: ایک اس کا دنیا سے محبت کرنا اور دوسرے اس سے بے فیض ہونا اور قطع رابطہ کرنا، تمام مفاہیم جیسے حرص، طمع در حقیقت دنیاوی محبت کے علائم میں شمار ہوتے ہیں اور دنیا طلبی کے نتائج کے عنوان سے مورد بحث واقع ہوتے ہیں۔

۱۔ دنیا کی محبت:

زہد کا مفہوم اور اس کی اہمیت کی توضیح کے موقع پر ایک حد تک دنیا کا مفہوم بھی آشکار ہوگیا اور اس کی مذمت میں آیات و روایات بیان کی گئیں، اب دنیا طلبی کہ جو زہد اختیار کرنے سے مانع ہے اس کے علائم اختصار کے ساتھ بیان کئے جائیں گے۔

بے شک اسلام کے اخلاقی نظام میں دنیا ہمیشہ مذموم نہیں ہے بلکہ اہمیت اور تعریف کے قابل بھی ہے۔ دنیا ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو انسان کے بہرہ مند ہونے کا باعث ہیں، اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور مقاصد کی تکمیل کا باعث ہیں۔ یہ لذتیں اور استفادے ہمیشہ برے نہیں ہیں، بلکہ اچھے نتائج کے بھی حامل ہیں۔

"مذموم دنیا" سے مراد وہ زود گذر استفادے ہیں جو نہ خود اخروی عمل صالح ہیں اور نہ اخروی عمل صالح کے لئے وسیلہ ہیں۔ نتیجہ کے طور پر مذموم دنیا حرام طریقہ سے لذت جوئی اور عیش و عشرت اور جو حلال چیزوں سے ضرورت و لازم مقدار سے زیادہ مالا مال ہونے کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔[3]

۱۔ شیخ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱٤۸، ح ۱۔ ۲۔ کافی، ج ۲، ص ۱٤۹، ح ۷۔

۳۔ محمد مہدی، نراقی جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۷، ۳۵۔

یہ وہی دنیا ہے جس کی مذمت میں خدا وند سبحان نے فرمایا ہے: "گونا گوں اور رنگا رنگ خواہشات کی دوستی یعنی عورتیں، اولاد، کثیر اموال سونے چاندی سے، علامت والے (تندرست) گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں یہ سب لوگوں کے لئے آراستہ کر دی گئی ہیں، (لیکن) یہ سب دنیاوی زندگی کے استفادہ کا ذریعہ ہیں۔ (١)

بعض آیات میں ہوائے نفس کے عنوان کے تحت مذموم و ناپسند دنیا سے مخالفت کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ (٢)

قرآن اس کی حقیقت کی توضیح دیتے ہوئے فرماتا ہے: "جان لو کہ دنیاوی زندگی در حقیقت صرف کھیل کود، تماشہ، آرائش، آپس میں فخر و مباہات اور اولاد و اموال میں زیادتی کے مقابلہ کا نام ہے"۔ (٣) سرانجام جو اپنی دنیوی زندگی کا دنیا سے سودا کرتے ہیں، قیامت میں ان سے کہا جائے گا: "اب اسی میں ذلّت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔(٤) "یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کو دے کر دنیوی زندگی خرید لی ہے لہٰذا نہ ان کا عذاب کم ہوگا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی"۔(٥)

اس دنیا اور اس کے ناگوار علائم کے بارے میں، جو کہ دنیا و آخرت میں ہوں گے، روایات کثرت سے پائی جاتی ہیںاور ان کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ بعض میں یہ توہم ہوتا ہے کہ گویا اسلامی اخلاق میں دنیاوی چیزوں کی ہمیشہ مذمت ہی کی گئی ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ ہم ان روایات میں سے انھیں پر اکتفا کریں گے جو زہد کی بحث میں بیان کی جاچکی ہیں۔

ممدوح دنیا نام ہے اس سے اتنا ہی استفادہ کرنا جتنا اپنی بقائ، خدا کی عبودیت اور اعمال صالحہ انجام دینے کے لئے لازم ہے۔ یہ حقیقت میں تحصیل آخرت کا مقدمہ ہے۔ اس طرح کی دنیا اسلامی اخلاق میں قابل ستائش واقع ہوئی ہے اور انسانوں کو اس کی تحصیل اور اس سے بہرہ مندہونے کی ترغیب اور تشویق دلائی گئی ہے۔

بہت سی روایات میں دنیا و آخرت کے خیر کو بہت سے نیک اعمال کے نتیجہ کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے (٦)

١۔ آل عمران، ١٤؛ منافقون، ٩؛انفال ٢٨ اور کہف ٤٧۔

٢۔ نازعات ٤٠۔

٣۔ حدید ٢٠۔

٤۔ مومنون ١٠٨۔

٥۔ بقرہ٨٦۔

٦۔ کلینی، کافی، ج٢، ص ٤٩٩، ح ١۔ اور ص ٧١، ح ٢۔ اور ج ٥، ص ٣٢٧، ج ٢ ۔ صدوق، خصال، ص ٤٢، ح ٣٤۔

بہت سی دعاؤں میں ہمیشہ اولیاء خدا کا مطلوب یہی رہا ہے۔ جیسا کہ خداوندعالم قرآن مجید میںارشادفرماتا ہے: "مومنین کی درخواست یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: " خدایا ! ہمیں اس دنیا میں بھی نیکی اور آخرت میں بھی نیکی عطا کر"۔ (۱) اس میں شک نہیں کہ خیر دنیا سے مراد وہی ممدوح اور پسندیدہ دنیا ہے اس کے مصادیق کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ بعض روایات میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ حضرت علیؑ ممدوح اور پسندیدہ دنیا کی ستائش میں فرماتے ہیں: "دنیا مومن کی سواری ہے جس پر سوار ہو کر وہ خداوند سبحان کی طرف سفر کرتا ہے، لہٰذا اپنی سواریوں کو آمادہ (اصلاح) رکھو تاکہ وہ تمہیں تمہارے رب کی جانب پہنچادیں"۔ (۲)

متعدد روایات میں مذکورہے "جو انسان اپنی معیشت اور اپنے اہل و عیال کی دنیا اصلاح کرنے کے لئے حلال طریقہ سے کوشش کرے تو وہ راہ خدا میں مجاہد کے مانند ہے"۔ (۳)

دنیا کی محبت کی نشانیاں:

دنیا کی محبت کی اہم نشانیاں میں جو ایک مانع کے عنوان سے انسان کے زہد کے مقابل ہے وہ حرص و طمع ہے جس کو اختصار کے ساتھ بیان کررہے ہیں۔

الف۔ دنیا کی حرص:

عربی لغت میں "حرص" محبوب و مطلوب چیز کی طلب میں شدید خواہش وارادہ ہوتا ہے۔ (٤) نیکی کے حصول میںحرص کرنا ممدوح اورپسندیدہ ہے جیسا کہ رسول اکرم نے واقعی توبہ کرنے والوں کی خصوصیات میں نیکیوں اور خیرات پر حریص ہونا جانا ہے۔ (٥) متعدد روایات میں علم حاصل کرنے (٦)، فقاہت (٧)، نیک اور پسندیدہ اعمال انجام دینے (٨)، راہ خدا میں جہاد کرنا (٩)، اخروی درجات (۱۰) حاصل کرنے اور ان کے مانند دوسری چیزوں ہیں حریص ہونے کی ستائش ہوئی ہے۔

۱۔ سورئہ بقرہ، آیت ۲۰۱۔ ۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲۰، ص ۳۱۷، ح ٦٤۰۔ ۳۔ شیخ کلینی، کافی، ج ٥، ص ۹۳، ح ۳۔ ص ۸۸، ح ۲۔ حرانی، تحف العقول، ص ٤٤٥۔ ٤۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ۷، ص ۱۱۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن، ص ۲۲۷، ۲۲۸ ملاحظہ ہو۔

٥۔ حرانی، تحف العقول، ص ۲۲۔ ٦۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳۔ حرانی، تحف العقول، ص ۱٦۰۔ ۷۔ شیخ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۲۳۱، ح ٤ ملاحظہ ہو۔

۸۔ شیخ صدوق، خصال، ص ٥۱٥، ح ۱۔ ۹۔ شیخ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۲۳۱، ح ٤ ملاحظہ ہو۔ ۱۰۔ حرانی، تحف العقول، ص ۲۸٦۔

دنیا کا حریص ہونا ناپسندیدہ صفات اور زہد کے موانع میں سے ایک مانع ہے۔ اسی بنیادپر متعدد آیات وروایات میں اس کی شدت سے مذمت کی گئی ہے اور اس کے نقصان دہ اثرات مختلف پہلوئوں سے بیان کئے گئے ہیں۔ حریص انسان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کبھی سیر نہیں ہوتا ہے۔ حرص کا اہم ترین نمونہ روایات معصومین(ع) کی روشنی میں علماء وحکماء کی حرص اور محرمات کے انجام دینے کی حرص ہے۔ سب سے اہم حرص کا سبب موت کو بھلادینا اور دنیا کی محبت ہے۔ ذلت وخواری، حیا و انسانیت کو ترک کرنا، گناہو ںمیںڈوب جانا، انجام و عاقبت کو تباہ وبرباد کردینا دنیا کی حرص کے اہم ترین میں سے ہیں ۔ توکل، قناعت اور موت کی یاد کو دنیاکی حرص کے علاج کا بہترین وسیلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ب۔ طمع اور لالچ:

عربی لغت میں طمع کسی شے سے متعلق[۱] شہوت وخواہش نفس کے ساتھ اشتیاق کے مفہوم کوکہتے ہیں، علماء اخلاق کی نظر میں طمع سے مراد ہے لوگو ںکے اموال کی خواہش اور لالچ کرنا۔[۲] حضرت امام جعفر صادق۔ فرماتے ہیں:"مومن کے لئے کتنی بری بات ہے کہ وہ ایسی چیزکی خواہش اور دلچسپی پیدا کرے جو اسے ذلیل و خوار کردے"۔[۳] حضرت امام زین العابدین دوسرے کی چیزوں سے انسان کی طمع کے قطع کرنے کی ترغیب و تشویق کے متعلق فرماتے ہیں: "میں تمام خیر کو لوگوں کے پاس موجود چیزوں سے قطع طمع کرنے میں دیکھتا ہوں"۔[٤] (یعنی اگر انسان تمام خیرکو جمع کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کے پاس موجود چیزوں سے چشم پوشی کرے اور اس پر نظر نہ جمائے)۔ اس وجہ سے طمع اور لالچ بہت سے اخلاقی رزائل کا سرچشمہ ہے جیسے ذلت و خواری، پستی، حسد اور جلن، کینہ توزی، بد گوئی۔ محبت دنیا کے دیگر علائم میں ایک حسرت وافسوس ہے اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کو دنیا حاصل نہیں ہوپاتی ہے۔

۲۔ خمود:

خمود سے مراد زندگی کے لئے ضروری کسب معاش میں سستی و تفریط کرنا نیز جنسی اور تمام لذتو ںسے بہرہ مند ہونے میں بے رغبتی، عدم دلچسپی اور سستی کرنا ہے ۔[٥] جس طرح دنیا کی محبت اور اس سے دلبستگی زہد کی راہ میںمانع محسوب ہوتی ہے اسی طرح حد سے زیادہ ضروریات زندگی کی لازم مقدارپورا کرنے اور دنیوی مواہب اور عطیو ںسے استفادہ کرنے میں سستی کرنا دنیا کی نسبت صحیح موقف کی راہ میں ایک مانع ہے۔ جو آیات وروایات ممدوح اورپسندیدہ دنیا کے بارے میںبیان کی گئی ہیںوہ سب زندگی کی ضروری چیزوں کے حصول سے متعلق سستی اور خمود کا مظاہرہ کرنے کی مذمت پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن، ص ٢١٦ ۔ ۲۔ نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج۲، ص ١٠٦ ۔ ۳۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۳۲، ح ۱ ۔ ٤۔ ایضاً، ج۲، ص ۳۲۰، ح ۳۔ ٥۔ نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج۲، ص ۱۳، ١٥۔

و۔ دوسروں کی نسبت نفس کا رجحان

ہمارے خیال میں دوسروں کی نسبت انسان کے نفسانی مطلوب رجحان کو اللہ کی دوستی اور دشمنی کے محور بیان کیا جاسکتا ہے " حب فی اللہ " اور " بغض فی اللہ " یہ دونوں ایسے مفاہیم ہیں جو اسلامی کتابوں کے اندر شدت کے ساتھ مورد تاکید واقع ہوئے ہیں اور دراصل دوسروں کی نسبت ہمارے درازمدت موقف اور ہماری حکمت عملی کی تعیین کرتے ہیں۔ اسی سے اس حصہ کے مطالب انھیںدو عنوان کے تحت بیان کئے جائینگے اور دیگر وہ تمام مفاہیم جو دوسروں سے متعلق ایک طرح سے نفسانی رجحان کو بیان کرتے ہیں ان کو ان دونوں کے توابع اور ملحقات کے عنوان سے بیان کریں گے۔

۱۔ خداوندعالم کی محبت

ایک۔دیگر دوستی کی حقیقت اور اس کے اقسام

علماء اخلاق نے دیگر دوستی (دوسروں کو دوست رکھنے) کے لئے چار صورتیں بتائی ہیں کہ پہلے ان کے بارے میںبیان کریں گے پھر ان کی پسند شکلوں کو واضح کریں گے۔

۱۔ انسان کا اپنے لئے دوسرونسے محبت کرنا نہ اس لئے کہ وہ محبوب تک رسائی کے لئے ایک راہ ہے۔ چونکہ خود اسے قابل دوستی اور صاحب کمال و جمال محسوس کرتا ہے اور اس کے دیدار سے لذّت حاصل کرتا ہے لہٰذا اسے دوست رکھتا ہے۔

کبھی اس طرح کی دوستی ایک قسم کی محض و باطنی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی ہوتی ہے بغیراس کے کہ کوئی خوبصورتی اور کمال معلوم ہو۔ اس طرح کی دوستی کے مخفی اسرار کا کشف کرنا معمولی انسان کے بس سے باہر ہے، کہا گیا ہے: پیغمبر اکرم نے اس طرح کی دوستی کی طرف جو کہ مخفی ارتباط سے ہوتی ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:" ارواح مثل لشکر کے ہیں، ان میں سے جو ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں وہ باہم مانوس ہوتی ہیں اور جو ایک دوسرے کو نہیں پہچانتیں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوجاتی ہیں "۔ [1]

۱۔ صدوق، فقیہ، ج ٤، ص ٣٨٠، ح ٥٨١٨ ؛ اعتقادات، ص ٤٨ ؛ جامع الاخبار، ص ٤٨٨، ح ١٣٥٩ ؛ علل الشرائع، ص ٨٤، ح ١۔

اس طرح کی دیگردوستی خداوند سبحان کی دوستی میں شمار نہیں ہوتی لیکن خود بخود مذموم اور بری بھی نہیں ہے، بلکہ انسان کی نفسانی خواہشات منشٔے ایک ہے لیکن اگر مذموم اور نا پسند مقصد تک پہونچنے کا ذریعہ ہوتو خود بھی مذموم اور قابل ملامت ہوجائے گی۔

۲۔ ایسے محبوب تک رسائی کے لئے وسائل و ذرائع کے عنوان سے انسان کا دوسرے کو دوست رکھنا کہ جو اس کے لئے دنیاوی فوائد اور منافع رکھتا ہے، کیونکہ انسان ان وسائل و آلات جو اسے محبوب تک پہونچاتے ہیں عشق کرتا ہے۔ واضح ہے کہ اس طرح کی دوستی بھی خدا کی محبت شمار نہیں ہوتی۔

۳۔ دوسرے کودوست رکھنا ایک ایسے وسیلہ کے عنوان سے جو اسے ایسے ہدف تک پہونچائے کہ وہ ہدف اس کے لئے آخرت کے مثبت فوائد کاحامل ہو، جیسے وہ محبت جو اپنے استاد سے راہ حق کا سالک رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا ہدف سعادت اخروی کا حصول ہے اور معلم ایسا وسیلہ ہے جو اسے اس ہدف تک راہنمائی کرتا ہے

اسی طرح ہے وہ محبت بھی جو معلم اپنے شاگردو ںسے رکھتا ہے، کیونکہ شاگردوں کے وجودکے واسطہ سے وہ استادکے کمال و مرتبہ تک پہونچا ہے اور اس مرتبہ کو پاکر حضرت عیسیٰ کے بقول "اس کی بزرگی کاتذکرہ ملکوت اعظم میں ہوتا ہے"[۱] بلکہ کلی طورپر ہر اس انسان کی دوستی جس کے علم وفن، صنعت وہنر، کام کاج اور عمل کے ذریعہ انسان خدا کے نزدیک ہوتا ہے جیسے ایسے لوگوں کو دوست رکھنا جو انسان کی دنیوی ضرورتوں کو فراہم کرتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ کرکے اپنے اخروی و دنیوی اہداف تک پہنونچ سکیں، بے شک یہ تمام دیگر دوستی خدا کی دوستی محسوب ہوتی ہے۔

٤۔ دوسروں سے صرف خداکے لئے محبت کرنا، نہ اس لئے کہ اس کے علم و عمل سے فائدہ اٹھائے گا یا اسے کسی دوسرے ہدف تک پہونچنے کے لئے وسیلہ قرار دے گا، بلکہ اس لئے کہ وہ خدا سے ایک نسبت رکھتا ہے، وہ عام نسبت ہو جیسے یہ کہ وہ خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے یاخاص نسبت جیسے یہ کہ وہ خدا کا سچا اور واقعی دوست اور اس کا مقرب اور راہ خدا میں خدمت گذار ہے۔ اس کی محبت کی شدت کے نتائج نیز اس کے عالی مراتب سے مبیٔنہ ہے کہ محبت اساسی طورپر محبوب سے متعلق تمام چیزوں تک سرایت کرجاتی ہے (یعنی انسان محبوب کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق چیزوں کو بھی دوست رکھنے لگتا ہے) خواہ رابطہ اور نسبت دور ہی کی کیوں نہ ہو۔ جیسے جو انسان کسی دوسرے سے شدید محبت کرتا ہے وہ ان لوگوں کو بھی دوست رکھتا ہے جو اس کے محبوب کو دوست رکھتے ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، اس کی تعریف توصیف کرتے ہیں یا اس کے محبوب کے محبوب ہیں۔[۲]

۱۔ ابوفراس، تنبیہ الخواطر، ج ۱، ص ۸۲۔ ۲۔ نراقی، مولی محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص ۱۸٤ تا ۱۸۷۔

دو۔ خدا سے محبت کرنے کی فضیلت

اسلامی اخلاق میں خدا کی محبت بلند مرتبہ کی حامل ہے اور اس کی کثرت سے تاکید کی گئی ہے اور اس کے لئے دنیا اور آخرت میں بہت سے علائم بیان کئے گئے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق۔ فرماتے ہیں: "ایک دن پیغمبر اکرم نے اپنے اصحاب سے سوال کیا: "ایمان کی دستا ویزوںمیں سے کونسی زیادہ محکم و مضبوط ہے" انہوں نے جواب دیا: خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے کہا: نماز۔ کچھ نے کہا: زکات۔ کچھ نے کہا: روزہ۔ کچھ نے کہا حج و عمرہ اور بعض نے جہاد کو سب سے محکم خیال کیا۔ رسول خدا نے فرمایا: "ان سب کی فضیلت ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی محکم ترین نہیں ہے بلکہ محکم ترین ایمان کی دستاویز خدا کے لئے دوستی کرنا اور اسی کے لئے دشمنی کرنا، خدا کے دوستوں کو دوست رکھنا اور اس کے دشمنوں سے دشمنی اور بیزاری کرنا ہے"۔[(۱)]

حضرت امام محمد باقر۔ انسان کے خیر و صلاح سے استفادہ کی علامت خدا کے لئے دوستی کو جانتے تھے، جیسا کہ آپ فرماتے ہیں: "جب تم جاننا چاہو کہ تم میں کوئی خیر پایا جارہا ہے تو اپنے دل کی طرف نگاہ کرو اگر خدا کی اطاعت کرنے والے کو تم نے دوست رکھا اور اہل معصیت وگناہ کو دشمن توتم میں خیر ہے اور خدا بھی تم کو دوست رکھتا ہے لیکن اگر خدا کی اطاعت کرنے والوںکو دشمن اور خدا کی معصیت کرنے والوں کو دوست رکھا تو تم میں خیر کا وجود نہیں ہے نیز خدا بھی تمہیں دشمن رکھتا ہے، انسان (کا حساب و کتاب) اسی کے ساتھ ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے"۔[(۲)]

آخرت میں خدا کی محبت کے علائم بارے میں حضرت امام زین العابدین فرماتے ہیں: "جب خداوندعالم اولین سے لے کر آخرین تک تمام انسانوںکو جمع کرے گا تو ایک آواز لگانے والا اٹھے گا اور ایسی آواز سے کہ سب سن سکیں گے آواز لگائے گا: "کہاں ہیں وہ لوگ جو خدا کے لئے دوستی کرتے تھے؟" تو لوگوں کا ایک گروہ اٹھے گا اور ان سے کہا جائے گا: بغیر حساب و کتاب کے تم لوگ جنت میں داخل ہوجاؤ "۔[(۳)] خداوندعالم سے دوستی اور دشمنی کی اہمیت و منزلت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ متعدد روایات میں ایمان کی ساری حقیقت خدا کی دوستی اور دشمنی میں خلاصہ کی گئی ہے۔

۱۔ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۲۵، ح ۲؛ برقی، محاسن، ج۱، ص ٤١١؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ٦٩، ص ٢٤٢، ح ١٧۔

۲۔ ایضاً، ج ۲، ص ١٢٦، ح ١١؛ برقی، محاسن، ج۱، ص ٤١٠، ح ٩٣٥۔

۳۔ ایضاً، ج ۲، ص ١٢٦، ح ٨؛ برقی، محاسن، ج۱، ص ٤١٢، ح ٩٤٠۔

جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کا ایک صحابی آپ سے سوال کرتا ہے:" آیا دوستی اور دشمنی ایمان میں شمار کی جائے گی ؟ امام نے جواب دیا:"کیا ایمان دوستی اور دشمنی کے علاوہ کوئی اورچیز ہے ؟ "(١)

تین۔خدا سے محبت کرنے کی نشانیاں

ان میں سے بعض نشانیاں جو خود نفسانی صفات اور بہت سے گراں قیمت اور اہم اخلاقی نشانیاں نتائج کا سرچشمہ ہیں، درج ذیل ہیں:

١۔ نصیحت اور خیر خواہی:

نصیحت و خیر خواہی "حقد" (کینہ) اور حسد (جلن) کے مقابلہ میں ہے اوراس سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ کی نعمتوں سے دوسروں کے استفادہ کی نسبت راضی و خوشنود ہواور ان پر بلا اور مصیبت کا نازل ہونا اس کے لئے ناگوار ہو۔ اس خیر خواہی کا لازمہ یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو اس بات کی طرف جس میں ان کے لئے خیر و صلاح ہے ہدایت کرے۔ حضرت امام جعفر صادقؑ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "لوگوں میں سب سے زیادہ خدا کے نزدیک قیامت کے دن عظیم انسان وہ ہے جو خلق کی خیر خواہی میں دوسرے افراد سے زیادہ قدم اٹھائے"۔(٢) اسی طرح پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:" لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار وہ انسان ہے جس کا دل تمام مسلمانوں کی نسبت سب سے زیادہ پاک و صاف ہو"۔(٣) جب رسول خداؐ سے لوگوں کی نصیحت اور خیر خواہی کی علامت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "خیر خواہ انسان کی چار علامتیں ہیں: حق کے ساتھ فیصلہ کرنا اور اپنا حق دوسروں کو بخشنا، لوگوں کے لئے وہی پسند کرنا جو اپنے لئے پسند کرتا ہو، حق کے واسطے کسی کے ساتھ دست درازی نہ کرنا"۔ (٤) دراصل چاروں علامتوں کو تیسری علامت میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "انسان کی خیر خواہی میں اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتا دوسروں کو بھی اس سے روکتا ہو"۔ (٥)

١۔ کلینی، کافی، ج٢، ص ١٢٥ ح ٥۔ اسی طرح ملاحظہ ہو کافی، ص١٢٧ ح ١٦ ؛ تفسیر عیاشی، ج١، ص ١٦٧، ح ٢٥۔

٢۔ کلینی، کافی، ج٢، ص ٢٠٨، ح ٥۔

٣۔ ایضاً، ص ١٦٣، ح٢۔

٤۔ حرانی، تحف العقول، ص ٢٠۔

٥۔ اردبیلی، ابو لفتح، کشف الغمہ، ج٣، ص١٣٧، ١٣٨۔

۲۔ مومنین سے حسن ظن:

حسن ظن، انصاف، کرم و بخشش اور مروت جیسے مفاہیم کا بھی خدا وندعالم کی محبت کے علائم کے عنوان سے ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ یہ فضیلتیں حقیقت میںنصیحت اور خیر خواہی کی نشانی میں شمار ہوتی ہے لہٰذا حسن ظن کی طرف اشارہ کو اس مختصر کتاب میںکافی سمجھتے ہیں۔ مومنین سے بد گمانی کی مذمت میں قرآن کریم فرماتا ہے: " اے صاحبان ایمان، بہت سے گمانوں سے پرہیز کروکیونکہ کچھ گمان گناہ ہیں"۔ (١) واضح ہے ان گمانوں سے مراد کہ جن سے اجتناب لازم ہے ناروا گمان ہیں، یعنی سوء ظن (بد گمانی)۔ اسی طرح گمان سے اجتناب کرنے سے مراد اپنی بد گمانیوں پر ترتیب اثر نہ دینا ہے۔(٢) آیت کے استمرار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرآیت صرف مومنین سے بدگمانی کی مذمت سے متعلق نہ ہو، تب بھی کم ازکم ان سے بدگمانی کی مذمت اور حقیقت میں مومنین کی نسبت حسن ظن آیت کی بعض مراد ہے۔ امیرا لمومنین حضرت علی۔ مومنین سے حسن ظن رکھنے کے بارے میں فرماتے ہیں: "اپنے بھائی کے عمل کو بہترین وجہ پر حمل کرو اس وقت تک جب تک کہ اس سے کوئی ایسا کام سرزد ہوجو توجیہ کی راہ بند کردے اور جب بھی کوئی بات تمہارے برادر (ایمانی) کے دہن سے نکلے تو جب تک اسکا بہترین معنی پائو بد گمانی نہ کرو۔ (٣)

پیغمبر اکرم بھی حسن ظن کے نفسانی علائم کے بارے میں فرماتے ہیں: " اپنے ایمانی بھائیوں سے حسن ظن رکھو تاکہ دل کی پاکیزگی اور صفائے نفس تک حاصل کرو"۔ (٤) بدگمانی کے جملہ تباہ کن اثرات میں غیبت، اختلافات کا ظاہر ہونا، بخل حسد ہے جن کو بحث کے تسلسل میں ان کے عوامل واسباب کو بیان کریں گے۔(٥)

بدگمانی ایجاد کرنے کا سب سے اہم عامل تہمت کی جگہ اور الزام کے مقام پر واقع ہونا ہے۔ حضرت علی۔ ان لوگوں کی مذمت میں جو خود کو تہمت کی جگہ قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں: "جو شخص کسی بری جگہ اور ٹھکانہ پر رفت و آمد کرے تووہ متہم ہوجائے گا اور جو اپنے آپ کو مقام تہمت میںقرار دے تو اسے اس کو جو اس سے بد گمان ہوگیا ملامت نہیں کرنا چاہیے"۔(٦)

١۔ سورۂ حجرات، آیت ١٢۔

٢۔ طباطبائی، المیزان، ج ١٨، ص ٣٢٣۔

٣۔ کافی ج٢، ص ٣٦٢، ح ٣۔ نہج البلاغہ حکمت ٣٦٠۔ حرانی، تحف العقول، ص ٢٧١۔

٤۔ گیلانی، عبد الرزاق، مصباح الشریعۃ، ص ٤٦٤۔

٥۔ مصباح الشریعۃ، ص ٤٦٣تا٤٦٧۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ٧٥، ص ٢٠١۔ صدوق، فقیہ، ص ٤٠٩، ح ٥٨٨٩۔

٦۔ نہج البلاغہ حکمت ١٥٩۔ شیخ صدوق، امالی، ص ٢٥٠، ح ٨۔ کراجکی، کنز الفوائد ج ٢، ص ١٨٢۔ حرانی، تحف العقول، ص ١٥٧ تا ٢٧١۔

اپنے سے دوسروں کی بدگمانی کو دور کرنے کا طریقہ حضرت علی مالک اشتر سے بیان فرماتے ہیں:

" اگر رعیت تمہارے بارے میںظلم و ستم کا گمان کرے تو اپنے عذرکو ان کے درمیان آشکار طورپر بیان کرو اور ایسا کرکے ان کی بدگمانی دور کروکہ اس میں تمہارے نفس کی تربیت بھی ہے اور رعیت کے ساتھ نرمی اور مدارا کا اظہار بھی اور وہ عذر خواہی بھی ہے جس کے ذریعہ تم انھیںحق کی راہ پرچلانے کا مقصد بھی حاصل کر سکتے ہو"۔[۱]

جی ہاں، ہمیشہ حسن ظن پسندیدہ اور محبوب نہیں ہے بلکہ کبھی بے موقع اور ناپسند بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایسے زمانے میں حسن ظن رکھنا جب کہ ظلم و فساد حق اور خیر وصلاح پر غلبہ رکھتا ہے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، جیسا کہ حضرت علی نے فرمایا ہے: "اگر زمانہ اور اہل زمانہ پر برائی غالب آجائے اورکوئی دوسرے پر حسن ظن رکھے تو گویا اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا ہے "۔[۲] دوسری جگہ دشمنوں سے حسن ظن رکھنے کی مذمت کے بارے میں مالک اشترکو ہوشیار کرتے ہیں: صلح کے بعد اپنے دشمن سے مکمل طورپر چوکنا اور ہوشیار رہنا کیونکہ دشمن کبھی کبھی اپنے آپ کو تم سے اس لئے نزدیک کرتا ہے تاکہ تمہیں غافل بنادے لہذا دور اندیش اور محتاط رہو اور اپنے دشمن سے حسن ظن نہ رکھو"۔[۳]

چار۔ خداوند سبحان سے دوستی کے موانع

یہاں پر خدا کی راہ میںموانع محبت سے مراد ایسے موانع ہیں جو خود نفسانی صفات میں سے ہیں اس طرح کے اہم ترین موانع، حسد، حقد اور کینہ توزی وغیرہ ہیں۔

۱۔ حسد:

ارباب لغت کے نزدیک حسد، اس بات کا نام ہے کہ انسان دل میں کسی شخص کی ایسی نعمت سے محرومیت کی تمنا رکھتا ہو جس کا وہ استحقاق رکھتا ہو۔[٤]

علماء اخلاق نے اس مفہوم کی مزید شرح میں زیادہ کہا ہے: حسد یعنی ایسی نعمت کے زوال کی آرزو کرنا جس سے استفادہ کرنے میں مسلمان شخص کی صلاح ہے۔ اس تعریف میں دو معتبر عنصر تصور کئے گئے ہیں: اول یہ کہ انسان

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

۲۔ نہج البلاغہ حکمت ١١٤، اسی طرح ملاحظہ ہوکلینی کافی ج۵، ص ۲۹۸، ح ۲ ؛ حرانی، تحف العقول، ص۳۰۲۔

۳۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

٤۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص١١٦۔

دل میں دوسرے انسان سے نعمت کے زوال کی تمنا رکھتا ہو اوردوسرے یہ کہ اس نعمت سے اس کا مالا مال ہونا اس کے لئے مصلحت کا حامل ہو، لیکن اگر اس کی آرزو ایسی نعمت کا رکھنا ہو جس سے دوسرا انسان مالا مال ہے تو ایسی حالت کو "غبطہ"اور "منافسہ''کہتے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم فرماتاہے:" ان نعمتوں " میں مشتاقین کو چاہئے کہ ایک دوسرے پر سبقت کریں"۔ (١) اور اگر ایسی نعمت کہ مسلمان شخص کے پاس سے جس کے زوال کی تمنا رکھتا ہو اور اس کا اس شخص میں ہونا صلاح نہ ہو، مثال کے طور پر اس کے فساد اورتباہی میں بتلا ہونے کا باعث ہوتو ایسی حالت کو "غیرت "کہتے ہیں۔ (٢) اس لحاظ سے "غبطہ" "منافسہ" اور غیرت " بااہمیت نفسانی حالات ہیں اور صرف "حسد" کہ جو دوسروں کی نصیحت اور خیر خواہی کے مقابلہ میں آتا ہے وہ اخلاق کی برائی میں شمار ہوتا ہے۔

البتہ حسد اور خیر خواہی کے درمیان تشخیص یقین یا اطمینان کے ساتھ افرادکی واقعی مصلحت شناخت پر موقوف ہے اورجب بھی ایسی شناخت کا حصول ممکن نہ ہو تو انسان کو چاہیے کہ صرف دوسروں کی واقعی مصلحت کی تمنّا پر اکتفاء کرے اور اس نعمت کی نسبت کوئی موقف نہ رکھتا ہو۔ روایات میں حسد کی متعدد علامتیں .بیان کی گئی ہیں جیسے غیبت، شماتت، دوستی کا اظہار، دشمنی کا پوشیدہ کرنا، احسان کے مقابل ناشکری اور اہلیت و شائستگی سے کم تعریف کرنا وغیرہ۔ کہ ہم اختصارکی رعایت کرتے ہوئے اس کی تفصیل سے صرف نظر کرتے ہیں۔

لفظ "حسد"قرآن کریم میں پانچ بار مختلف صورتوں میں ذکرہوا ہے کہ سب ہی صریحی طورپریا اشارہ کے طورپر حسد کی مذمت پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ خدا پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تمام برائیوں با لخصوص ان کے بعض خاص مصادیق جیسے حاسدین کے حسد سے خداکی پناہ مانگو: " کہو:"میں صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جو کچھ اس نے خلق کیا ہے اس کے شر سے.... اورہر حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے "۔ (٣) اسی طرح بارہا کافروں کو پیغمبر اکرم ، وحی اور دینی معارف جیسی نعمتوں سے مسلمانوں کے مالامال ہونے کی نسبت ان کے حسد کرنے کی وجہ سے سرزنش کرتا ہے "یا وہ ان لوگوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ خدا نے اپنے فضل سے انھیں عطا کیا ہے "۔ (٤)

١۔ سورئہ مطففین، آیت ٢٦۔

٢۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ٢، ص١٩٢ ؛فیض کاشانی، المحجة البیضا ئ، ج٥، ص ٣٣٠۔

٣۔ سورئہ فلق، آیات، ١، ٢، ٣۔

٤۔ سورئہ نسا ئ، آیت ٥٤ ؛ اسی طرح ملا حظہ ہو طباطبائی، المیزان، ج ٤، ص٣٧٦۔

قرآن مجید کے بقول کفار مومنین سے حسد کی شدت کی بنا پر آرزو کرتے ہیں کہ مومنین کو ان کے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پلٹادیں: "بہت سے اہل کتاب جب کہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے، اس حسد کی وجہ سے جو ان کے اندر پایا جاتا ہے آرزو کرتے تھے کہ تمہیںایمان لانے کے بعد کافر بناڈالیں"۔ (۱)

پیغمبر اکرم خبر دیتے ہیں کہ خداوند عظیم نے موسٰی- سے فرمایا: "اے عمران کے فرزند! جو کچھ میں نے لوگوں کو اپنے فضل سے دیا ہے اس پر حسد نہ کرو اور اس کے پیچھے اپنی نگاہ کو دراز نہ کرواور اس کے چکر میںاپنا دل نہ الجھاؤ کیونکہ میری نعمت سے حسد کرنے والا غمگین رہتا ہے اور جو تقسیم میں نے اپنے بندوں کے درمیان کی ہے اس میں حائل ہوتا ہے لہذا جو ایسا ہو گا وہ مجھ سے نہیں ہے اور میںاس سے نہیں ہوں۔ (۲)

حسد کے نقصان دہ اور خطرناک علائم روایات میں بیان کئے گئے ہیں، جیسے لذت کی کمی، حاسدوں کے سکون و اطمینان اور اس کی راحت وخوشی کا سلب ہونا، اس کی آہ و حسرت درد ورنج کی کثرت حتیٰ کے جسمانی سلامتی اور قوت کا کھو دینا، اس کے دین و ایمان کا نابود ہونا اس کے علاوہ اخروی مقامات اور سعادت کا ضائع ہو جانا۔

علماء اخلاق نے حسد کے درجات ومراتب درج ذیل عنوان سے بیان کئے ہیں:

۱۔ یہ کہ انسان دوسرے سے نعمت کے زائل ہونے کی تمنا وآرزو دل میں رکھتا ہو، خواہ وہ نعمت اس کے ہاتھ نہ لگے۔ یہ حسد کی بدترین قسم ہے۔

۲۔دوسرے سے نعمت زائل ہونے کی خواہش خود اس تک پہونچنے کیلئے۔ مثال کے طور پر وہ خاص مرتبہ تک پہنچنا چاتا ہے اور چونکہ اس کا اس مرتبہ تک پہونچنا دوسرے سے اس کے سلب پر موقوف ہے لہذ وہ اس کے دوسرے سے زائل ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ درج ذیل آیت اسی طرح کے حسد کی ممانعت پر دلالت کرتی ہے: " خبردار! جو کچھ خدا نے تم میں سے بعض کو بعض سے زیادہ دیا ہے اس کی آرزو نہ کرنا"۔ (۳)

۳۔ اس نعمت کے مشابہ جوکسی دوسرے کے پاس ہے طلب کرے اور اگر خود اس نعمت تک نہ پہونچ سکے تو چاہے کہ دوسرے سے بھی سلب ہو جائے اور اگر دوسرے سے اسی نعمت کو سلب کرسکتا ہو تو اس کے لئے کوشش کرے۔

۱۔ سورئہ بقرہ، آیت ۱۰۹۔

۲۔ کلینی کافی، ج ۲، ص۳۰۷، ح٦۔

۳۔ سورئہ نسائ، آیت ۳۱۔

٤۔ وہی تیسری صورت، اس فرق کے ساتھ کہ اس کی عقل و دین کی قوت اس بات سے مانع ہوتی ہے کہ دوسرے سے اس نعمت کے سلب کرنے کا اقدام کرے اوراپنی اس نفسانی حالت سے (یعنی دوسرے سے نعمت کے سلب کرنے کی تمنا سے) ناراض اور غمگین ہے، یہ نفسانی حالت اگر چہ ناپسند ہے، لیکن عذاب خداوندی کا باعث نہیں ہوگی اور ا یسے انسان کی نجات کی امید پائی جاتی ہے۔[1] حسد کے اہم عوامل و اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

١۔ نفسانی پستی اور گندگی جس کے نتیجہ میں بغیر اس کے کہ کوئی خاص دشمنی اس کے اور دوسروں کے درمیان ہو دوسروں سے نعمت کے زوال پر خوش اور نعمت خداوندی سے ان کے فیضیاب ہونے پر محزون و مغموم اور دوسروں کے درد والم، رنج و غم میںمبتلا ہونے سے خوش ہے، اگر چہ ان کے مالا مال ہونے سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

٢۔ دشمنی اور بغض حسد کے وسیع ترین عوامل میں سے ہے، کیونکہ خدا کے خاص دوستوں کے علاوہ تمام لوگ اپنے دشمن کے پریشانی میں مبتلا ہوجانے پر شاد و مسرور ہوجاتے ہیں۔

٣۔ ریاست طلبی اور مال و منصب سے لگاؤ، جو شخص دوست رکھتا ہے کہ اپنے فن میں منفرد جیسے شجاعت، عبادت اور اس کے مانند دوسری چیزوںمیں یکتا اور قابل مدح و ستائش رہے، جب وہ اپنے لئے کوئی رقیب اور نظیر دیکھتا ہے تو اس کے لئے ناگوار ہوتا ہے، اوریہی چاہتا ہے کہ کسی صورت اس کے رقیب سے نعمت سلب ہوجائے۔

٤۔ اہداف ومقاصد تک نہ پہنچنے کا خوف، ایسی جگہ جہاں بہت سے افراد ایک ہی ہدف کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ صرف اس ہدف تک پہنچے۔

٥۔ اپنے ہم پلّہ اور ہم پیشہ افراد کی برتری کا تحمل نہ کرنا، کیونکہ احساس کرتا ہے کہ اگر اس کا ہم پلّہ فوقیت لے جائے گا تو اس پر فخر و مباہات کرتے ہوئے اس کی تحقیر وتوہین کرے گا۔ اس بنا پر کہ سب ایک دوسرے کے برابر ہوں اور کوئی دوسرا اس پر تکبر نہ کرے، اپنے ہم پلّہ سے حسد کرتا ہے۔

٦۔ تکبر:

حاسد انسان چاہتاہے کہ دوسروں پربزرگی جتائے اور دوسرے لوگ اس کے پیرو اور تابع رہیں، چونکہ نعمت خداوندی سے دوسروں کا فیضیاب ہونا اس تشویش کو اس کے اندر ابھارتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا بہرہ مند ہونا اس کے تہی دست ہونے کا باعث ہوجائے، جیساکہ کفار پیغمبر اکرم کے بارے میں کہتے تھے: "کیوں یہ قرآن ان دونوں شہروں (مکّہ ومدینہ) کے کسی بڑے شخص پر نازل نہیں ہوا ؟"[2]

١۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ٢، ص ١٩٨، ١٩٩۔ ٢۔ زخرف ٣١۔

۷۔ دوسروںکے عظیم نعمتوں سے فیضیاب ہونے کی توقع نہ کرنا:

اور اس پر حیرت کرنا یعنی انسان کو اس لائق نہیں سمجھنا کہ اس طرح کی عظیم نعمتوں سے وہ بہرہ مند ہو، نتیجہ کے طور پر اس سے حسد کرتا ہے۔ (١) جیسا کہ مشرکین پیغمبر سے کہتے تھے: "تم ہمارے جیسے انسان کے سوا کچھ نہیں ہو"۔ (٢)

رہا سوال یہ کہ ہم کس حد تک اپنے سے حسد کو دور رکھیں، اس کا جواب یہ ہے کہ حسد کبھی انسان کے قول و فعل سے غیبت اور تہمت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی انسان کی رفتار وگفتار سے ظاہر نہیں ہوتابلکہ وہ صرف اپنے دل میں خواہش رکھتا ہے کہ دوسرے سے نعمت زائل ہوجائے۔ بلا شبہہ دونوں گناہ شمار ہوتے ہیں اور اس سے مقابلہ کرنا واجب ولازم ہے لیکن کبھی حسد کے علائم انسان کی گفتار و کردار سے ظاہر نہیں ہوتے اور انسان بھی اپنے اندر دوسروں سے زوال نعمت کے متعلق پائی جانے والی نفسانی خواہشات کی مذمت و ملامت کرتا ہے۔اس قسم کا حسد گناہ شمار نہیں ہوتا اور عقاب کا باعث نہیں ہے، اگرچہ اس سے مقابلہ بھی نیک اور معنوی بلندی کا باعث ہے۔ (٣)

٢۔ حقد اور کینہ توزی :

"حقد وکینہ "کینہ سے مراد ہے دل میں دوسرے کی عداوت ودشمنی رکھنا اور اس کے ظاہر کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہنا۔ (٤) در حقیقت حقد، وہ خشم وغضب ہے کہ جو ظاہر نہیں ہو پاتا ہے اوردل میں دب کر رہ جاتا ہے،یہاں تک کہ ایک دن موقع پا کر ظاہر ہو جائے ۔ (٥) بلا شبہہ حقد نفسانی رذائل میں سے ایک رذیلت اور خداوند سبحان سے دوستی کے موانع میں سے ایک مانع ہے۔ معصومین (ع) کے گہربار کلمات میں کینہ توزی، اس کے علائم و اسباب اور اس سے نجات کے بارے میں بہت سے ارشادات بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت علی نے حقد وکینہ توزی کی مذمت میں فرمایا ہے: لہٰذا اپنے دلوں میں مخفی آتش تعصب کو خاموش کردو اور جاہلیت کے کینوں کو نکال پھینکو کہ مسلمانوں میں اس غرور کا ہونا شیطانی خصلتوں میں سے ہے" (٦)

١۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ٢، ص ١٩٩ تا ٢٠٢۔

٢۔ یس ١٥ ۔ مومنون ٣٤، ٤٨۔

٣۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ٢، ص ٢١٠، ٢١١۔

٤۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ٣، ص ١٥٤

٥۔ نراقی، جامع السعادات، ج ١، ص ٣١١۔

٦۔ نہج البلاغہ، خطبہ ١٩٢۔

ایک دن پیغمبر اکرم نے لوگوں سے پوچھا: "کیا میں تمہیں تم میں اپنے سے سب سے کم شباہت رکھنے والے انسان سے آگاہ نہ کروں ؟ انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں ، فرمایا: بدگو، بے آبرو، بے حیا، بخیل، متکبر، کینہ توز، حاسد، سنگدل، ایسا انسان جس سے کوئی خیر نہیں ہوتا اور کوئی اس کے شر سے محفوظ نہیں ہے "۔(۱)

حضرت علی- سے کینہ توزی کے عوامل و اسباب کے بارے میں منقول ہے: ایسے انسان کے پاس علم بیان کرنے سے پرہیز کرو جو اس کا شوق نہیں رکھتا نیز گذشتہ مرتبہ و شرف کے بیان سے پرہیز کرو ایسے انسان کے پاس جو ماضی میں کوئی افتخار آمیز چیز نہیں رکھتا تھا اس لئے کہ یہ امرتیری نسبت اس کی کینہ توزی کا سبب ہوگا۔(۲)

حقد و کینہ توزی کے علائم کے بارے میں حضرت امام حسن عسکری-نے فرمایا: " لوگوں میں سب سے زیادہ رنجیدہ اور سب سے کم آسودہ کینہ توز انسان ہے "۔(۳) حضرت امام جعفر صادق۔ فرماتے ہیں: "خداوند عالم ہر روز ایک فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ آسمان پر آواز لگائے اور میرے بندوں کو نوید دے کہ میں نے تمہارے گذشتہ گناہوں کو بخش دیا اور شب قدر میں تم میں سے بعض کو بعض کا شفیع قرار دیا جز اس انسان کے جو شراب سے افطار کرے یا اپنے مسلمان بھائی سے کینہ توزی کرے۔ (٤)

حقد کے دنیوی نقصانات میں ایک یہ ہے کہ کینہ توز انسان کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔(٥) حقد اور کینہ توزی سے مقابلہ اس درجہ اہم ہے کہ قرآن کریم بعض مومنین کے قول کو نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ اپنی دعاؤں میں خداوند عالم سے اظہار کرتے ہیں: " خدا یا! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم پر سبقت رکھتے ہیں بخش دے اور ہمارے دلوں میں صاحبان ایمان کی نسبت کسی طرح بھی کینہ قرار نہ دے، خدا یا یقینا تو روؤف ومہربان ہے"۔(٦) وہ تمام چیزیں جو کینہ توزی کے بر طرف کرنے کا سبب ہیں، ان میں سے ایک ہدیہ دینا ہے۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا: "ہدیہ دینا دلوں سے کینوں اور کدورتوں کو دور کردیتا ہے"۔(٧) اسی طرح ضیافت اور مہمانداری کرنا کینہ کے برطرف ہونے کا سبب ہوتا ہے، حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں: "کینوں کی آگ کو گوشت اور روٹی سے دور کرو" (مہمان نوازی کرکے اسے ختم کرو)۔(٨)

۱۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۲۹۱، ح۹۔ ۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲۰، ص ۳۲۲، ح ٦٩٦ نیز، ص۳۲۷، ح۷٤۳۔

۳۔ حرانی، تحف ا العقول، ص ۳٦۳۔ ٤۔ قطب راوندی، دعوات، ص ۳۰۷، ح ٥٦۱۔

٥۔ صدوق، معانی الاخبار، ص ۲۰۸، ح ۳۔ ٦۔ سورۂ حشر، آیت ۱۰۔

۷۔ صدوق، عیون اخبار الرضا، ج ۲، ص ۷۳، ح ۳٤۳ ۔ کلینی، کافی، ج ٥، ص ۱٤۳، ح ۷۔

۸۔ کلینی، کافی، ج ٦، ص۳۱۸، ح ۱۰۔

۲۔ خدا وند سبحان کے لئے دشمنی

خدا وند سبحان کے لئے دشمنی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس انسان کو جو خدا کے سامنے عصیان وگناہ، طغیانی و سر کشی کرتا ہے دشمن رکھے۔ البتہ جس طرح خدا کی معصیت کے درجات و مراتب ہیں اسی طرح خدا کے لئے دشمنی کے بھی درجات مراتب ہیں۔ خدا کے مقابل سر کشی کبھی عقیدہ کے ساتھ ہے جیسے کفر و شرک اختیار کرنا اوردین میں بدعت کرنا اور کبھی رفتار وگفتار اور کبھی قول وفعل کے ساتھ دوسروں کی اذیت و آزار سے جڑی ہوتی ہے، جیسے قتل، ضرب، زخم لگانا جھوٹی گواہی دینا۔ اور کبھی دوسروں کی اذیت وآزار کا باعث نہیں ہوتی۔ یہ قسم کبھی دوسروں کے فساد کا باعث ہوتی ہے، جیسے دوسروں کے لئے فساد کے اسباب و وسائل فراہم کرنا، اور کبھی دوسروں کے فساد کا باعث نہیں بنتی۔ یہ آخری قسم کبھی گناہ کبیرہ ہے تو کبھی گناہ صغیرہ ہے۔دشمنی بھی مختلف طرح کی ہوتی ہے جیسے دوری اختیار کرنا، جداہونا، بات چیت بند کرنا، سخت کلامی کرنا، توہین و تحقیر کرنا، اس کی پیروی نہ کرنا، اس کے لئے برائی کی کوشش کرنا اور اس کی ضرورتوں اور آرزوؤں کےپورانہ ہونے کی سعی کرنا۔

واضح ہے کہ خدا کے لئے بغض کے درجات ومراتب شدت و ضعف کے اعتبار سے خدا وند سبحان کی معصیت کے مراتب و درجات کے تابع ہیں، کہ درحقیقت وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مراتب ہیں۔ قابل ذکر بات ہے کہ اگر گناہگار انسان پسندیدہ صفات کا مالک ہو جیسے علم و سخاوت، تو پسندیدہ صفات کے لحاظ سے محبوب ہے لیکن خدا کی نافرمانی اور عصیان کی بنا پر مبغوض اورنا پسند ہے۔[۱]

اس بنا پر بعض لوگوں سے محبت کرنا حرام اور بعض دیگر سے مکروہ اور خدا کے نزدیک ناگوار ہے یعنی ان سے بغض رکھنا واجب یا مستحب ہوگا۔[۲]

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص ۱۸۷، ۱۸۸۔

۲۔ ان مواردکی مزید معلومات کے لئے رجوع کیجئے سورۂ مجادلہ، آیت ۲۲۔ سورۂ ممتحنہ، آیت ۱، ۸، ۹ ۔سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۹ ۔ سورۂ ھود، آیت ۱۱۳ ۔ صفات الشیعہ، ص ۸۵، ح ۹۔ صدوق، امالی، ص ۷۰۲ ح ۹۶۰۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۲۳۷، ح ٤۔ج ۷٤، ص ۱۹۷، ح ۳۱۔ اور ج ۶۹، ص ۲۳۷، ح ۳ ۔ کلینی، کافی، ج ۲ ص، ۱۲۶، ح ۱۱، ج ۵ ص ۱۰۸، ح ۱۲ ۔ ابن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ج ۱، ص ۷۲۔ شعیری، جامع الاخبار، ص ٤۲۸، ح ۱۱۹۸؛ صدوق، فقیہ، ج ٤، ص ٤۱۷، ح ۵۹۰۷؛ تفسیر قمی، ج ۲، ص ۲۸۷۔

چوتھی فصل:

مؤثر نفسانی صفات

ز۔ نفس کو قابو میں رکھنے والے رجحان

نفس کو قابو میں رکھنے والے رجحان سے مراد وہ نفسانی صفات اور ملکات ہیں جو بہت سے اخلاقی رذائل سے روکنے کا کردار ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف متعدد اخلاقی فضیلتوںکی راہ ہموار کرتے ہیں، اس قسم میں ممتاز نفسانی صفات درج ذیل ہیں:

۱۔ نفس کی قوت

ایک ایسا نفسانی ملکہ ہے جو انسان کو اس بات کی قدرت بخشتاہے کہ پیش آنے والے حوادث خواہ کتنے ہی عظیم کیوں نہ ہوں آسانی سے تحمل کر سکے۔ قوت نفس کی فضیلت و عظمت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ خدا وند عالم قرآن کریم میںارشاد فرماتا ہے: "عزت خدا، پیغمبر خدا اور مومنین ہی کے لئے ہے"۔ (۱)

حضرت امام جعفر صادق۔نے اس سلسلہ میں فرمایا: "خدا وند عالم نے مومنین کے تمام امور اس کے حوالے کر رکھے ہیں، لیکن اس نے اجازت نہیں دی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کردے۔ آیا خدا وندعالم کا یہ کلام نہیں دیکھتے کہ اس نے فرمایا ہے: "ولله العزة و لرسولہ وللمومنین" (عزت اللہ، اس کے رسول اور مومنین ہی مخصوص ہے) لہٰذا سزاوار ہے کہ مومن با عزت ہو، ذلیل نہ ہو"۔ (۲)

(ایک) قوت نفس کے فوائد

نفسانی قوت وقدرت، نفس پر بہت سے سود مندو مفید اثرات و نتائج چھوڑتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک خود بھی نفسانی ملکہ اس کے مقابلہ نفس کیضعیف ہونے سے بہت سے اخلاقی رذائل مرتب ہوتے ہیں۔ ذیل میں انسان کی روحی عظمت فوائدکی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

۱۔ سورئہ منافقون، آیت ۸۔

۲۔ کلینی، کافی، ج ۲۔

الف۔ ثبات اور اطمینان (عدم اضطراب):

ثبات ایک ایسا نفسانی ملکہ ہے جو انسان کو اس بات کی قدرت عطا کرتا ہے کہ خطروں میں پڑ کر مشکلات اور رنج والم کی سختیوں کا، خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، مقابلہ کرے، بغیر اس کے کہ اس میں ذرہ برابر بھی شکستگی پیدا ہو۔ اس کے مقابل مشکلات وخطرات کے وقت اضطراب، تزلزل ہے۔ ثبات وپایداری کے گونا گوں مظاہر پائے جاتے ہیں کہ ان میں سب سے نمایاں شکوک وشبہات کے مقابل ایمان میں پایداری اور ثبات ہے۔ قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: "خداوندعالم صاحبان ایمان کو دنیوی اور اخروی زندگی میں محکم واستوار سخن سے ثابت وپایدار بناتا ہے"۔(۱)

واضح ہے کہ ایمان میں ثبات اور عدم تزلزل تمام اہم نفسانی رجحانات کی پایداری وثبات کا مقدمہ ہے۔ یہ امر خود بھی عمل صالح انجام دینے میں پایداری وثبات کا باعث ہوگا۔ ثبات وپایداری معرفت کا نتیجہ ہونے کے ساتھ ساتھ روح کی قوت وعظمت کا بھی نتیجہ ہے جوکہ اہم نفسانی فضائل میں سے ایک ہے۔(۲)

ب۔ بلند ہمتی:

یعنی کمال وسعادت کے حصول اورعالی ترین امورتک پہنچنے کے لئے اس طرح سے کوشش کرنا کہ ان تک پہنچنے کی راہ میں دینوی نفع ونقصان کی طرف توجہ نہیں دے۔ بلند ہمت افراد کو دنیوی منافع شاد و مسرور اور اس کے نقصانات غمگین ومحزون نہیں کرتے حتی کہ بلند اہداف تک پہنچنے میں موت اور قتل کئے جانے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کے مدمقابل کوتاہی اورپست ہمتی ہے کہ پست ہمت شخص بلند اہداف کی طلب میںکوتاہی کرتا اور صرف پست اور معمولی امورپر قناعت کرتا ہے یہ نفسانی صفت خود ہی روح کی عظمت وقوت کا نتیجہ ہے اوربلا شبہہ نفسانی فضائل میں سے ایک ہے، کیونکہ قابل قدر اوربلند انسانی اہداف تک رسائی بلند ہمتی اور عظیم جدوجہد کے بغیر میسر نہیں ہے، شہامت (شجاعت) جوکہ خود ایک با اہمیت نفسانی ملکہ ہے، اسے بلند ہمتی کے مصادیق میں شمار کیا گیا ہے۔(۳)

ج۔ غیرت وحمیت:

یعنی جس چیزکی حفاظت لازم ہے اس کی پاسداری ومحافظت کی کوشش کرنا، یہ حالت روح وشہامت کی قوت وعظمت کے نتائج میں سے ایک ہے۔ حضرت امام جعفر صادق۔نے فرمایا ہے: "خداوندتبارک وتعالی غیرت مند ہے اورہر غیرت مند کو دوست رکھتاہے اس کی غیرت مندی ہی ہے کہ اس نے برائیوں کو خواہ ظاہر ہوں یا پنہاں، حرام کیا ہے"۔(٤)

۱۔ سورئہ ابراہیم، آیت ۲۷۔ ۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲٦۲۔ ۳۔ ایضاً، ج ۱، ص ۲٦۳، ۲٦٤۔ ٤۔ کلینی، کافی، ج ٥، ص ٥۳٥، ح ۱۔

حضرت علی نے بھی فرمایا ہے: "نسان کی قدر وقیمت اس کی ہمت کے اعتبار سے ہے..... اور اس کی دلیری اس کے ننگ رکھنے کے بقدر ہے (پستیوں اور رذالتوں کو تسلیم کرنے کے اعتبار سے)، اور اس کی پاکدامنی اس کی غیرت کے بقدر ہے"۔ (۱)

علماء اخلاق نے غیرت کے متعدد مقامات اور موارد ذکر کئے ہیں اور چونکہ بعض اخلاقی نصوص اس کے خاص موارد کی طرف ناظر ہیںلہٰذا بہتر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

۱۔ دین میں غیرت:

دین میں غیرت کا لازمہ یہ ہے کہ بدعتوں اوراہانتوں کے مقابل دین کے تحفظ کی کوشش کریں، اور شبہہ ایجاد ہونے کی صورت میں اس کا شائستہ انداز میں دفاع کریں۔ دین کے احکام کی نشرو اشاعت کے لئے میں کوشاںرہیں اورامربہ معروف ونہی عن المنکر کرنے میں تساہلی سے کام نہ لیں۔

۲۔ ناموس کے لئے غیرت:

اسلام کے اخلاقی نصوص میں مردوں کو ایسی غیرت مندی کی طرف شدت کے ساتھ ترغیب دلائی گئی ہے اور ان کا یہ فریضہ بیان کیاگیا ہے اور جو انسان ایسی غیرت کا مالک نہیں ہے اس کی سختی کے ساتھ مذمت ہوئی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق۔نے فرمایا: "بے حس اور بے غیرت مردوں پر بہشت حرام کردی گئی ہے"۔ (۲) اور پیغمبر اکرم نے فرمایا: "بہشت کی خوشبو پانچ سو سالہ راہ کے فاصلہ سے انسان کے مشام تک پہنچے گی لیکن ناخلف اولاد اور بے حس وبے غیرت انسان اسے سونگھ نہیں سکتا"۔ (۳) امام محمد باقر۔نقل کرتے ہیں: اسیروںکے ایک گروہ کو رسول خدا کے پاس لایا گیا توپیغمبر نے دستور دیا کہ ان کے درمیان ایک شخص کو آزاد اور باقی کوقتل کردیا جائے۔ آزاد شدہ شخص نے سوال کیا: آپ نے مجھے کیوں آزاد کردیا؟ پیغمبر اکرم نے جواب دیا: جبرئیل نے خدا کی طرف سے مجھے خبر دی ہے کہ تم میں پانچ ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جنھیں خدا اور اس کا رسول دوست رکھتا ہے اپنی ناموس کے سلسلہ میں غیرت مند، جود و سخا، خوش اخلاقی، قول میں صداقت اور شجاعت۔ وہ انسان اس بات کے سنتے ہی مسلمان ہو گیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہا یہاں تک کہ ایک غزوہ میں درجہ شہادت پر بھی فائز ہوا"۔ (٤)

۱۔ کلینی، کافی، ج۵، ص ۵۳۷، ح ۸۔

۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ٤٧، ۳۰۵۔

۳۔ صدوق، فقیہ، ج۳، ص ٤٤٤، ح ٤٥٤٢۔

٤۔ حر عاملی، وسائل الشیعہ، ج ۲۰، ص ۱۵۵۔

یہ بات مخفی نہ رہے کہ ناموس کے سلسلہ میں حد سے زیادہ غیرت دکھانا ہرگز پسندیدہ نہیں ہے بلکہ بعض اوقات فساد کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ غیرت کا مقام وہاں ہے جہاںحرام کے ارتکاب کا یقین ہو یا انسان کو مقام تہمت وبدگمانی میں واقع ہونے کا خطرہ ہو۔ حضرت علی ؑاپنے فرزند امام حسنؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بے جا غیرت سے پرہیز کرو کہ یہ چیز صحیح و سالم عورت کو بیمار بنادے گی اور پاکدامن کو بدگمانی (اور گناہ کی فکر) میں ڈال دے گی۔[1]

۳۔ اولاد کے سلسلہ میں غیرت:

اولاد کے سلسلہ میں غیرت کا مطلب یہ ہے کہ آغاز طفولیت سے ہی ان کی مادی ضرورتوں کوپورا کرنے کے لئے حلال راستوںسے کوشش کرے۔ ان کی صحیح تربیت کرنے کے لئے کوشاں رہے اور ایسے خطرات سے اولادکی حفاظت کرے جو ان کی جسمانی یا اخلاقی صحت و سلامتی کے لئے چیلنج ہوں۔

٤۔ مال کے سلسلہ میںغیرت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ مال دنیا میں انسان کی بقا کا ضامن نیز علم و عمل اور اخروی سعادت کی تحصیل کا وسیلہ ومقدمہ ہے۔ اس وجہ سے ہر عاقل پر لازم ہے کہ اس کی تحصیل کے لئے جائز و مشروع راستوں سے کوشش کرے اور اس کی محافظت ونگہداری کے سلسلہ میںاپنی غیرت کا مظاہرہ کرے۔ مال کے متعلق غیرت دکھانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائی کے علاوہ کسی اور راہ میں ضایع نہ کرے، خود نمائی اور دکھاوے میں خرچ نہ کرڈالے، اسے بے نیازوں کے حوالے نہ کردے، اس کے خرچ کرنے اور بخشش کرنے کے سلسلہ میں اسراف کا راستہ نہ اپنائے[2]

د۔ وقار اور قلبی سکون:

اخلاقی لغت میں "وقار" رفتار و گفتار اور حرکات میں پائے جانے والے سکون واطمینان کا نام ہے۔ اس وجہ سے "وقار" ایک ایسا عام مفہوم ہے جو"تأنی" اور "توقّف" دونوں کو شامل ہوتا ہے؛ اس لئے کہ "توقف" ہر طرح کے اقدام سے پہلے لمحہ فکریہ اور اپنے اوپر کنٹرول کرنے کا نام ہے تاکہ اس اقدام کا درست ہونا انسان پر آشکار ہوجائے۔ "تأنی" گفتار ورفتار کے شروع ہونے کے بعد ذہنی سکون و اطمینان کا نام ہے تاکہ امور کو شائستگی کے ساتھ مرحلہ انجام تک پہنچا سکے۔

۱۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲٦٥، ۲۷٤۔

وقار اور قلبی اطمینان وسکون کے درمیان نسبت کے بارے میںکہا گیا ہے کہ جب بھی کوئی انسان رفتار و گفتار میں زحمت و تکلف کے ساتھ سکون کو حاکم قرار دے تو ایسے انسان کو با وقار کہتے ہیں، لیکن قلبی سکون و اطمینان اس وقت حاصل ہوگا جب سکون ایک صفت اور ملکہ کی صورت میں نفس کے اندر موجود ہو۔ بعبارت دیگر وقار ظاہری سکون اور سکینہ باطنی سکون کو کہتے ہیں۔[۱] رسول خدا وقار کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اسلام عریاں ہے اور اس کا لباس حیا اور اس کا زیور وقار ہے"۔[۲]

حضرت علی پرہیزگارونکی خصوصیت کے بارے میں فرماتے ہیں: "وہ لوگ زلزلوں (سختیوں) میں ہیں"۔[۳] حضرت امام جعفر صادق۔ اس گراں قیمت صفت کی تحصیل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: "طلب علم کی کوشش کرواور اس کے ساتھ ساتھ خود کو حلم و وقار سے آراستہ کرو"۔[٤] قرآن قلبی سکون و اطمینان کو مومنین کے صفات میں شمار کرتا ہے اور اس کی تحصیل کی راہ خداوند عالم کی یاد کو جانتا ہے۔ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل یاد الٰہی سے مطمئن ہیں، آگاہ ہو جاؤ کہ یاد الٰہی سے دلونکو اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔[٥] خداوند عالم متعدد مقامات پر اعلان کرتا ہے کہ ہم نے سکون و اطمینان کوپیغمبر اکرم اور مومنین کے دلوں پر نازل فرمایا ہے۔ "وہ ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا تاکہ وہ اپنے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کریں"۔[٦]

واضح ترین اسباب و علل جو وقار کے حصول کے لئے روایات میں بیان ہوئے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ خداوند عالم کی بندگی:

حضرت علیؑ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: جو شخص خاندان اور قبیلہ کے بغیر عزت، سلطنت کے بغیر ہیبت، مال کے بغیر بے نیازی اور جود و بخشش کے بغیر فرمانبرداری کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ خدا کی نافرمانی کی ذلّت سے نکل کر اس کی بندگی کی عزّت کی طرف آجائے۔[۷]

۱۔ جامع السعادات، ص ۲۷۹، ۲۸۰۔ ابوہلال عسکری؛ معجم الفروق اللغۃ، ص ۲۸۰؛ المیزان، طباطبائی، ج۹، ص۲۲۷ تا ۲۲۳۔ اورج۲، ص۲۸۹ تا ۲۹۱۔

۲۔ کلینی، کافی، ج۲، ص ٤٦، ح۲۔۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳۔ اسی طرح ملاحظہ ہو: صدوق، فقیہ، ج ٤، ص۳٥٤، ح ٥٧٦٢۔

٤۔ کلینی، کافی، ج ۱، ص ۳٦، ح ۱۔ ٥۔ سورئہ رعد، آیت ۲۸۔ ٦۔ سورئہ فتح، آیت ٤، نیز ملاحظہ ہو آیات ۱۸، ۲٦؛ طباطبائی، المیزان، ج ۲ ص ۲۸۹ تا ۲۹۱ اور ج ۹، ص۲۲۳ تا ۲۲۷۔ ۷۔ خزاز، قمی، کفایۃ الاثر، ص ۲۲۸؛ مجلسی بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۱۷۹، ح ۲۹۔

۲۔ علم و حکمت:

حضرت علیؑ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "جو شخص حکمت سے آگاہ ہے اس کو نگاہیں ہیبت اور وقار کی نظر سے دیکھتی ہیں"۔[۱]

۳۔ حلم:

حضرت علیؑ سے منقول ہے: "حلم وقار کا باعث ہے"۔[۲]

٤۔ سکوت:

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "زیادہ خاموشی انسان کے وقار میں اضافہ کرتی ہے"۔[۳] نیز مومنین اور پرہیزگاروں کی خصوصیات کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: "اے ہمام! مومن زیادہ سے زیادہ خاموش رہتا ہے اور باوقار ہوتا ہے"۔[٤]

٥۔ تواضع و فروتنی:

حضرت علیؑ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "فروتنی تم پر بزرگی اور شان و شوکت کا لباس پہناتی ہے"۔[٥] اسی طرح روایات میں دوسرے اسباب جیسے آہستہ گفتگو کرنا[٦] وغیرہ بیان ہوا ہے کہ اختصار کی وجہ سے انھیں ذکر نہیں کررہے ہیں۔ آیات و روایات میں اطمینان قلب کے لئے بہت سے اسباب و علل بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں سب سے اہم درج ذیل ہے:

۱۔ ازدواج:

قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: "اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے جوڑوں کو تمہارے لئے خلق فرمایا تاکہ ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت قرار دی۔ ہاں، اس (نعمت) میں صاحبان عقل و فکر کے لئے یقیناً نشانیاں ہیں"۔[۷] دوسری جگہ فرماتا ہے: "وہ ایسی ذات ہے جس نے تم کو ایک نفس سے خلق فرمایا اور اس سے جوڑے پیدا کئے تاکہ اس سے سکون حاصل کرو"۔[۸]

۲۔ عدالت:

حضرت فاطمہ زہرا ؑ فرماتی ہیں: "خداوند عالم نے ایمان کو شرک دور کرنے کا ذریعہ...... اور عدالت کو دلوں کے سکون کا باعث قرار دیا ہے"۔[۹]

۱۔ کلینی، کافی، ج ۸، ص ۲۳، ح ٤، اور ملاحظہ ہو: صدوق، علل الشرائع، ج ۱، ص ۱۱۰، ح ۹؛ مجلسی، بحار لانوار، ج ۱، ص ۱۷ تا ۱۲٤۔ ۲۔ آمدی، غرر الحکم، حکمت ٥٥۳٤۔ ۳۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۲۲٦، ح ۱۔ ٤۔ ایضاً۔ ٥۔ آمدی، غرر الحکم، ح ٤۱۸٤۔ ٦۔ کافی، ج٥، ص۳۹، ح٤۔ ۷۔ سورۂ روم، آیت ۲۱۔ ۸۔ سورۂ اعراف، آیت ۱۸۹۔ ۹۔ صدوق، من لا یحضر الفقیہ، ج۳، ص٥٦۸، ح٤۹٤۰۔ علل الشرایع، ص۲٤۸، ح۲۔ طبرسی، احتجاج، ج۱، ص۱۳٤۔

۳۔ ایمان:

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "کوئی مومن نہیں ہے مگر یہ کہ خداوندعالم اس کے ایمان کے نتیجہ میں اس کے لئے ایک انس قرار دیتا ہے کہ جس سے وہ سکون حاصل کرتا ہے، اس طرح سے کہ اگر وہ پہاڑ کی چوٹی پر بھی ہو تو اپنے مخالفین سے وحشت نہیں رکھتا"۔[۱] واضح ہے کہ اس سکون و اطمینان کا درجہ ایمان کے اعتبار سے ہے، جتنا ایمان کا درجہ زیادہ ہوگا اس سے حاصل شدہ سکون بھی زیادہ پایدار ہوگا۔

٤۔ خدا کی یاد:

قرآن کریم میں مذکور ہے: "وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں، اور ان کے دل یاد الٰہی سے مطمئن ہیں آگاہ ہوجائیں کہ یاد الٰہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔[۲]

٥۔ حق تک پہنچنا:

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "انسان کا دل ہمیشہ حق کی تلاش و جستجو میں مضطرب اور پریشان رہتا ہے اور جب اسے درک کرلیتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے"۔[۳] اس لحاظ سے شک وتردید کے علائم میں سے ایک اضطراب اور عدم سکون ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا ذہنی درد و الم ہے۔ اُن تمام مذکورہ موارد کا فقدان جو سکون و وقار کے اسباب و علل میں شمار کئے گئے ہیں ان دونوں کے تحقق کے موانع شمار ہوتے ہیں مگر چونکہ بعض دیگر امور روایات میں سکون و وقار کے موانع کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں لہٰذا ذیل میں، ان میں سے اہم ترین امور کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ لوگوں سے سوال و درخواست کرنا:

حضرت امام زین العابدینؑ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "لوگوں سے سوال کرنا انسان کی زندگی کو ذلت و خواری سے جوڑ دیتا ہے، حیا کو ختم کردیتا اور وقار کو کم کردیتا ہے"۔[٤] حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: "فقیر انسان میں ہیبت و عظمت کا وجود محال ہے

۲۔ حد سے زیادہ ہنسنا اور ہنسی مذاق کرنا:

حضرت علیؑ نے فرمایا: "جو زیادہ ہنستا ہے اس کی شان و شوکت کم ہوجاتی ہے"۔ رسولخدا فرماتے ہیں: "زیادہ ہنسی مذاق کرنا انسان کی آبرو کو ختم کردیتا ہے"۔[٥]

۱۔ مجلسی، بحار لانوار ج ٦٧، ص ١٤٨، ح ٤۔ ۲۔ رعد، ۲۸۔ ۳۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص ٤٢١، ح ٥۔ ٤۔ مجلسی، بحار لانوار، ج ٧٨، ص ١٣٦، ح ۳ و ج ٧٥، ص ١٠٨۔

٥۔ کلینی، کافی، ج ٨، ص ٢٢، ح ٤، اور ملاحظہ ہو حرانی، تحف العقول، ص ٩٦۔

نیز حضرت علی سے وصیت فرماتے ہیں: "ہنسی مذاق کرنے سے اجتناب کروکیونکہ تمہاری شان و شوکت اور عظمت ختم ہوجائے گی"۔[1] حضرت علی نے بھی فرمایا ہے: "جو زیادہ ہنسی مذاق کرتا ہے وہ کم عقل شمار ہوتا ہے"۔[2]

٣۔ مال، قدرت، علم، تعریف اور جوانی سے سر مست ہونا:

حضرت علی-کی طرف منسوب بیان کے مطابق عاقل انسان کو چاہیے کہ خود کو مال، قدرت، علم، ستائش و جوانی کی سر مستی سے محفوظ رکھے، کیونکہ یہ سر مستی انسان کی عقل کو زائل کردیتی ہے اور اس کے وقار کو ختم کردیتی ہے۔[3]

٤۔ جلد بازی:

جلد بازی سے مراد کسی کام کو بغیر سوچے سمجھے انجام دینا ہے۔ حضرت علی۔ مالک اشتر کو لکھتے ہیں: ہر گز کسی ایسے کام میں جلد بازی نہ کرو جس کا ابھی وقت نہ ہوا ہو! یا جس کام کا وقت ہوچکا ہو اس کے کرنے میں سستی نہ دکھاؤ! کوشش کروکہ ہر کام کو اس کے موقع و محل اور اس سے مخصوص وقت میں ہی انجام دو"۔[4] ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں: "کسی کام میں جب تک کہ واضح نہ ہو اس کے کرنے میں جلد بازی نہ کرو"۔[5] اور فرماتے ہیں: اس چیز میں جس میںخدا نے جلد بازی لازم نہیں قرار دی ہے اس میںجلد بازی نہ کرو۔"[6]

اسلام کے خلاقی نظام میںجلد بازی ہمیشہ نا پسند نہیں ہے، بلکہ بعض امور میں اس کی تاکید بھی کی گئی ہے، لیکن درج ذیل موارد میں جلد بازی سے روکا گیا ہے جیسے سزادینے، جنگ و خونریزی کرنے، کھانا کھانے، نماز تمام کرنے اور غور خوص کرنے میں جلد بازی سے منع کیا گیا ہے۔ نیکیوں، خدا کی خوشنودی، توبہ، عمل صالح اور تحصیل علم وغیرہ کے لئے جلد بازی کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کریم نیک امور کی جانب سبقت کرنے کی تاکید فرماتا ہے: "نیک کاموں میںایک دوسرے پر سبقت کرو"۔[7]

١۔ صدوق، امالی، ص ٢٢٣، ح ٤۔ اختصاص، ص ٢٣٠؛ کلینی، کافی، ج ٢، ص ٦٦٤، ح ٦، اور ٦٦٥، ح ١٦۔

٢۔ کلینی، کافی، ج ٨، ص ٢٢، ح ٤۔ حرانی، تحف العقول، ص ٦٩۔ ٣۔ آمدی، غرر الحکم، ح ١٠٩٤٨۔

٤۔ نہج البلاغہ، نامہ ٥٣۔ ٥۔ نہج البلاغہ، خطبہ ١٧٣۔ ٦۔ ایضاً، خطبہ ١٩٠۔ ٧۔ سورئہ بقرہ، آیت ٤٨ اور سورئہ مائدہ، آیت ٤٨۔

دو۔ نفس کے لئے خطرناک شئی

نفس کے لئے خطرناک شئی اس کا ضعیف ہونا ہے جس کے مضر اثرات ہیں اور یہ نفس کے موانع میںشمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض اثرات جیسے عدم ثبات، پست ہمتی، غیرت و حمیت کا نہ ہونا ان مباحث کے ضمن میں جو قوت نفس کے علائم میںبیان ہوئے ہیں، آشکار ہوگئے۔یہاں پر ایک دوسرا مانع یعنی "تہاون" اور "مداہنہ "کا ذکر اس کی اہمیت کی بنا پر کیا جا رہا ہے۔

"مداہنہ" سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نرمی، کوتاہی اور سستی سے کام لینا ہے"۔ [1] امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر میں سستی اور کوتاہی یا نفس کے ضعیف ہونے سے پیدا ہوتی ہے یا اس شخص کے مال اور اعتبار میں دنیوی طمع و آرزو کی وجہ سے جس کی نسبت سستی اور کوتاہی کو روا رکھتا ہے۔[2]

آیات وروایات میں دین میں نرمی اور کوتاہی کرنے کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اس کے نقصان دہ اثرات بیان کئے گئے ہیں ، جیسا کہ خدا وندعالم کفارو مشرکین کی سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے:"وہ چاہتے ہیں کہ تم نرمی سے کام لو تو وہ بھی نرمی سے کام لیں"۔[3] یعنی طرفین میںسے ہر ایک دوسرے کے دین سے متعلق سہل انگاری اور نرمی سے کام لے۔(٤) حضرت علی۔ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: " میری جان کی قسم، حق کے مخالفین گمراہی و فساد میں غوطہ لگانے والوں سے ایک آن بھی مقابلہ و جنگ کرنے میں سستی نہیں کروں گا"۔ [5] حضرت امام محمد باقر۔ فرماتے ہیں: " خداوند سبحان نے حضرت شعیب کو وحی کی کہ تمہاری قوم میں سے ایک لاکھ افراد پر عذاب نازل کروں گا، ان میں سے ٤٠ ہزار افراد برے ہیں اور ٦٠ ہزار ان کے برگزیدہ ہیں۔ حضرت شعیب نے پوچھا: خدایا ! اخیار اور برگزیدہ افراد کا جرم و گناہ کیاہے ؟ تو خداوند سبحان نے جواب دیا: ان لوگوں نے گناہگاروں کے مقابل سستی اور نرمی سے کام لیا ہے اور میرے ناراض ہونے سے وہ ان پر ناراض نہیں ہوئے "۔ [6]

١۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص ١٧٣ ؛ طریحی، مجمع البحرین، ج ١، ص ٦٦ ؛ ابن منظور، لسان العرب، ج١٣، ص ١٦٢ ؛ مجلسی ،بحار الانوار، ج ٧٥، ص ٢٨٢۔ ٢۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ٢، ص ٢٣٢ تا ٢٤٠۔ ٣۔ قلم ٩۔

٤۔ طباطبائی، المیزان، ج١٩، ص ٣٧١۔ ٥۔ نہج البلاغہ، خطبہ ٢٤۔

٦۔ تہذیب، طوسی، ج ٦، ص ١٨١ ،ح ٣٧٢ ؛ کلینی، کافی، ج ٥، ص ٥٦، ح ١۔

دین میں سستی ، سہل انگاری اور کوتاہی سے متعلق روایات میں جو نقصان دہ اور ضرر رساں اثرات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے انسانی سماج کی گراوٹ، فساد و تباہی، گناہ و عصیان کی زیادتی، سزا ودنیوی اور اخروی عذاب اور دنیا وآخرت میں نقصان وخسارہ کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ [1]

۲۔ حلم و بردباری اور غصہ کا پینا

" حلم " عربی زبان میں امور میں تامل، غوروفکر، تدبیر کرنے اور جلد بازی نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ " حلیم " اس انسان کو کہتے ہیں جو حق پر ہونے کے باوجود جاہلوں کو سزا دینے میں جلد بازی نہ کرے اور مقابل شخص کی جاہلانہ رفتار سے وجود میں آنے والے غیض وغضب سے اپنے کو قابو میں رکھے۔[2] بعض علماء اخلاق حلم کو اطمینان قلبی اور اعتماد نفس کا ایک درجہ خیال کرتے ہیں کہ اس کا مالک انسان آسانی سے غضبناک نہیں ہوتا اور ناگوار حوادث جلدی اسے پریشان اور مضطرب نہیں کرتے۔ اس وجہ سے حلم کی حقیقی ضد غضب ہے، کیونکہ حلم اصولی طور پر غضب کے وجود میں آنے سے مانع ہوجاتا ہے۔ حلم اور " کظم غیظ " (غصہ کو پینے) کے درمیان فرق کے بارے میں کہا گیا ہے کظم غیظ صرف خشم و غضب کے پیدا ہوجانے کے بعد اسے ضبط کر کے ٹھنڈا کردیتا ہے جب کہ حلم بے جا غیض و غضب کے پیدا ہونے سے مانع ہوتا ہے، پس حلم غیض و غضب کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا " کظم غیظ " اس کے پیدا ہونے کے بعد اس کے علائم کے ظاہر ہونے کو روک کر درحقیقت اس کا علاج کرتا ہے۔[3]

قرآن کریم میں حلم ۱۰ بار سے زیادہ خداوند سبحان کے صفات میں شمار کیا گیا ہے کہ ان موارد میں نصف سے زیادہ "غفور" اور "حلیم " ایک ساتھ ذکر ہوا ہے۔ [4]

۱۔ کلینی، کافی، ج ۱، ص ٤٥، ح ٦، اور ج ۸، ص ١٣٤، ح ۱۰۳، اور ص ۱۲۸، ح ۹۸؛ حرانی، تحف العقول، ص ۱۰۵، ۲۳۷؛ نہج البلاغہ، خ ۸٦، ۲۳۳؛ شیخ مفید، ارشاد، ص ۹۲۔

۲۔ ابن اثیر، نہایہ، ج ۱، ص ٤٣٤؛ ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۲، ص ١٤٦؛ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، ص ۱۲۹، مجمع البحرین، ج ۱، ص ٥٦٥۔ اور فیض کاشانی، ملا محسن، المحجۃ البیضائ، ج ٥، ص ۳۱۰۔

۳۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۹٥، ۲۹٦۔

٤۔ عبد الباقی، محمد فؤاد، المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم، ص ۲۱٦، ۲۱۷۔

اسلام کے اخلاقی نظام میںحلم اور بردباری کی قدر و منزلت اس درجہ بلند ہے کہ لوگوں کی رہبری و امامت کے ایک لوازم میں شمار کیا گیا ہے۔ رسول خدا فرماتے ہیں: "امامت اور رہبری تین خصوصیات کے مالک افراد کے علاوہ کسی کے لئے سزاوار نہیں ہے، ایسا تقویٰ جو اسے خدا کی نافرمانی سے روکے، ایسا حلم وبردباری جس کے ذریعہ وہ اپنے غصہ کو کنٹرول کرے اور لوگوں پر ایسی پسندیدہ حکمرانی کہ ان کے لئے ایک مہربان باپ کی طرح ہو"۔ [1] حضرت علی نے فرمایا: "حلم ڈھانکنے والا پردہ اور عقل شمشیر براں ہے، لہٰذا اپنی اخلاقی کمی کو بردباری سے چھپاؤ اور اپنی نفسانی خواہشات کو عقل کی شمشیر سے قتل کرڈالو"۔ [2] یعنی انسان کی اخلاقی کمی کے لئے حلم ایک پردہ ہے۔ دوسری جگہ حلم کو عزت کا بلند ترین مرتبہ [3] عاقلوں کی سرشت، [4] اور قدرت کی علامت [5] تصور کیا گیا ہے۔ کظم غیظ اور غصہ کو پینا در حقیقت تحلّم اور زحمت و کلفت کے ساتھ حلم اختیار کرنا ہے۔ اس وجہ سے کظم غیظ اہمیت کے اعتبار سے حلم سے کم درجہ رکھتا ہے، اگرچہ اپنی جگہ اہم اور قابل تعریف ہے۔ قرآن کریم کظم غیظ کو متقین کی صفت اور ایک قسم کی نیکی اور احسان جانتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کی عفو و بخشش اور ایسی بہشت کی طرف سبقت کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور وہ ان پرہیزگاروں کے لئے آمادہ کی گئی ہے۔ [6] وہ لوگ جو فراخی اور تنگی حالتوں میں انفاق کرتے ہیں اور اپنے غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں، اور خداوند عالم احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ پیغمبر اکرم نے غصہ کے پینے کی فضیلت میں فرمایا ہے: "خدا تک انسان کے پہنچنے کے محبوب ترین راستے دو گھونٹ نوش کرنا ہے، ایک غصّہ کا گھونٹ جو حلم وبردباری کے ساتھ پیا جاتا ہے اور غصّہ بر طرف ہوجاتا ہے، دوسرا مصیبت کا گھونٹ کہ جو صبر و تحمّل سے زائل ہوتا ہے" [7]

۱۔ کلینی، کافی، ج ۱، ص ۴۰۷، ح ۸۔ ۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۴۲۴۔ ۳۔ کلینی، کافی ج ۸، ص ۱۹، ح ۴۔

۴۔ صدوق، فقیہ، ج ۴، ص ۲۷۴، ح ۸۲۹۔ ۵۔ صدوق، خصال، ج ۱، ص ۱۱۶، ح ۹۶۔

۶۔ سورئہ آل عمران، آیت ۱۳۳، ۱۳۴۔ ۷۔ کلینی، کافی، ج ۲، باب کظم غیظ، ح ۹۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: "جو کوئی ایسے خشم و غضب کو کہ جسے وہ ظاہر کر سکتا ہے پی جائے تو قیامت کے دن خدا وند تعالیٰ اپنی رضا سے اس کے دل کو پر کردے گا" (۱)

الف۔ حلم اور کظم غیظ کے اسباب و موانع:

روایات میں علم، عقل، فقہ، تحلم، بلند ہمتی اور حلیم و بردبار افراد کی ہمنشینی کو حلم اختیار کرنے کے اسباب و علل میں ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت امام علی رضا فرماتے ہیں: "فقاہت کی علامتوں میں سے حلم اور سکوت ہے"۔ (۲)

نیز حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "اگر تم واقعاً حلیم نہیں ہو تو حلم کا اظہار کرو کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی قوم کی شباہت اختیار کرے اور ان میں سے نہ ہوجائے"۔(۱) اسی طرح آپ نے فرمایا: "حلم اور صبر دونوں جڑواں ہیں اور دونوں ہی بلند ہمتی کا نتیجہ ہیں"۔(۲) اس کے مقابل کچھ صفات ایسے ہیں جو حلم و بردباری کے موانع کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں کہ ان میں سے سفاہت، بیوقوفی، حماقت، دُرشت مزاجی، تند خوئی، غیض و غضب، ذلت و خواری اور ترش روئی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ (۳)

ب۔ حلم و بردباری کے فوائد:

اخروی جزا کے علاوہ آیات و روایات میں دنیوی فوائد بھی حلم و بردباری کے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ فوائد خواہ انسان کی انسانی زندگی میں نفسانی صفات اور عملی صفات ہوں خواہ انسان کی اجتماعی زندگی کے مختلف ادوار میں ظاہر ہوں، ان میں سب سے اہم فوائد یہ ہیں: سکون قلب، وقار، نجابت، رفق و مدارا، صبر، عفو و بخشش، خاموشی، سزا دینے میں جلد بازی نہ کرنا، اور خندہ روئی فردی فائدے کے عنوان سے اور کرامت و بزرگواری، کامیابی، صلح و آشتی، ریاست و بزرگی، لوگوں کے دلوں میں محبوبیت اور پسندیدہ و خوشگوار زندگی حلم و بردباری کے اجتماعی فوائد ہیں۔ ان میں سے بعض فوائد پر اس کے پہلے بحث ہوچکی ہے اور بعض دیگر ایک قسم کی رفتار (عمل) ہیں کہ عملی صفات کے بیان کے وقت ان میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔

۱۔ کلینی، کافی، ج ۲، باب کظم غیظ، ح ۶۔ ۲۔ کلینی، کافی، ج ۱، ص ۳۶، ح ۴۔ ۳۔ نہج البلاغہ، حکمت ۲۰۷؛ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱۱۲، ح ۶، ص ۲۰، ح ۴ اور تحف العقول، ص ۶۹۔ ۴۔ نہج البلاغہ، حکمت ۴۶۰۔ ۵۔ صدوق، خصال، ج ۲، ص ۴۱۶، ح ۷؛ مجلسی، بحار الانوار، ج ۱۳، ص ۴۲۱، ح ۱۵؛ غرر الحکم، ح ۲۰۰۹ اور ۳۹۴۰ ؛نراقی، جامع السعادات، ج ۱، ص ۲۷۵ اور ۲۹۵؛ فیض کاشانی، المحجۃ البیضائ، ج ۱۵، ص ۲۸۸، ۳۰۸۔

۳۔ حیا

حیا نفسانی صفات میں ایک اہم صفت ہے جو ہماری اخلاقی زندگی کے مختلف شعبوں میں بہت زیادہ اثر رکھتی ہے۔ اس تاثیر کا اہم ترین کردار خود کو محفوظ رکھنا ہے۔ "حیا" لغت میں شرم وندامت کے مفہوم میں ہے اور اس کی ضد "وقاحت" اور بے حیائی ہے۔ (۱) علماء اخلاق کی اصطلاح میں حیا ایک قسم کا نفسانی انفعال اور انقباض ہے جو انسان میں نا پسندیدہ افعال کے انجام نہ دینے کا باعث بنتا ہے اور اس کا سرچشمہ لوگوں کی ملامت کا خوف ہے۔ (۲)

آیات و روایات میں "حیا" کے مفہوم کے بارے میں مطالعہ کرنا بتاتا ہے کہ اس حالت کی پیدائش کا مرکز ایک آگاہ ناظر کے سامنے حضور کا احساس کرنا ہے، ایسا ناظر جو محترم اور گرامی قدر ہے۔ اس مفہوم کو کتاب و سنت میں مذکور حیا کے مسائل اور ابواب میں بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مفہوم حیا کی تمام اقسام کے درمیان ایک مشترک مفہوم ہے اس وجہ سے حیا کے تین اصلی رکن ہیں: فاعل، ناظر اور فعل۔ حیا میں فاعل وہ ہے جو نفسانی کرامت و بزرگواری کا مالک ہے۔ ناظر وہ ہے کہ جس کی قدرو منزلت فاعل کی نگاہ میں تعظیم اور قابل احترام ہے اور فعل جو کہ حیا کے تحقق کا تیسرا رکن ہے، برا اور ناپسندیدہ فعل ہے لہٰذا نتیجہ کے طور پر "حیا" "خوف" و "تقویٰ" کے درمیان فرق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ حیا میں روکنے والا محور ایک محترم اور بلند مرتبہ ناظر کے حضور کو درک کرنا اور اس کی حرمت کی حفاظت کرنا ہے، جبکہ خوف وتقویٰ میں روکنے والا محور، خدا کی قدرت کا درک کرنا اور اس کی سزا کا خوف ہے۔

قابل ذکر ہے کہ حیا کا اہم ترین کردار اور اصلی جوہر برے اعمال کے ارتکاب سے روکنا ہے، لامحالہ یہ رکاوٹ نیک اعمال کی انجام دہی کا باعث ہوگی۔ اسی طرح یہ بات قابل توجہ ہے کہ حیا مختلف شعبوں میں ہو جاتی ہے کہ اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی، جیسا کہ عورتوں کی حیا " اخلاق جنسی" میں، گھر میں حیا کی بحث " اخلاق خانوادہ" میں اور دوسروں سے حیا " اخلاق معاشرت " میں مورد تحقیق قرار دی جائے گی۔ یہاں پر حیا سے متعلق صرف عام اور کلی مباحث ذکر کر رہے ہیں۔

۱۔ ابن منظور، لسان العرب، ج۸، ص ۵۱؛ مفردات الفاظ قرآن کریم، ص ۲۷۰ اور ابن اثیر نہایہ، ج ۱، ص ۳۹۱۔

۲۔ ابن مسکویہ، تہذیب الاخلاق، ص ۴۱، ؛طوسی اخلاق ناصری، ص ۷۷۔

الف۔ حیا کی اہمیت:

رسول خدا حیا کو انسان کی زینت شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "بے حیائی کسی چیز کے ہمراہ نہیں ہوئی مگر یہ کہ اس کو نا پسند اور برا بنا دیا، اور حیا کسی چیز کے ہمراہ نہیں ہوئی مگر یہ کہ اسے اس نے آراستہ کردیا "۔[۱] حضرت علی نے بھی فرمایا ہے: "جو حیا کا لباس پہنتا ہے کوئی اس کا عیب دیکھ نہیں پاتا"۔ (۲) اور دوسرے بیان میں فرماتے ہیں: "حیا اختیار کرو کیونکہ حیا نجابت کی دلیل و نشانی ہے"۔[۳] حضرت امام جعفر صادق۔ حیا کے مرتبہ کو اخلاقی مکارم میں سر فہرست قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "مکارم اخلاق میں ہر ایک دوسرے سے مربوط اور جڑے ہوئے ہیں، خداوندعالم ہر اس انسان کو جو ان مکارم اخلاق کا طالب ہے دیتا ہے، ممکن ہے کہ یہ مکارم ایک انسان میں ہو لیکن اس کی اولاد میں نہ ہو، بندہ میں ہو لیکن اس کے آقا میں نہ ہو (وہ مکارم یہ ہیں) صداقت و راست گوئی، لوگونکے ساتھ سچائی برتنا، مسکین کو بخشنا، خوبیوںکی تلافی، امانت داری، صلہ رحم، دوستوں اور پڑوسیونکے ساتھ دوستی اور مہربانی، مہمان نوازی اور ان سب میں سر فہرست حیا ہے۔[٤] حضرت علی نے حیا کے بنیادی کردار کے بارے میں فرمایا: "حیا تمام خوبصورتی اور نیکی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے"۔[٥] حیا کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق۔ نے فرمایا: "جو حیا نہ رکھتا ہو اس کے پاس ایمان نہیں ہے"۔[٦] رسول اکرم کی سیرت کے بارے میں منقول ہے کہ آنحضرت جب بھی لوگوں سے بات کرتے تھے تو عرق شرم (حیا کا پسینہ) آپ کی پیشانی پر ہوتا تھا اور کبھی ان سے آنکھیں چار نہیں کرتے تھے۔[٧]

۱۔ شیخ مفید، امالی، ص ۱٦٧۔ ۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۲۲۳؛ صدوق، فقیہ، ج ٤، ص ۳۹۱ ح ۵۸۳٤۔ کلینی، کافی، ج۸، ص ۲۳۔

۳۔ آمدی، غرر الحکم، ح ۲۰۸۲۔ ٦۔ ٤۔ کلینی، کافی ج ۲، ص ۵۵ ح ۱۔ طوسی، امالی، ص ۳۰۸۔

۵۔ حرانی، تحف العقول، ص ۸٤۔ ٦۔ کلینی، کافی، ج ۲، ص۱۰٦۔ ۷۔ کافی، ج ۵، ص ۵٦۵، ح ٤۱۔

کبھی حیا کا منفی رخ سامنے آتا ہے اور وہ اس صورت میں کہ جب اس کا سبب حماقت، جہالت، اور نفس کی کمزوری ہو۔ اسلامی اخلاق میں ایسی شرم و حیا کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اسے اخلاقی فضیلت شمار نہیں کیا گیا ہے بلکہ انسان کے رشد و علو کے لئے رکاوٹ اور مختلف شعبوںمیں اس کے پچھڑنے کا سبب ہوتی ہے۔ روایات میں اس طرح کی شرم کو جہل و حماقت اور ضعف کی حیا کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ (۱)

ب۔ حیا کے اسباب و موانع:

بعض وہ امور جو روایات میں حیا کے اسباب کے عنوان سے ذکر کئے گئے ہیں، درج ذیل ہیں:

۱۔ عقل:

رسول خدا نے ایک عیسائی راہب (شمعون بن لاوی بن یہودا) کے جواب میں کہ اس نے آپ سے عقل کے علائم و ماہیت کے بارے میں سوال کیا تھا، فرمایا: "عقل حلم کی پیدائش کا باعث ہے اور حلم سے علم، علم سے رشد، رشد سے عفاف اور پاک دامنی، عفاف سے خوداری، خوداری سے حیا، حیا سے وقار، وقار سے عمل خیر کی پابندی اور شر سے بیزاری اور شر سے تنفر سے نصیحت آمیز اطاعت حاصل ہوتی ہے۔ (۲)

۲۔ ایمان:

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں: "جو حیا نہیں رکھتا وہ ایمان بھی نہیں رکھتا"۔

اسی طرح روایات میں کچھ امور کو حیا کے موانع بے حیائی کے اسباب و علل کے عنوان سے پہچنوایا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم درج ذیل ہیں: ایک۔ حرمتوں اور پردوں کو اٹھا دینا: حضرت امام موسیٰ کاظم۔ اپنے اصحاب سے فرماتے ہیں: "شرم و حیا کا پردہ اپنے اور اپنے بھائیونکے درمیان سے نہ اٹھاؤ اور اس کی کچھ مقدار باقی رکھو، کیونکہ اس کا اٹھانا حیا کے اٹھانے کے مترادف ہے"۔ (۳)

۳۔ لوگونکی طرف دست سوال دراز کرنا:

حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: "لوگوں کی طرف دست سوال دراز کرنا عزت چھین لیتا ہے اور حیا کو ختم کردیتا ہے"۔ (٤)

۱۔ صدوق، خصال، ج ۱، ص۵۵، ح ٧٦؛ کلینی، کافی، ج۲، ص ۱۰٦، ح ٦۔ ۲۔ حرانی، تحف العقول، ص ۱۹، اسی طرح ملاحظہ ہو، ص ۲۷؛ صدوق، خصال، ج ۲، ص٤۰٤، ٤۲۷؛ کلینی، کافی، ج۱، ص ۱۰، ح ۲۔ اور ج ۲، ص ۲۳۰۔ ۳۔ کافی، ج ۲، ص ٦٧۲، ح٥۔ ٤۔ ایضاً، ج۲، ص ۱٤۸، ح ٤۔

٣۔ زیادہ بات کرنا:

حضرت علی نے فرمایا: "جو زیادہ بولتا ہے وہ زیادہ خطا کرتا ہے اور جو زیادہ خطا کرتا ہے اس کی شرم و حیا کم ہو جاتی ہے اور جس کی شرم کم ہوجاتی ہے اس کی پارسائی کم ہوجاتی ہے اور جس کی پارسائی کم ہوجاتی ہے اس کا دل مردہ ہوجاتا ہے"۔ [١]

٤۔ شراب خوری:

حضرت امام علی رضاؑ کی طرف منسوب ہے کہ آپ نے شراب کی حرمت کی علت کے بارے میں فرمایا: "خداوند سبحان نے شراب حرام کی کیونکہ شراب تباہی مچاتی ہے، عقلوں کو حقائق کی شناخت میں باطل کرتی ہے اور انسان کے چہرہ سے شرم و حیا ختم کردیتی ہے"۔ [٢]

ج۔ حیا کے فوائد:

روایت میں حیا کے کثرت سے فوائد پائے جاتے ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا اخروی، فردی ہوں یا اجتماعی، نفسانی ہوں یا عملی، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

١۔ خدا کی محبت:

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: " خدا وند سبحان، حیا دار، با شرم اور پاکدامن انسان کو دوست رکھتا ہے اور بے شرم فقیر کی بے شرمی سے نفرت کرتا ہے"۔ [٣]

٢۔ عفّت اور پاکدامنی:

حضرت علی فرماتے ہیں: "حیا کا نتیجہ عفّت اور پاکدامنی ہے"۔ [٤]

٣۔ گناہوں سے پاک ہونا:

حضرت امام زین العابدین اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: "چار چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی کے پاس ہوں تو اس کا اسلام کامل اور اس کے گناہ پاک ہوجائیں گے اور وہ اپنے رب سے ملاقات اس حال میں کرے گا، کہ خدا وند عالم اس سے راضی و خوشنود ہوگا، جو کچھ اس نے اپنے آپ پر لوگوں کے نفع میں قرار دیا ہے خدا کے لئے انجام دے اور لوگوں کے ساتھ اس کی زبان راست گوئی کرے اور جو کچھ خدا اور لوگوں کے نزدیک برا ہے اس سے شرم کرے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اخلاق ہو"۔ [٥]

١۔ نہج البلاغہ، حکمت ٣٤٩۔ ٢۔ فقہ الرضا، ص ٢٨٢۔ ٣۔ طوسی، امالی، ص ٣٩، ح ٤٣۔ کلینی، کافی، ج ٢، ص ١١٢، ح٨؛ صدوق، فقیہ، ج٣، ص ٥٠٦، ح٤٧٧٤۔

٤۔ آمدی، غرر الحکم، ح ٤٦١٢۔ ٥۔ صدوق،، خصال، ج ١، ص ٢٢٢، ح ١٥٠ ۔ مفید، امالی، ص ١٦٦، ح ١۔

٤۔ رسول خدا نے شرم و حیا کے کچھ فوائد کی شرح کے ذیل میں فرمایا ہے:

"جو صفات حیا سے پیدا ہوتے ہیں یہ ہیں: نرمی، مہربانی، ظاہر اور مخفی دونوں صورتوں میں خدا کو نظر میںرکھنا، سلامتی، برائی سے دوری، خندہ روئی، جود و بخشش، لوگونکے درمیان کامیابی اور نیک نامی، یہ ایسے فوائد ہیں جنھیں عقلمند انسان حیا سے حاصل کرتا ہے"۔ (١)

اسلام کی اخلاقی کتابوں میں "وقاحت" اور "بے شرمی" سے متعلق بہت سے بیانات ہیںلہٰذا ہم اختصار کی خاطر صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق۔ اپنے شاگرد "مفضل" سے فرماتے ہیں: "اے مفضل! اگر حیا نہ ہوتی تو انسان کبھی مہمان قبول نہیں کرتا، اپنے وعدہ کو وفا نہیں کرتا، لوگوں کی ضرورتوں کو پورا نہ کرتا، نیکیوں سے دور ہوتا اور برائیوں کا ارتکاب کرتا۔ بہت سے واجب اور لازم امور حیا کی وجہ سے انجام دئے جاتے ہیں، بہت سے لوگ اگر حیا نہ کرتے اور شرمسار نہ ہوتے تو والدین کے حقوق کی رعایت نہیں کرتے، کوئی صلہ رحمی نہ کرتا، کوئی امانت صحیح وسالم واپس نہیں کرتا اور فحشا و منکر سے باز نہیں آتا"۔ (٢)

د۔ حیا کے مقامات:

بیان کیا جاچکا ہے کہ "حیا" ناظر محترم کے حضور برے اعمال انجام دینے سے شرم کرنا ہے۔ اس بنا پر پہلے: اسلام کی اخلاقی کتابوں میں خدا، اس کی طرف سے نظارت کرنے والے، اس کے نمایندے، انسان اور دوسروں کی انسانی اور الٰہی حقیقت کا ذکر ایک ایسے ناظر کے عنوان سے ہوا ہے کہ جن سے شرم وحیا کرنی چاہیے۔ (٣)

دوسرے: حیا کے لئے ناپسندیدہ اور امور ہیں اور نیکیوں کی انجام دہی میں شرم و حیا کبھی ممدوح نہیں ہے لیکن اس حد و مرز کی رعایت بہت سے افراد کی طرف سے نہیں ہوتی ہے، اس کا سبب کبھی جہالت ہے اور کبھی لاپرواہی۔ بہت سی روایات میں بعض موقع پر حیا کرنے سے ممانعت کی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ حیا کے مفہوم میں پہلے بیان کئے گئے ضابطہ و قانون کے باوجود یہ تاکید اس وجہ سے ہے کہ انسان ان موارد کی نسبت ایک طرح علمی شبہہ رکھتا

١۔ حرانی، تحف العقول، ص ٢٠۔ ٢۔ مجلسی، بحار ج ٣، ص ٨١۔

٣۔ صدوق، عیون اخبار الرضا، ج ٢، ص ٤٥، ح ١٦٢؛ کراجکی، کنز الفؤائد، ج ٢، ص ١٨٢؛ طوسی، امالی، ص ٢١٠۔

ہے اور ایک حدتک ان مواردمیں حیا کرنے کی تائید کے لئے توجیہات گڑھنے کی کوشش کرتا ہے، جب کہ اس کے خیالات و تصورات باطل ہیں۔ وہ بعض موارد اور مقامات جہاں حیا نہیں کرنی چاہیے، درج ذیل ہیں:

۱۔ حق بات، حق عمل اور حق کی درخواست میں حیا کرنا: پیغمبر اکرم نے فرمایا: "کوئی عمل بھی ریا اور خود نمائی کے عنوان سے انجام نہ دو اور اسے شرم و حیا کی وجہ سے ترک نہ کرو"۔[۱]

۲۔ تحصیل علم سے حیا کرنا:

حضرت علی نے فرمایا: "کوئی شخص جو وہ نہیں جانتا ہے اس کے سیکھنے میں شرم نہ کرے"۔[۲]

۳۔ حلال درآمد کے حصول میں حیا کرنا:

حضرت امام جعفر صادقـ نے فرمایا: "اگر کوئی مال حلال طلب کرنے میں حیا نہ کرے تو اس کے مخارج آسان ہوجائیں گے اور خدا اس کے اہل و عیال کو اپنی نعمت سے فیضیاب کرے گا"۔[۳]

٤۔ مہمانونکی خدمت کرنے سے حیا کرنا:

حضرت علیـ نے فرمایا: "تین چیزیں ایسی ہیں جن سے شرم نہیں کرنی چاہیے، منجملہ ان کے انہیں میں مہمانوں کی خدمت کرنا ہے"۔[٤]

٥۔ دوسروں کا احترام کرنے سے حیا کرنا:

حضرت علی نے فرمایا: "تین چیزوں سے شرم نہیں کرنی چاہیے: منجملہ ان کے اپنی جگہ سے باپ اور استاد کی تعظیم کے لئے اٹھنا ہے"۔[٥]

٦۔ نہ جاننے کے اعتراف سے حیا کرنا:

حضرت علی نے فرمایا: "اگر کسی سے سوال کریں اور وہ نہیں جانتا تو اسے یہ کہنے میں کہ "میں نہیں جانتا" شرم نہیں کرنی چاہیے"۔[٦]

۱۔ حرانی، تحف العقول، ص ٤٧، ؛ صدوق، امالی، ص ۳۹۹، ح ۱۲، ؛ کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱۱۱، ح ۲، اور ج ٥، ص ٥٦٨، ح ٥۳ ۔ ۲۔ نہج البلاغہ، حکمت ۸۲؛ حرانی، تحف العقول، ۳۱۳۔ ۳۔ حرانی، تحف العقول، ص٥۹؛ صدوق، فقیہ، ج ٤، ص ٤۱۰، ح ٥۸۹۰۔ ٤۔ آمدی، غرر الحکم، ح ٤٦٦٦۔ ٥۔ غرر الحکم۔

٦۔ نہج البلاغہ، حکمت، ۸۲؛ صدوق، خصال، ج ۱، ص ۳۱٥، ح ۹٥۔

۷۔ خداوند عالم سے درخوست کرنے میں حیا کرنا:

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "کوئی چیز خدا کے نزدیک اس بات سے زیادہ محبوب نہیں ہے کہ اس سے کسی چیز کا سوال کیا جائے، لہٰذا تم میں سے کسی کو رحمت خداوندی کا سوال کرنے سے شرم نہیں کرنی چاہیے، اگرچہ اس کا سوال جوتے کے ایک فیتہ کے متعلق ہو"۔ [۱]

۸۔ معمولی بخشش کرنے سے حیا کرنا:

حضرت علی نے فرمایا: "معمولی بخشش کرنے سے شرم نہ کروکہ اس سے محروم کرنا اس سے بھی کمتر ہے۔"[۲]

۹۔اہل و عیال کی خدمت کرنے سے حیا کرنا:

حضرت امام جعفر صادقؑ نے مدینہ کے ایک انسان کو دیکھا کہ اس نے اپنے اہل و عیال کے لئے کوئی چیز خریدی ہے اور اپنے ہمراہ لئے جا رہا ہے، جب اس انسان نے امام کو دیکھا تو شرمندہ ہوگیا امام نے فرمایا: "یہ تم نے خود خریدا ہے اور اپنے اہل و عیال کے لئے لے جا رہے ہو؟ خدا کی قسم، اگر اہل مدینہ نہ ہوتے (کہ ملامت اور نکتہ چینی کریں) تو میں بھی اس بات کو دوست رکھتا کہ کچھ خرید کر اپنے اہل و عیال کے لئے لے جاؤں"۔ [۳]

٤۔ عفّت

نفسانی صفات میںایک دوسری روکنے والی صفت عفّت اور پاکدامنی ہے۔ "عفّت" لغت میں ناپسند اور قبیح امر کے انجام دینے سے اجتناب کرنے کے معنی میں ہے۔ [٤] علم اخلاق کی اصطلاح میں "عفت" نام ہے اس نفسانی صفت کا جو انسان پر شہوت کے غلبہ اور تسلّط سے روکتی ہے۔ [٥] شہوت سے مراد اس کا عام مفہوم ہے کہ جو شکم و خوراک کی شہوت، جنسی شہوت، بات کرنے کی شہوت اور نظر کرنے کی شہوت اور تمام غریزوں (شہوتوں) کو شامل ہوتی ہے، حقیقت عفّت یہ ہے کہ شہوتوںاورغریزوں سے استفادہ کی کیفیت میں ہمیشہ شہوتوں کی جگہ عقل و شرع کا غلبہ اور تسلط ہو۔ اس طرح شہوتوں سے منظّم و معیّن عقلی وشرعی معیاروں کے مطابق بہرہ مند ہونے میں افراط و تفریط نہیں ہوگی۔

۱۔ کلینی، کافی، ج٤، ص ۲۰ ح ٤۔ ۲۔ نہج البلاغہ، حکمت، ٦۷۔ ۳۔ کلینی، کافی، ج۲، ص۱۲۳، ح۱۰۔ ٤۔ لسان العرب، ج ۹، ص ۲٥۳، ۲٥٤؛ جوہری، صحاح اللغۃ، ج ٤، ص ۱٤۰٥، ۱٤۰٦؛ نہایہ، ج ۳، ص ۲٦٤۔ ٥۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن ص ۳٥۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۱٥ ۔

الف۔ عفّت کے اقسام:

عفّت کے لئے بیان شدہ عام مفہوم کے مطابق عفّت کے مختلف ابعاد وانواع پائے جاتے ہیں کہ ان میں سب سے اہم درج ذیل ہیں:

۱۔ عفّت شکم:

اہم ترین شہوتوںمیں سے ایک اہم کھانے کی شہوت و خواہش ہے۔ کھانے پینے کے غریزہ سے معقول ومشروع (جائز) استفادہ کو عفّت شکم کہا جاتا ہے جیسا کہ اس عفّت کے متعلق قرآن میں اس آیت کی طرف اشارہ کیاجا سکتا ہے کہ فرماتا ہے: "تم میں جو شخص مالداراور تونگر ہے وہ (یتیموں کا مال لینے سے) پرہیز کرے اور جو محتاج اور تہی دست ہے تو اسے عرف کے مطابق (بقدر مناسب) کھانا چاہیے"۔[۱] اس عفّت کی تفصیلی بحث اقتصادی اخلاق میںکی جاتی ہے۔

۲۔ دامن کی عفت: جنسی غریزہ قوی ترین شہوتوں میں سے ایک ہے اسے جائز ومشروع استعمال میں محدود کرنا اور محرمات کی حد تک پہونچنے سے روکنا "عفّت دامن" یا پاکدامنی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اسی معنی میں عفّت کا استعمال درج ذیل آیت میں ہوا ہے: "جن لوگوںمیں نکاح کرنے کی استطاعت نہیں ہے انھیں چاہیے کہ پاکدامنی اور عفّت سے کام لیں یہاں تک کہ خدا انھیںاپنے فضل سے بے نیاز کردے"۔[۲]

اس عفّت کی بحث تفصیلی طورپراخلاق جنسی میں بیان کی جائے گی ۔اگرچہ اپنے آپ کو شہوتوںکے مقابل بچانا شکم اوردامن کی شہوت میں منحصر نہیں ہے، بلکہ تمام شہوتوں کو شامل ہے لیکن چونکہ یہ دونوں ان سب کی رئیس ہیں اور اخلاق کی مشہور کتابوں میں صرف انھیںدو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے حتیٰ بعض علماء نے ان دو کو عفّت کی تعریف میں بھی شامل کیا ہے،[۳] لہٰذا انھیں دو قسموں کے ذکرپر اکتفا کی جاتی ہے۔ دوسری طرف ان دو قسموں میں سے ہر ایک، ایک خاص عنوان سے مربوط ہے لہٰذا ہر ایک کی اپنے سے متعلق عنوان میں مفصل بحث کی جائے گی، یہا ں پر ان کے بعض کلی اور مشترک احکام کا ذکر کررہے ہیں۔

۱۔ سورئہ نسائ، آیت ٦، اسیطرح سورئہ بقرہ، آیت ۲۷۳ ملاحظہ ہو۔

۲۔ سورئہ نور، آیت ۳۳؛ اسی طرح ملاحظہ ہو: آیت ٦۰۔

۳۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص۱۵۔

ب۔ عفّت کی اہمیت:

حضرت علی نے فرمایا: " سب سے افضل عبادت عفّت ہے " ۔[1] اور حضرت امام محمد باقرؑ سے منقول ہے: "خدا کے نزدیک بطن اور دامن (شرمگاہ) کی عفّت سے افضل کوئی عبادت نہیں ہے "۔ [2] اور جب کسی نے آپ سے عرض کیا کہ میں نیک اعمال انجام دینے میں ضعیف اور کمزور ہوں اور کثرت سے نماز نہیں پڑھ سکتا اور زیادہ روزہ نہیں رکھ سکتا، لیکن امید کرتا ہونکہ صرف مال حلال کھاؤں اور حلال طریقہ سے نکاح کروں تو حضرت امام محمد باقرؑ نے فرمایا: " عفّت بطن ودامن سے افضل کون سا جہاد ہے ؟"[3] رسول خدا اپنی امت کے سلسلہ میں بے عفتی اور ناپاکی کے بارے یںاپنی پریشانی کا اظہاریوں کرتے ہیں: "میں اپنے بعد اپنی امت کے لئے تین چیز کے بارے میں زیادہ پریشان ہوں معرفت کے بعد گمراہی، گمراہ کن فتنے اور شہوت بطن ودامن"۔[4]

ایک دوسرے بیان میں فرماتے ہیں: "میری امت کے جہنم میں جانے کا زیادہ سبب شہوت شکم ودامن کی پیروی کرنا ہے" ۔[5]

ج۔ عفّت کے اسباب:

شکم اور دامن کی عفّت میں سے ہر ایک کے پیدا ہونے کے اسباب اقتصادی اور جنسی اخلاق سے مربوط بحث اور اس کے مانند دوسری بحثوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن روایت میں عام عوامل واسباب جیسے عقل، ایمان، تقویٰ حیا و مروت کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اختصار کی رعایت اور ایک حد تک ان کی علت کے واضح ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہیں۔

۱۔ کلینی، کافی، ج۲، ص۷۹، ح۳۔

۲۔ جامع السعادات، ص۸۰، ح۸ ۔ ص ۷۹، ح ۱۔

۳۔ جامع السعادات، ص۷۹، ح ٤ ۔

٤۔ جامع السعادات، ح ٦ ۔

۵۔ جامع السعادات، ص۸۰، ح۷۔

د۔ عفّت کے موانع:

عفّت کے عام موانع میں "شرارت" اور "خمود" (سستی اور سہل انگاری) ہے، ان دونوں کی مختصر توضیح درج ذیل ہے:

۱۔ شرارت:

شرارت سے مراد اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے شہوانی قوتوں کی پیروی کرنا ہے اس چیزیں جو وہ طلب کرتی ہیں، (۱) خواہ وہ شہوت شکم ہو یا شہوت مال دوستی یا اس کے مانند کسی دوسری چیز کی شہوت ۔ شرارت یعنی جنسی لذتوں میں شدید حرص کا ہونا اور ان میں زیادتی کا پایا جانا۔ (۲) حضرت علی- نے شرارت کی مذمت میں فرمایا ہے: "شرارت تمام عیوب کی رئیس ہے"۔ (۳) حضرت امام جعفر صادق- کا بیان اس سلسلہ میں یہ ہے: کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ خدا نے تم پر حرام کیا ہے اس کا تمہارا نفس حریص ہوجائے کیونکہ جو شخص بھی دنیا میں حرام خداوندی کا مرتکب ہوگا خداوند سبحان اسے جنت سے اور اس کی نعمتوں اور لذتوں سے محروم کردے گا"۔ (٤)

۲۔ خمود:

"شرارت" کے مقابل ہے یعنی ضروری خوراک کی فراہمی میں کاہلی اور کوتاہی کرنا اور جنسی غریزہ سے ضروری استفادہ کرنے میں سستی اور کوتاہی کرنا اس طرح سے کہ صحت و سلامتی، خاندان کی تباہی اور نسل کے منقطع ہونے کا سبب بن جائے ۔ یہ واضح ہے کہ یہ حالت غریزوں اور شہوتوں سے استفادہ میں تفریط اور کوتاہی کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ (۵) "خمود" حکمت خلقت کے مخالف اور نسل انسان کے استمرار و دوام نیز اس کی بقا اور مصلحت کے مخالف ہے، اس کے علاوہ اسلامی اخلاق میں غرائز و شہوات سے جائز استفادہ کی جو کثرت سے تاکید پائی جاتی ہے اور جو کچھ رہبانیت اور دنیا سے کنارہ کشی کی مذمت کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے وہ سب " خمود" کی قباحت کو بیان کرتے ہیں۔ اس امر کی تفصیلی بحث " اخلاق جنسی " میں ہوگی۔

۱۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۳، ص ٥٠٦۔ ۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ٤۔ ۳۔ کلینی، کافی، ج۸، ص ۱۹، ح ٤؛ نہج البلاغہ، حکمت، ۳۷۱۔ ٤۔ کلینی، کافی، ج۸، ص ٤، ح ۱۔ ٥۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۳۔

ہ۔ عفّت کے فوائد:

روایات میں عفّت کے متعدد دنیوی اور اخروی فوائد بیان کئے گئے ہیں جیسے پستیوں سے نفس کی حفاظت کرنا، شہوتوں کو کمزور بنانا اور عیوب کا پوشیدہ ہونا کہ یہاں اختصار کے پیش نظر رسول خدا کے ایک کلام کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کررہے ہیں۔

عفّت کے علائم یہ ہیں: جو کچھ ہے اس پر راضی ہونا، اپنے کو معمولی اور چھوٹا سمجھنا، نیکیوں سے استفادہ کرنا، آسائش اور راحت میں، اپنے ماتحتوں اور مسکینوں کی دل جوئی، تواضع، یادآوری (غفلت کے مقابل)، فکر، جود و بخشش اور سخاوت کرنا۔[۱]

۵۔ صبر

نفسانی صفات میں سب سے عام اور اہم روکنے والی صفت "صبر" ہے۔ "صبر" کے معنی عربی لغت میں حبس کرنے اور دباؤ میں رکھنے کے ہیں۔[۲] اور بعض نے اسے بے تابی اور بے قراری سے نفس کو باز رکھنے سے تعبیر کیا ہے۔[۳] اخلاقی اصطلاح میں صبر نام ہے نفس کو اس چیز کے انجام دینے اور آمادہ کرنے جس میں عقل و شرع کا اقتضاء ہو نیز اس چیز سے روکنا جسے عقل و شرع منع کرتے ہیں۔[٤] مذکورہ تعریفوں کے پیش نظر "صبر" ایک ایسی عام اور روکنے والی نفسانی صفت ہے کہ جس میں دو اہم جہت پائے جاتے ہیں: صبر ایک طرف انسان کی غریزی اور نفسانی خواہش اور میلان کو حبس اور دائرۂ عقل و شرع میں محدود کرتا ہے۔ دوسری طرف نفس کو عقل و شرع کے مقابل ذمہ داری سے فرار اختیار کرنے سے روکتا ہے اور اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ اپنے کو فرائض الٰہی کی پابندی کے لئے زحمت اٹھانے اور دشواریوں کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ کرے، البتہ اگر یہ حالت انسان میں سہولت و آسانی سے پیدا ہوجائے تو اسے "صبر" اور اگر انسان زحمت و مشقت میں خود کو مبتلا کرکے اس پر آمادہ کرے تو اسے "تصبر" (زبردستی صبر کرنا) کہتے ہیں۔

۱۔ حرانی، تحف العقول، ص۲۰۔

۲۔ زبیدی، تاج العروس، ج ۷، ص ۷۱؛ راغب اصفہانی، مفردات، ٤٧٤؛ ابن منظور، لسان العرب، ج ٤، ص ٤٣٨۔

۳۔ جوہری، صحاح اللغۃ، ج ۲، ص ۷۰٦۔ طریحی، مجمع البحرین، ج ۲، ص ۱۰۰٤۔

٤۔ راغب اصفہانی، معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ٤٧٤۔

الف۔ صبر کی قسمیں:

صبر کے لئے جو عام اور وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق علماء اخلاق نے متعدد جہات سے صبر کے لئے مختلف اقسام و انواع بیان کی ہیں کہ ان میں سے اہم ترین اقسام کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ مفہوم کے لحاظ سے:

مذکورہ تعریفوں کے مطابق کبھی صبر سے مراد نفسانی جاذبوں اور دافعوں میں ہر قسم کی محدودیت کا ایجاد کرنا ہے کہ جو ایک عام مفہوم ہے اور کبھی اس سے مراد ناگوار امور کی نسبت عدم رضایت اور بے تابی کے اظہار سے نفس کو روکنا ہے۔ اس لحاظ سے صبر کے دو مفہوم ہیں کہ کبھی خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ موضوع کے لحاظ سے:

صبر اپنے عام مفہوم میں موضوع کے اعتبار سے متعدد انواع کا حامل ہے۔

کبھی صبر سختیوں اور مصیبتوںپر ہوتا ہے جو کہ ان سختیوں اور مصیبتوں کے مقابل مضطرب وپریشان نہ ہونا اور سعہ صدر کی حفاظت ہے، اسے "مکروہات پر صبر" کہتے ہیں اور اس کے مقابل "جزع" اور بے قراری ہے صبر کی رائج قسم یہی ہے۔ جنگ کی دشواریوں پر صبر کرنا "شجاعت" ہے اور اس کے مقابل "جبن" بزدلی اور خوف ہے۔ اور کبھی صبر غیض و غضب کی سرکشی اور طغیانی کے مقابل ہے کہ اسے "حلم" اور "کظم غیظ" کہتے ہیں۔ کبھی صبر عبادت کے انجام دینے میں ہے کہ اس کے مقابل "فسق" ہے جو شرعی عبادت کی پابندی نہ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اور کبھی صبر شکم کی شہوت اور جنسی غریزہ کے مقابل ہے کہ جسے "عفّت "کہتے ہیں۔ اور دنیا طلبی اور زیادہ طلبی کے مقابل ہے جو کہ "زہد" ہے اور اس کے مقابل "حرص" ہے۔

اور کبھی صبر اسرار کے کتمان پر ہوتا ہے کہ جسے رازداری کہتے ہیں۔ [1]

۳۔ حکم کے لحاظ سے:

صبر اپنے تکلیفی حکم کے اعتبار سے پانچ قسم میں تقسیم ہوتا ہے: واجب صبر جو کہ حرام شہوات و میلانات کے مقابل ہے۔ اور مستحب صبر مستحبات کے انجام دینے پر ہونے والی دشواریوں کے مقابل ہے۔ حرام صبر جو بعض اذیت و آزار پر ہے جیسے انسان کے مال، جان اور ناموس پر دوسروں کے تجاوز کرنے پر صبر کرنا۔ صبر ناگوار اور مکروہ امور کے مقابل جیسے عاشور کے دن روزہ رکھنے کی سختی پر صبر کہ جو مکروہ ہے ان موارد کے علاوہ مباح ہے، لہٰذا ہمیشہ صبر پسندیدہ اور محبوب شئ نہیں ہے، بلکہ کبھی حرام اور کبھی مکروہ بھی ہوجاتا ہے۔ [2]

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص۲۸۰، ۲۸۱؛ رسول اکرم نے ایک حدیث میں صبر کی تین قسم بیان کی ہے: مصیبت کے وقت صبر، طاعت و بندگی پر صبر، اور معصیت و گناہ پر صبر۔ کلینی، اصول کافی، ج ۲، ص ۹۱، ح ۱۵۔ اسی طرح بعض علماء اخلاق نے صبر کو اس وجہ سے دو قسم پر تقسیم کیا ہے متاع دنیا (سراء) پر صبر اور بلا (ضراء) پر صبر۔ ملاحظہ ہو نراقی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۹۳، ۲۹۴۔

۲۔ نراقی، جامع السعادات، ج۳، ص ۲۸۵۔

ب۔ صبر کے درجات:

بعض علماء اخلاق اور اہل معرفت ناگوار امور پر صبر کرنے (صبر خاص) کے لئے تین درجوں کے قائل ہوئے ہیں۔

١۔ تائبین کا صبر: اوراس سے مراد ہے شکوہ کا ترک کرنا، بے تابی اور بے قراری کا ثبوت نہ دینا، اور غیر فطری اورپریشان کن رفتارنہ رکھنا۔

٢۔ زاہدین کا صبر: یعنی اول درجہ کے علاوہ جو سختیاں، درد والم انسان کے لئے مقدر ہوئی ہیں ان پر قلبی طور سے راضی ہونا۔

٣۔ صدیقین کا صبر: یعنی پہلے دودرجہ کے علاوہ نسبت اس چیز سے جو خدا وند عالم نے اس کے لئے معین کر رکھا ہے، عشق کرنا اور اسے دوست رکھنا۔ (١)

ج۔ صبر کی اہمیت:

کلمہ "صبر" مختلف صورتوں میں سو بار سے زیادہ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے کہ جس سے خود ہی اس موضوع کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کریم بعض بنی اسرائیل کی ہدایت وپیشوائی کے منصب تک پہونچنے کی علت کے بیان میںفرماتا ہے: "اور جب انہوں نے صبر کیا اس حال میں میری آیتوں پر یقین رکھتے تھے تو ہم نے ان میں سے بعض کو پیشوا قرار دیا کہ وہ ہمارے حکم سے (لوگوں کی) ہدایت کرتے تھے"۔ (٢) اور آخرت میں صابروں کی کیفیت جزا کے بارے میں ایک جگہ پر ان کے عمل سے بہتر جزا کا وعدہ دیتا ہے: "یقیناً جن لوگوں نے صبر کیا تو جو انہوں نے عمل کیا ہے ہم انھیں اس سے بہتر جزا دیں گے"۔ (٣)

دوسری آیت میں صابروں کی مقدار جزا کی تعیین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: "وہ لوگ کہ جنہوں نے صبر کیا اور نیکیوں سے برائی کو دور کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیںروزی دی ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں اس لئے وہ لوگ دہری جزا پائیں گے"۔ (٤)

١۔ نراقی، جامع السعادات، ج٣، ص ٢٨٤۔

٢۔ سجدہ ٢٤۔

٣۔ نمل ٩٦۔

٤۔ قصص ٥٤۔

دوسری جگہ پر اعلان کرتا ہے کہ صابروں کا اجر اور ان کی جزا بے حد اور ناقابل شمار ہے اور وہ لوگ بے حساب جزا پائیں گے: "بے شک صابرین اپنی جزا بے حساب پوری پوری پائیں گے"۔ [۱] اسی طرح خداوند عالم نے صابروں کو ہمراہی کا وعدہ دیا ہے: "صبر کرو کیونکہ خدا صابروں کے ساتھ ہے"۔ [۲] وہ نصرت اور کامیابی کو صرف اور صرف صبر و شکیبائی کے سایہ ممکن جانتا ہے"۔ [۳] ہدایت، درود اور رحمت پروردگار کو صابروں کے حق میں قرار دیتا ہے۔ [٤] صابروں کو اپنے دوستوں اور محبوبوںکے زمرہ میں بیان کرتا ہے۔ [٥] بارہا اور بارہا اپنے رسولوںاور تمام انسانوں کو صبر کی تاکید کرتا ہے۔ [٦] اپنے خاص بندوں کے بارے میں نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ خداوند سبحان سے صبر و شکیبائی کی توفیق کی درخواست کرتے رہے ہیں۔ [۷] اس کے علاوہ مزید اور دسیوںنمورد ہیں جو اسلام کے اخلاقی نظام میںصبر کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق۔ بھی فرماتے ہیں: "صبر ایمان کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو جسم کے لئے سر کی حیثیت ہے، جس طرح سر کے نہ ہونے سے جسم کا خاتمہ ہوجاتاہے اسی طرح اگر صبر نہ ہوتو ایمان بھی جاتارہے گا "۔ [۸] حضرت امام محمد باقر۔ سے صبر کی اہمیت کے بارے میں نقل ہوا ہے: "جنت ناگواریوں سے گھری ہوئی ہے لہذا جو بھی دنیا میں ناگوارچیزوں پر صبر کرے وہ بہشت میں جائے گا۔ اور دوزخ نفسانی خواہشات اور لذّات میں گھری ہوئی ہے، لہٰذا جو بھی نفسانی خواہشات و لذات کی تکمیل کرے گا، وہ جہنم پہنچائے گا "۔ [۹]

۱۔ زمر ۱۰۔

۲۔ انفعال ٤٦۔

۳۔ آل عمران ۱۲٥۔

٤۔ بقرہ ۱٥۷۔

٥۔ آل عمران ۱٤٦۔

٦۔ احقاف ۳٥۔

۷۔ بقرہ ۲٥۰؛ اعراف ۱۲٦۔

۸۔ کلینی، کافی ج ۲، ص ۸۹، ح ٥۔

۹۔ ایضاً، ح۷۔

د۔ صبر کے فوائد:

صبر کے بہت سے دینی و دنیوی فوائد شمار کئے جاسکتے ہیں، منجملہ ان کے حضرت علی–بعض گذشتہ امتوں کی عزت وذلت کے بارے میں اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: "جب خدا نے دیکھا کہ وہ کس طرح اس سے دوستی کی راہ میں اذیت و آزار پر صابر ہیں اور اس کے خوف سے ناگواریوں پر صبر و تحمل کرتے ہیں تو اس نے انھیں گرداب بلا سے نکال کر گشائش عطا کی، اور ذلت و خواری کے بعد انھیں با آبرو بنایا اور سکون و اطمینان کو خوف کا جا گزیں بنادیا۔ پھر وہ حکمراں بادشاہ اور با عظمت و شان پیشوا ہوگئے اور خدا کی کرامت ان کے حق میں یہاںتک پہنچ گئی کہ دیدۂ آرزو ان کے آخری درجہ کہ وہ اس جگہ پہونچا ان کی نگاہ اور اس کی انتہا کو نہ دیکھ سکی"۔ [1]

بعض علماء اخلاق نے صبر کو مقدّرات الٰہی پر راضی رہنے کے مقام رضایت تک پہونچنے کا دروازہ قراردیا ہے، اور مقام رضا کو محبت پروردگار کی وادی تک پہونچنے کا دروازہ جانا ہے۔ [2] اس لحاظ سے صبر کے اہم فوائد میں سے اسی دنیا میں مقام "رضا" و" محبت "تک رسائی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

"صبر" کے لئے دیگر متعدد موضوعات بھی قابل ذکر ہیں، جیسے صبر و شکر میں مناسبتیں، صبر کے حصول کی راہیں اور اس کے مانند دوسرے موضوعات کہ اختصار کے پیش نظر ان کا ذکر نہیں کیا جارہا ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲۔

۲۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادات، ج ۳، ص ۲۸۳۔

تیسرا باب :

اسلام کی نظر میں اخلاقی تربیت

پہلی فصل :

اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

مقدمہ:

اخلاق اسلامی کے اصول اور مفاہیم سے آشنائی کے بعد یہ بات مناسب ہے کہ اپنے آپ سے سوال کریں "نا مطلوب موجود" کی حالت کو کس طرح "ناموجود مطلوب" سے تبدیل کیا جا سکتا ہے ؟ واضح عبارت میں اخلاقی تربیت کے طریقے کیا ہیں ؟

تربیتی طریقے، کبھی خود تربیتی اپنے (لئے تربیتی) ہیں تو دیگر تربیتی کبھی دوسرے کے (لئے تربیتی) ہیں، کبھی قولی ہیں تو کبھی عملی، کبھی سلبی (روکنے والے) ہیں اور کبھی ایجابی (اصلاحی)، کبھی عام (یعنی تمام سن کے مراحل کے لئے) ہیں اور کبھی خاص۔ رفتار کے مبادی [1] کے پیش نظر ان اخلاقی تربیت کی روشوں کو جو رفتار یا اس کے مبادی یعنی ابتدائی مرحلوں سے تعلق رکھتی ہیں، تین چیزوں: شناخت، سبب اور رفتار کے اعتبار سے مورد توجہ قرار دیں گے اور تفصیل سے آئندہ مباحث کے ضمن میں ان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ چونکہ علوم تربیتی کی اصطلاحات (منجملہ اصول، روشیں، اہداف و مقاصد وغیرہ وغیرہ) کی دقیق تعریف محل اختلاف ہے اور ان کے سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں لہٰذا یہاںپر اس کتاب میں مورد نظر تعریف کی طرف اشارہ کریں گے۔ "روش" (طریقہ) سے مراد وہ کلی قوانین ہیں کہ ہر ایک جداگانہ طور پر یا دوسری روشوں کی مدد سے مقصد تک پہنچانے کی خصوصیت کی حامل ہیں۔ ہر روش کے تحقق کیلئے ممکن ہے کہ ہر ایک کے لئے مختلف اسلوب اور متعدد فنون پائے جاتے ہوں جو روشوں کی نسبت جزئی تر قوانین کا مقصود ہیں۔

۱۔گذشتہ علماء کے نظریات کے مطابق مبادی رفتار اس طرح ہیں: فائدہ کا تصوّر، اس کی تصدیق، شوق موکد۔ معاصر ماہرین نفسیات نے اس سے مشابہ ایک دوسری ترکیب پیش کی ہے ؛ وہ اس طرح ہے: شناخت، باعث اور عملی توانائی۔

روشوں کے بیان میں ایک عقلی ترتیب پائی جاتی ہے کہ آسان تر دیگر تربیتی روشوں سے شروع ہوتی ہے اور مشکل تر خود تربیتی روشوں پر ختم ہوتی ہے۔ یہ عقلی ترتیب انسان کے اخلاقی اور نفسیاتی رشد سے بھی منطبق ہے اور اسلام کی تربیتی تعلیمات سے بھی ہم آہنگ ہے۔

ہر روش کو اس کی تعریف اور توضیح سے شروع ہے اور بعد کے مرحلہ میں آیات وروایات سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا استناد اسلام سے ثابت کیا گیا ہے پھر اس کے بعد (یا اس کے ضمن میں) نفسیات کے علمی مطالعہ سے استفادہ کرتے ہوئے روش کی توضیح وتکمیل کی گئی ہے، یعنی نفسیات میں کون سے نظری اصول ومبانی کے ذریعہ اس روش کا دفاع کر سکتے ہیں اور اخلاقی تربیت میں اس کی تاثیر ثابت کی جا سکتی ہے، یہاں پر نفسیات کے اہم ترین نظریوں کے متعلق جو کہ تربیت اخلاقی سے مربوط ہیں بحث کی جارہی ہے۔

طریقے

۱۔ تربیت کے لئے مناسب ماحول بنانا

انسان کی تکوین اور تغیر کا اہم ترین عامل مختلف ماحول کے حالات ہیں خواہ وہ زمانی یا مکانی یا اجتماعی ماحول ہو۔ بہت سے مقامات میں ماحول کی ترمیم واصلاح سے تربیت کے لئے مساعد اور سازگار ماحول فراہم کرکے جس کی تربیت کی جاتی ہے اس کی عادتوں، خصلتوں، افکار اور رفتار کو بدلا جا سکتا ہے اور جدید خصوصیات کو اس کا جاگزین بنایا جا سکتا ہے، اس روش کی نفسیاتی بنیاد اس ماحول کے حالات سے انسان کے متاثر ہونے کی اصل ہے جو ماحول سازی (بعض رفتار کی ہمراہی اور ہمنوائی بعض دیگر کے ساتھ ان کے ثابت کرنے کا باعث ہوتی ہے)، فعّال وکردار ساز ماحول سازی (ایک ماحول میں خاص طرز عمل ورفتار پر جزا دی جاتی ہے) یا اجتماعی تعلّم وتربیت (رفتار کے مشاہدہ سے خاص نمونوں کی پیروی) کے نظریات کے بیان ہوتی ہے ضمن میں یہ روش خاص طور سے دوسروں کے ذریعہ اور انسان کے اولیاء کے ذریعہ بروئے کار لائی جاتی ہے، لیکن انسان خود بھی کسی حد تک موثر ہوسکتا ہے، اس روش کو وجود میں لانے کے جو طریقے لازم ہیں وہ ترتیب وار یہ ہیں:

مقدمہ سازی، نمونہ سازی، ماحول کو صحیح و سالم بنانا اور حیثیت اور ماحول کو بدلنا۔

الف۔ مقدمہ سازی:

اس سے مراد یہ ہے کہ مناسب ماحول فراہم کرکے اخلاقی فضائل کے وجود میں آنے کا امکان اعلی حد تک فراہم کریں اور اس کے برعکس ایسے مقدّمات جو کہ منفی رخ رکھتے ہیں اور اخلاقی رذائل پیدا کرسکتے ہیں، ان کے وجودمیں آنے کی روک تھام کریں، اس حصہ میں اسلام کی ہدایات قابل توجہ ہیں۔

ایک۔زوج یا زوجہ کے انتخاب میں کہ جو خاندان کا ایک رکن ہے، اس کے اخلاقی فضائل پر توجہ دینی چاہیے، انظر فی ای شی تضع ولدک فان العرق دساس[۱] اس کے مقابل ایسے افراد جو غیر شائستہ گھرانے کے پروردہ ہیں، یاکم عقل اور احمق ہیں تو ایسے لوگوں سے شادی بیاہ کرنے سے اجتناب کرناچاہیے۔

حضرت امیرالمومنین علی نے جومالک اشتر کو خط لکھا ہے اس میں اس کارساز عنصر کی اس طرح تصریح فرمائی: "ضروری ہے کہ اداری امور میں با فضیلت افراد سے استفادہ کرو، وہی لوگ کہ جو نیک اور شریف خاندان سے ہوں اور اچھے ماضی اور نیک نامی کے ساتھ زندگی گذارچکے ہوں، جو لوگ عقل و ہوش، شجاعت و بہادری کے مالک، سخی اور بلند ہمت ہیں، وہ کرم کامرکز اور نیکی و فضیلت کا سرچشمہ ہیں"۔ [۲]

لہٰذا ایسی اولاد جو شائستہ ماں اور با فضیلت باپ کی حمایت کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں اہم ترین مقدّمہ ساز عنصر ماحول اور تربیت کے لحاظ سے ان کا مددگار ہے۔ [۳]

دو۔ اچھے نام کا انتخاب اولاد کا والدین پر جو حق ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے یہ ہے کہ۔"ہر انسان کی سب سے پہلی نیکی اس کے فرزند کے حق میںاس کا اچھا نام رکھنا ہے لہٰذا تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ اپنے فرزندوں کا اچھا نام رکھو"۔ (اول مایبر الرجل ولدہ ان یسمیہ باسم حسن فلیحسن احدکم اسم ولدہ)۔ [٤]

نیک اور شائستہ نام تربیتی اور نفسیاتی اثر رکھتا ہے اور انسان کی صلاح و فلاح نیز خوبیوں کو فراہم کرنے کا مقدّمہ ہے یا پھر اسے فرومائگی اور پستی کی سمت لے جاتا ہے۔ (الاسم یدل علی المسمی)۔

۱۔ فلسفی، کودک، ج ۱، ص ٦٤۔ حسن الاخلاق، برہان کرم الاعراق، افرادکی اخلاقی خصلتیں خاندان کی پاکیزگی اور فضیلت کی دلیل ہیں، غرر الحکم۔ ۲۔ نہج البلاغہ، نامہ ۵۳۔
۳۔ جنٹک کے علاوہ کہ جن کا ذکر فی الحال مقصود نہیں ہے۔ ٤۔ وسائل الشیعہ: ج ۱۵، ص ۱۲۲۔

۳۔ محل زندگی کا انتخاب (ملک، شہر یا دیہات، محلہ اور پڑوسی کا انتخاب) بھی مقدّمہ ساز عناصر میں ہے۔ اسی طرح محل تحصیل، کام کاج، احباب اور معاونین سب ہی (تربیت کی) راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ (۱)

ب۔ نمونہ سازی:

کہا جا سکتا ہے کہ ہر ماحول کو بنانے والے اس سماج اور ماحول برگزیدہ اور سر بر آوردہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذ ایک اچھے تربیتی ماحول کی ایجاد کا ایک طریقہ اس ماحول میں اچھے نمونوں کو وجود میں لانا ہے اور برے نمونوں دور کرنا ہے۔ سماج میں پسندیدہ اور محبوب نمونہ خود بخود اس ماحول میں رہنے والوں کو ان کی طرف کھینچ لاتا ہے اور ان کے مکارم اخلاق کو دوسرے لوگ نمونہ بنالیتے ہیں۔

آلبرٹ بنڈورا (۱۹۷۸) کہ جو اجتماعی تعلّم کے نظریہ کا واضع ہے۔ تعلّم (سیکھنے) کا سب سے اہم طریقہ مشاہداتی تعلّم کو جانتا ہے کہ وہی تقلید یا نمونہ کا اختیار کرنا ہے انسان ایک نمونہ یا سر مشق کا انتخاب کر کے اس کے عمل کی تقلید کرنے لگتا ہے۔ بنڈورا اس طرح کے تعلّم کو چار مرحلہ میں توضیح دیتا ہے: مرحلہ توجہ، حافظہ کے حوالے کرنا، دوبارہ تخلیق اور سبب و محرّک۔ ممتاز صفات، عطوفت ومہربانی کا بار، پیچیدگی، برجستگی اور استعمالی اہمیت نمونہ میں اور حسّی ظرفیت، ابھارنے کی سطح، درک کرنے کی آمادگی اور گزشتہ تقویت مشاہدہ کرنے والے کے اندر نمونہ شخص کے عمل سے منطبق نتیجۂ عمل کی مدد کرتی ہے۔ (۲)

زندہ نمونوں کے علاوہ جو کہ مساعد اور سازگار تربیتی ماحول ایجاد کرتے ہیں مربی حضرات ماضی کے اخلاقی اور انسانی نمونوں کی شناخت کرا کے انھیں حیات نو عطا کر سکتے ہیں اور بنڈورا کے نظریہ میں مذکورہ خصوصیات پر نظر کرتے ہوئے بار عاطفی، ممتاز حالت، برجستگی وغیرہ کے اعتبار سے ان کے متعلق تاکید اور سرمایہ گذاری کر سکتے ہیں نمونوں کے دقیق موثر اور محبوب چہرہ کی ترسیم تربیت پانے والوں کے لئے ان کے ذہن وروح میں حسب ضرورت نمونوں کے فقدان کے خلا کو پر کر سکتی ہے اور وہ تدریجاً ان کے مثل بن سکتے ہیں۔

۱۔ ہمنشینوں اور دوستوں کی تاثیر کے بارے میں اس کے بعد بحث کریں گے۔

۲۔ روانشناسی پرورشی، ص ۳۱٤۔

قرآن کریم میں اس شیوہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے، بالخصوص اکثر قرآنی نمونے جو ان اور تاثیر گذار ہیں۔یوسف شہوت کے مقابل قہرمان مقاومت، کہف کے جوان راہ خدا میں رشد وہدایت کیلئے ہجرت کے نمونے، اسماعیل حکم خدا کے سامنے سر اپا تسلیم کی مثال اور ابراہیم عادت شکن اور بت شکن جوان ہیں۔ قرآن کے جوان نمونوں کے علاوہ دیگر نمونے بھی پائے جاتے ہیں کہ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

دین کی تبلیغ میں نوح پایداری اور استقامت کا نمونہ، مصائب زمانہ اور شدائد روزگار پر ایوب صبر و تحمل کا نمونہ، طاغوت سے جنگ ومبازرہ کرنے میں داؤد شجاعت اور شہامت کا نمونہ وغیرہ وغیرہ، قرآن ان تمام حضرات کی شان میں فرماتا ہے: "...... وہ لوگ (خدا کے پیغمبر) ایسے لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے لہٰذا ان کی ہدایت کا اقتدا کرو"۔[1]

بالآخرہ پیغمبر اکرم زندگی کے تمام مراحل میں تمام عالمین کے لئے مطلق نمونہ ہیں، " لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ"[2] کیونکہ آپ "خلق عظیم " کے مالک، "مکارم اخلاق کا آئینہ " اور " رحمۃ للعالمین " ہیں۔

ماں باپ اور ان کے بعد اساتذہ اور تربیت کرنے والے بھی تربیت سیکھنے والوںکے لئے پہلا نمونہ ہیں۔ تربیت کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اہم موقعیت و حیثیت کے مالک، زیادہ کامیاب، زیادہ علم ودانش یا معنوی بلندی کے مالک اکثر دوسروں کی نظر کو اپنی طرف جلب کرتے ہیں اور ان کے لئے نمونہ بن جاتے ہیں۔

خوش قسمتی سے طالب علموں کی نظر میں عام طور پر اساتذہ اور والدین ان خصوصیات کے یا ان میں سے بعض کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن بہر صورت اس برتری اور برجستگی کا نہ ہونا معنوی، علمی اور اجتماعی شعبوں میں تربیت پانے والوں کو کسی اور سمت لے جاتا ہے۔

حضرت امیر المومنین علی فرماتے ہیں:"پیغمبر اکرم ہر روز میرے لئے اپنے مکارم اخلاق میں سے ایک کو بیان کرتے تھے اور مجھے اس کی پیروی کرنے کا حکم دیتے تھے "۔[3] حضرت امام موسیٰ کاظم۔ فرماتے ہیں: "بچے اپنے والدین کی خوبیوںاور صلاحیتوں سے محفوظ ہوتے ہیں "۔[4]

۱۔ اولئک الذین ھدی اللہ فبھد یھم اقتدہ، سورئہ انعام، آیت ۹۰۔ ۲۔ سورئہ احزاب، آیت، ۲۱۔۳۔یرفع لی کل یوم علما من اخلاقہ و یامرنی با لاقتداء بہ؛ نہج البلاغہ، خ ۱۹۲۔

٤۔ یحفظ الاطفال بصلاح آبائھم، بحار الانوار ج ۵، ص ۱۷۸۔

نمونہ سازی کے طریقہ سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے کم از کم دو اخلاقی اور تربیتی نکتوں کی طرف توجہ دلائی ہے:

اول یہ کہ اس نے محبوب اور پسندیدہ افراد کو کلی طور پر نیز عام عنوان سے بیان کیا ہے، جیسے: تائبین، متطہّرین، متقین، صالحین، صابرین، محسنین اور مجاہدین وغیرہ اور کبھی خاص طور سے اور نام کے ساتھ (پیغمبروں سے متعلق) بیان کیا ہے، لیکن قابل نفرت ومذمّت افراد کا ذکر قرآن میں استثنائی موارد (جیسے ابو لہب) کے علاوہ کلی عناوین کے تحت ہوا ہے، جیسے: تجاوز کرنے والے، اسراف کرنے والے، خود پسند افراد، کفار، ظالمین اور متکبرین وغیرہ۔ اس وجہ سے ہم کو بھی چاہیے کہ قرآن کریم کی پیروی کرتے ہوئے اسی روش کا انتخاب کریں کہ اخلاقی فضائل کی شناخت کرانے میں کلی عناوین بھی اور صاحبان فضائل کے اسماء بھی بیان کریں، منفی مقامات پر اشخاص کے نام بیان کرنے سے اجتناب کریں۔

دوسرے نمونوں کا انتخاب کرنا ہے، قرآن کریم ایک ساتھ محبوب اور منفور افراد کا ذکر کرکے انسانی سماج کو علم وآگہی کے ساتھ اپنے منظور نظر نمونوں کے انتخاب کی دعوت دیتا ہے، حتیٰ کہ گذشتہ آباء اجداد کے سلسلہ میں بھی آگاہ کرتا ہے کہ بغیر علم و آگہی کے ان کی اندھی تقلید کرکے اپنی زندگی تباہ و برباد نہ کریں۔ .... انہوں نے کہا: "ہم نے آباو اجداد کو ایک آئین پر پایا ہے لہٰذا ہم بھی انھیںکا اتباع کرتے ہیں' اس (پیغمبر) نے کہا "خواہ جس پر تم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے اس سے زیادہ ہدایت کرنے والا بھی تمہارے لئے لے آؤں تب بھی ایسا کروگے"؟ [1] اس وجہ سے ہم پر لازم ہے کہ انسانوں کی آزادی کو باقی رکھتے ہوئے نیز مطلوب نمونوں اور معیاروں کا تعارف کراتے ہوئے تربیت پانے والوں کے لئے آگاہانہ انتخاب کی راہ فراہم کریں۔

ج۔ ماحول کو صحیح و سالم رکھنا:

برے اور شر پسند افراد ہر ماحول اور سماج میںعام طور پر پائے جاتے ہیں۔ بیشک فاسد اور برے ماحول اخلاقی تربیت کے معاملہ کو دشوار بلکہ بعض اوقات نا ممکن بنا دیتا ہے، اس وجہ سے ماحول کو صحیح وسالم رکھنا کہ جو تقریباً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زندہ کرنے کے مساوی فریضہ ہے، سب کے لئے ایک عقلی، انسانی نیز دینی فریضہ ہے۔ اس طرز اور شیوہ سے مراد معاشرے کے تمام افراد کے اندر خوبیوں کی ایجاد اور ان کا احیاء کرنا ہے اور برے امور کو ختم کرنا ہے۔ درج ذیل نکات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اور ان کے پہلوئوں کو کہ جو دراصل معاشرہ میں اخلاقی تربیت کو آسان کرنے والے ہیں، زیادہ واضح کرتے ہیں۔

۱۔ سورئہ زخرف، آیت ۲۳، ۲۴۔

۱۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس نکتہ کو واضح انداز میں اپنے دامن میں رکھتا ہے کہ دعوت ایک شناختہ شدہ شرعی اور عقلی معیار پر ہونی چاہیے۔[۱] اس وجہ سے جب بھی بات شرعی واجب یا حرام کی ہو تو چاہیے کہ اس کی ثقافتی پشت پناہی ایجاد کی جائے اور ایک معروف یا منکر کے عنوان سے اکثر لوگوں کے نزدیک متعارف ہو۔ ایسے حالات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عام مقبولیت حاصل ہوگی۔ بعبارت دیگر امر بالمعروف کی دشواری اور کلی طور پر اس کا قبول نہ ہونے میں مشکل نہیں ہے بلکہ مشکل ان خاص موارد اور مصادیق میں ہے کہ جن کا معروف یا منکر ہونا کافی حد تک مستدل طور سے لوگوں کے لئے واضح نہیں کیا گیا ہے۔

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سب کا فریضہ ہے، لیکن امر و نہی کرنے والے خاص شرائط کے حامل ہوں، منجملہ ان کے امر و نہی کے شرائط کی شناخت[۲] نیز خود معروف اور منکر کی پہچان ضروری ہے، اس کے علاوہ یاد دہانی اور بیان کا طریقہ اس طرح ہو کہ زیادہ سے زیادہ تاثیر کی امید ہو۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موارد کو وسیع ہونا چاہئے اور خاص مصادیق میں کہ جو اس وقت سماج اور معاشرہ میں زیادہ رایج اور شائع ہے (جیسے بے حجابی) میں محصور نہ ہو۔ اخلاق کے خلاف اعمال جیسے رشوت لینا، تہمت لگانا، غیبت کرنا اور بد گوئی وغیرہ ایک عام ثقافت اور تہذیب کی صورت میں معیّن شدہ نصائح اور نہی عن المنکر کا مورد واقع ہوں، تاکہ مثال کے طور پر بے حجاب یہ خیال نہ کریں کہ نہی عن المنکر ہمیشہ انہیں کے بارے میں ہے۔

د۔ موقعیت کا تبدیل کرنا:

کسی ماحول کے حالات کی قوّت اور اس کی اثر گذاری اس حد تک ہوتی ہے کہ صرف موقعیت اور حالات کے تبدیل کرنے سے اخلاقی تربیت حاصل ہو پاتی ہے۔ اگر چہ ماحول کی تبدیلی بہت زیادہ مالی اخرجات اور نفسیاتی بوجھ کی حامل ہوتی اخراجات ہے، ایک سازگار تربیتی ماحول ایجاد کرنے کے لئے آخری طرز کے عنوان سے ضروری ہے۔ "ہجرت" منجملہ ان دستورات میں سے ہے کہ جس کی دین میں تاکید ہوئی ہے اور کبھی واجب حد تک پہونچ جاتی ہے۔ قرآن مجید کے بقول جب فرشتے کچھ لوگوں کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو وہ لوگ ماحول کے ناموافق ہونے کو اپنا عذر بیان کرتے ہیں، لیکن فرشتے کہتے ہیں ".... کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے ...."۔[۳]

۱۔" المعروف" اسم لکل فعل یعرف بالعقل او الشرع حسنہ والمنکر ماینکر ھما (المفردات) معروف ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقل یا شرع کے ذریعہ نیک جانا جائے اور منکر ہر اس فعل کو کہتے ہیں جسے عقل یا شرع ناپسند کریں۔ ۲۔ سورۂ توبہ، آیت ۷۱ اور ملاحظہ ہو: المیزان، ج ۳، ص ۳۷۳۔

۳۔ الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا۔۔۔ سورۂ نسائ، آیت ۹۷۔

جو انسان ایسے گھر یا محلہ میں زندگی بسر کرتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے اپنی یا اپنی اولاد کی شائستہ تربیت کے لئے موافق اور ساز گار ماحول نہیں رکھتے وہ اسی طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے جدید امکانات کو اپنے اہل وعیال اور خاندان کے افراد کے رشد و تغیرّ کے لئے فراہم کرسکتا ہے۔ اپنے یا اپنے اقرباء کے نا پسند ناموں کا تبدیل کرنا بھی اس خاص نفسیاتی ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے جو اسی سے پیدا ہوتا ہے تغیر موقعیت کے مواردمیں شمار ہوتا ہے۔ (۱) ایسی نشست جس میں اخلاق کے خلاف اعمال کی روک تھام نہ ہو سکے ا سے ترک کردینا چاہیے: "مجرمین کے بارے میں وہ سوال کررہے ہوں گے: کس چیز نے تمہیں جہنم کی آگ میں جھونک دیا؟ وہ کہیں گے: .... ہم لوگوں کے برے کاموں میں شامل ہوجایا کرتے تھے۔ (۲)

اسلام ایک مسلمان کے روزانہ کے معمول کی تعیین میں اسی طریقہ اور روش سے مدد لیتا ہے اور ا سے مذہبی مراکز جیسے مساجد میں مسلسل حاضر ہونے کی دعوت دیتا ہے یہ ا سے خود ہی ایک قسم کی تغییر موقعیت ہے اگرچہ ہجرت شمار نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک قسم کی اخلاقی تازگی اورشادابی انسان کو عطا کرتی ہے اور ا سے ایک ہی طرح کے ماحول سے اور بسا اوقات روزانہ کے نا مساعد اور غیر موافق ماحول سے جدا کردیتی ہے۔

۲۔ ضرورتوں کو صحیح طریقہ سے پورا کرنا

ضرورتونکو صحیح طریقہ سے پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ ضروریات زندگی کو ایک متعادل حدتک اخلاقی تربیت دینے اور بالاتر ضرورتوں کی تکمیل کرنے سے پہلے پورا کیا جائے۔ سبب اور محرّک کے اثر کے پیش نظر جو کہ عمل کے اصول ومبادی میں سے ایک ہے، جب تک کہ انسان بھوک کے زیراثر یا جنسی میلان کے تحت تاثیر ہے یا کم ازکم اپنی زندگی کیلئے کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتا، ایسا انسان اخلاق کی بلندیوں کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتا۔

اسلامی تعلیمات میں یہ نکتہ موردتوجہ واقع ہوا ہے، سورئہ "قریش" میں خداوند سبحان کی عبادت کی دعوت کا ذکر ان کی خوراک فراہم کرنے اور امنیت کے ذکر کے بعدہوتی ہے: " لہٰذا انھیں چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، وہی ذات کہ جس نے انھیںبھوک سے نجات دی اورنا امنی سے انھیںرہائی دلائی"۔ "فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع وآمنھم من خوف"۔ (۳)

---

(۱) ان رسول اللہ کان یغیّرا لاسماء القبیحۃ فی الرجال والبلدان، وسائل الشیعہ، ج ۱۵، ص ۱۲٤۔

(۲) ....یتساءَ لون عن المجرمین ما سلککم فی سقر قالوا وکنا نخوض مع الخائضین، سورئہ مدثر، آیت ٤۰ تا ٤٥۔

(۳) سورہ قریش، آیت ۳، ٤۔

مندرجہ ذیل آیات میں غور خوص کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی صفات، تقویٰ، شکر، اور عمل صالح وغیرہ انسان کی اوّلین ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد ذکر ہوئے ہیں: و کلوا مما رزقکم الله حلالاً طیبا واتقوا الله ۔۔۔[۱]۔ اور جو کچھ خدا نے تمہیں حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھائو اور خدا سے ڈرتے رہو....۔ "یا ایا الذین آ منوا کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکرو الله۔۔ اے ایمان لانے والوں! جو ہم نے تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اس میں سے کھائو اور خدا کا شکر ادا کرو....۔ [۲] "یا ایھا الرسل کلو ا من الطیبات و اعملوا صالحا۔۔۔" اے میرے رسولو! تم پاکیزہ غذائیں کھائو اور نیک عمل انجام دو.....۔[۳] پیغمبر اکرم نے حدیث ایک شریف میں زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے اثر کے سلسلہ میں اس سے بلند تر ضرورتوں پر نظر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: " اگر روٹی نہ ہوتی تو ہم نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے اور پروردگار کے واجبات کو ادا نہیں کر سکتے تھے "۔[٤] اور دوسری جگہ پر فرماتے ہیں: "قریب ہے کہ فخر و ناداری کفر و ناشکری کا سبب بن جائے " ۔[٥] پیغمبر اکرم اور ائمہ طاہرین (ع) کی سیرت میں بھی ہم ملاحظہ کرتے ہیں آپ حضرات عملی طور پر محروین کی طرف توجہ دیتے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے، شب کے سناٹے اور سردی اور گرمی کے موسم میں بھی ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے [٦] اور یہی بات انوارہدایت کے درک کرنے کے مقدمات ان کے لئے فراہم کرتی تھی۔ حتیٰ کہ دشمنوں سے ملاقات کے موقع پر بھی صلاح وہدایت کی دعوت سے پہلے ان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

۱۔ سورہ مائدہ، آیت ۸۸۔

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۷۲۔

۳۔ سورئہ مومنون، آیت ۵۱۔

٤۔ فلو لا الخبز ما صلینا ولا صمنا ولا ادینا فرائض ربنا عز وجل۔ کافی ،ج ٦، ص ۲۸۷۔

٥۔ کادالفقر ان یکون کفرا، کافی، ج ٥، ص ۷۳۔

٦۔ الحیاۃ، ج ۳، ص ۲۳۲تا ۲۳٤ ملاحظہ ہو۔

حضرت امام حسن کی سیرت نادان مخالفین کے ساتھ یہی انسانی روش اور سیرت تھی:

ایک شامی نے معاویہ کے ورغلانے پر ایک دن امام حسن کو گالی دی، امام نے اس سے کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ خاموش ہو گیا، اس وقت آپ نے شیریں مسکراہٹ کے ساتھ اس کو سلام کیا اور فرمایا: "بوڑھے آدمی! فکر کرتا ہوں کہ تو ایک پردیسی ہے اور خیال کرتا ہوں کہ تو راستہ بھول گیا ہے اگر مجھ سے رضایت طلب کرے گا تو تجھے رضایت دوں گا اور اگر کچھ ہم سے طلب کرے گا اور راہنمائی چاہے گا تو تیری راہنمائی کروں گا اور اگر تیرے دوش پر کوئی بوجھ ہے تو اسے اٹھا لوں گا اور اگر بھوکا ہے تو شکم سیر کردونگا اور اگر محتاج ہے تو تیری ضرورت پوری کردوں گا، (خلاصہ) جو کام بھی ہو گا اسے انجام دیدونگا اور اگر میرے پاس آئے گا تو بہت آرام سے رہے گا کہ مہمان نوازی کے ہر طرح کے وسائل و اسباب میرے پاس فراہم ہیں"۔

وہ شامی شرمندہ ہوگیا اور رو کر کہنے لگا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ روئے زمین پر آپ خدا کے جانشین ہیں، خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے۔ آپ اور آپ کے والد میرے نزدیک مبغوض ترین انسان تھے لیکن اب آپ سب سے زیادہ محبوب ہیں "بوڑھا آدمی اس دن امام حسن کا مہمان ہوا اور جب وہاں سے گیاتو حضرت کی دوستی کا دم بھرنے لگا۔[۱]

آبراھام مزلو ہیومینسٹ ماہر نفسیات نے آدمی کے اغراض واسباب کی طبقہ بندی کے لئے جدید طریقہ پیش کیا ہے، اس نے ضرورتوں کے ترتیب و ار سلسلہ کو پیش کیا کہ جو زندگی کی اساسی ضرورتوں سے شروع ہوتا ہے اور اس سے بالا تر سطحوں میں نفسیاتی اغراض واسباب تک پہونچ جاتا ہے وہ کہتا ہے: "..... انسان کی با مقصد حیات میں تنظیم کی اہم اصل اساسی ضرورتوں کی ترتیب اولویت کے مراتب کے سلسلہ کی صورت میں کمتر یا بیشتر غلبہ کی قدرت کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ اہم محرّک جو اس تنظیم کا باعث ہوتی ہے وہ ضعیف تر ضرورتوں کا پیدا ہونا ہے جو کہ قوی تر ضرورتونکو پورا کرنے سے ایک سالم انسان میں پائی جاتی ہے۔ جب بھی ضرورت زندگی پوری نہیں ہوتی، جسم پر غلبہ پا جاتی ہے اور تمام استعداد اور صلاحیتوں کو اپنے کنٹرول میں لے لیتی ہے اور ان صلاحیتونکو اس طرح منظّم کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ان سے استفادہ کرسکے۔ نسبی رضا مندی ان

۱۔ بحار الانوار، ج، ۴۳، ص ۳۴۴۔

ضرورتوں کو محو کردیتی ہے اور بعد کے سلسلہ میں مراتب کی ضرورتوں سے بلند مجموعہ کو موقع دیتی ہے کہ وہ ظاہر ہوں، شخصیت پر غلبہ پاکر انھیںمنظّم کریں اس طرح کہ، بھوک کا درد اٹھانے کے بجائے امن و سلامتی کے لئے پریشان ہو۔ یہ اصل سلسلہ مراتب میں ضرورتوں کے دوسرے مجموعوں یعنی محبت، احترام اور خود آگے بڑھنے اور ترقی کرنے پر بھی صادق ہے۔[1]

اسی وجہ سے محتاج سماج اوراجتماع میں علمی، ہنری اور اخلاقی تخلیق کم وجود میں آتی ہے۔

مزلوکا نظریہ ہے کہ سالم افراد بلند ضرورتوں کی طرف رخ کرتے ہیں، یعنی اپنی با لقوۃ استعدادوں کے عمل ہونے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور آس پاس کی دنیا کو پہچاننا چاہتے ہیں۔ مقصد، بے نیاز کرنا، تجربہ حیات کی توسیع، سرور و شادمانی کا اضافہ اور زندہ ہونے کی تحریک ہے.... نیک اخلاقی صفات جن کو وہ" وجود میں اقدار" سے تعبیر کرتا ہے اس موقعیت کی طرف رخ کرتے ہیں۔ بعض ہستی کی قدریں اس کی نظر میں یہ ہیں: حقیقت (بے اعتمادی بد گمانی اور تشکیک کے مقابل)، نیکی (نفرت کے مقابل)، کمال (نا امیدی اور بے معنی ہونے کے مقابل)، یکتائی (بے ثباتی کے مقابل)، نظم (عدم امنیت واحتیاط کے احساس کے مقابل)، خود کفائی (ذمہ داری کو دوسروں کے حوالے کرنے کے مقابل)[2]۔

یہ نظریہ کہ انسان کمتر ضرورتوں کی طرف توجہ کئے بغیریا ایک حد تک ان کی تکمیل، انسانی فضائل کی طرف قدم نہیں اٹھاتا، یہ سماج کے اکثر افراد کے بارے میں صادق آتا ہے۔

دو نکتوں کی طرف توجہ دیتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ " ضرورتوں کو صحیح طور سے پورا کرنے کی روش "اس بات کے علاوہ کہ دوسری روشوں کا مقدمہ ہے، خود اسے بھی ایک اخلاقی تربیت کی روش کے عنوان سے پیش کیا جاسکتا ہے۔پہلے یہ کہ ادنی ضرورتونکو پورا کرنے سے بلند ترین ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں، یعنی علّت و سبب کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ عمل کے علّی اور سببی جذبہ کا وجود تربیت اخلاقی کے ایک اہم حصہ کو منظّم کرتا ہے۔

۱۔ انگیزش و ہیجان، ص ۱۰۱۔

۲۔ اپنی جلوہ نمائی تحقق نفس تک رسائی اور بالقوۃ توانائی کے لئے ذوقی تقارن خوبصورتی اور نظم تعارف، جاننا، سمجھنا، تلاش کرنا، سنجیدگی، عزت نفس، کفایت، اجراء اور اصول تعلق و محبت کی ضرورت غیر سے وابستہ ہونا، سالمیت کی ضرورت کی مقبولیت، امنیت کا احساس اور خطرے سے دوری فیزیولوژیائی ضرورتیں، گرسنگی، تشنگی اور جنسی خواہشروانشناسی کمال، ص ۱۲۵۔

دوسرے یہ کہ اس سے توانائیوں کو تخلیہ اورباطنی قوتوں کے اعتدال کے لئے آمادگی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء اخلاق کے اخلاقی نظام میں ذکر ہوا ہے یہ نکتہ نہایت قابل توجہ اور اہمیت کا حامل ہے کہ سہ گانہ قوتیں شہوت، غضب، اور عقل، عدالت اور اعتدل کے سایہ میں ایک دوسرے کے ساتھ اکھٹا ہو جائیں۔ یہ رویہ یعنی اعتدال قوتوں کے استعمال کرنے میں تربیت اخلاقی کی ترقی میں ایک ناگزیر امر ہے۔

سید قطب الدین لکھتے ہیں: انسان کی تربیت کے لئے اسلام کے اسباب و وسائل میں ان ذمہ دارریوں سے چھٹکارا دلانا ہے جو کبھی کبھی جسم و جان میں اکھٹا ہوتی ہیں اسلام ان باروں اورذمہ داریوں کو اکھٹا جمع نہیں کرتا مگر یہ کہ انھیں چھوڑنے کے لئے

یکبارگی جمع کرے۔[1]

اس روش کے محقق ہونے کے لئے لازم طریقے یہ ہیں: معاشی نظام کی جانب توجہ، ازدواج، ورزش اور کام کاج ۔

الف ۔معاشی نظام کی طرف توجہ:

بہت سے اخلاقی جرائم کی بنیاد مال اور خوراک اور غذا کی کمی ہے۔ پہلے مرحلہ میں معاش کی فراہمی خانوادہ کے ذمہ ہے دوسرے مرحلہ میں حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ہے نیز اس نظام کے ذمہ ہے جو سماج پر حکومت کررہا ہے اور تیسرے مرحلہ میں نیکو کار اور قدرت مند افراد کے ذمہ ہے۔ بہر صورت تربیت کرنے والوں کی تگ و دو اس مسئلہ کی نسبت تربیتی نقطہ نظر سے تربیت اخلاقی میں بہت سے موانع کو دور کرنے والی ہے۔

ب۔ ازدواج:

ازدواج کے تربیتی اور اخلاقی فوائد (جیسے خود خواہی و خود غرض سے دور ہونا، دوسروں کی خدمت کے لئے آمادگی اور ان کی طرف توجہ، عواطف و جذبات کا بار آور ہونا، محبتوں کا ثمر دینا اور ذمہ داری قبول کرنے کے لئے آمادگی وغیرہ وغیرہ) کے علاوہ ازدواج کا اہم اور ابتدائی کردار غریزہ جنسی کی ضرورت کو فطری اور شرعی طریقہ سے صحیح طور پر پورا کرنا۔ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ ایسا جوان جس کا غریزہ جنسی شباب پر ہے اور ماحول کے بہت سے محرک بھی اس کے اندر اور زیادہ اس آگ کو بھڑکا رہے ہیں، وہ جوان سختی سے خود کو گناہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔[2] پیغمبر نے فرمایا ہے: "جب کوئی انسان شادی کرتا ہے تو اس کا نصف دین کامل ہو جاتا ہے لہٰذا بقیہ نصف کے سلسلہ میں اسے تقویٰ اختیار کرنا

۱۔ روش تربیتی در اسلام، ص ۲۸۲۔

۲۔ مراد یہ ہے کہ جنسی غریزہ جوانوں کو زیادہ مشکلات سے دو چار کرتا ہے، نہ یہ کہ کلی طور پر تربیت اور اصلاح کا راستہ ہی بند کردے ۔

چاہیئے"۔ [۱] پیغمبر کے اس حکیمانہ ارشاد سے یہ نکتہ بھی قابل استفادہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ اور اخلاقی ورع، شادی کے بعد زیادہ آسان اور قابل حصول ہے۔

ج۔ ورزش:

جسمانی ضرورتوں کو صحیح طور پر پورا کرنے میں اور جوانی کی قوتوں کی جلاء میں ورزش کا کردار قابل انکار نہیں ہے۔ اخلاقی تربیت میں ورزش کا کردار دو جہت سے قابل اہمیت ہے:

اول۔ وہ جسمانی سلامتی اور فرحت کہ جو ورزش سے پیدا ہوتی ہے، روحی، ذہنی اور نفسیاتی سلامتی نیز اخلاقی فضائل کے لئے مقدمہ ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب اور ثقافت میں قوت اور جوانمردی ہمیشہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہی ہیں۔ ورزش اخلاقی توجیہ نبی اور ائمہ (ع) کی سیرت میںآتی ہے۔ پیغمبر اکرم ایسے مردوں سے ملاقات کے وقت جو زور آزمائی کے لئے وزن اٹھا رہے تھے، فرماتے ہیں: "لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر وہ انسان ہے جو خواہشات نفس پر غالب ہو"۔ [۲] امیر المومنین۔ دعائے کمیل میں خدا سے جسمانی قویٰ کی تقویت کی درخواست خدمت الٰہی کے لئے کرتے ہیں، یارب.... قو علی خدمتک علی جوارحی۔ اس کے مقابل کمزور اور پست افراد تربیت کے خلاف امور انجام دیتے ہیں۔ دوسری جہت۔ ضرورتوں سے توجہ ہٹانا ہے، بالخصوص جوانی کے زمانہ میں جنسی ضرورتیںاپنی تکمیل کا تقاضہ کرتی ہیں۔ ایسے حالات میں کہ ابھی جائز اور مشروع طریقہ سے صحیح طور پر جنسی خواہشات کی تکمیل کے امکانات فراہم نہیں ہوئے ہیں، ورزش ضرورتوں سے توجہ ہٹانے کا ایک مفید اور اہم ذریعہ ہے۔

د۔ کام:

کام کاج کے مسئلہ کو "معاشی نظام کی طرف توجہ" کی بحث میں ذکر کیا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ اس کا اسلام میں ایک خاص مرتبہ ہے، اور استاد مطہری کے بقول: کام اسلام میں ایک مقدس اور پاکیزہ شے ہے، [۳] نیز بہت سے تربیتی جہات اس میں پائے جاتے ہیں، لہٰذا ہم نے اسے جداگانہ طور پر ذکر کیا ہے، ایک طرف کام صحیح طور پر قوتوں کی جلاء اور اضافی بار کے تخلیہ کا موجب ہوتا ہے اور دوسری طرف شخصیت کے احساس، ذہنی علاج، تمرکز خیال، ضرورتوں سے توجہ ہٹانے ..... کا باعث ہوتا ہے، کہ یہ سب اخلاقی تربیت کے لئے معاون وسیلہ ہیں۔ [۴]

۱۔ اذا تزوج العبد فقد استکمل نصف الدین فلیتق اللہ فی نصف الباقی۔ بحار الانوار، ج ۱۰۳، ص ۲۱۹۔ "من تزوج فقد احرز نصف دینہ، فلیتق اللہ فی النصف الباق"۔ بحار الانوار، ج۱۰۳، ص۲۱۹۔ ۲۔ اشجع الناس من غالب ھواہ۔ میزان الحکمۃ، ج ۱۰، ص ۳۸۷۔ ۳۔ تعلیم وتربیت در اسلام، ص ۴۱۱۔ ۴۔ ان جملوں کی طرف توجہ دینا مذکورہ بالا مطلب کی تائید میں موثر ہے: سقراط: "دیانت کے بعد کام نیک بختی اور سعادت کا سرمایہ ہے"۔ پاسکال: "تمام فکری اور اخلاقی برائیوں کی جڑ بے کاری ہے جو ملک بھی اس عظیم عیب کو برطرف کرنا چاہتا ہے اسے لوگوں کو کام پر آمادہ کرنا چاہئیے تاکہ اس سے روحی سکون کہ جس سے معدودے چند افراد آگاہ ہیں، حاصل ہو"۔ ساموئل اسمایلز: "دیانت کے بعد انسان کی تربیت کے لئے کام سے بہتر کوئی مدرسہ تعمیر نہیں کیا گیا ہے"۔ بحوالۂ تعلیم و تربیت در اسلام، ص ۴۳۰۔

۳۔ احترام شخصیت کے طریقے

اخلاق اسلامی کی اساسی بنیاد انسان کا اپنی ذاتی کرامت اور شرافت کی طرف توجہ دینا ہے: "یقیناً ہم نے اولاد آدم کو کرامت سے نوازا (انھیں عزت عطا کی)...اور انھیں اپنی بہت سی مخلوقات پر واضح فوقیت و برتری عطا کی۔[۱]

خود آگاہی اور اس بات کی طرف توجہ کہ انسان ایک بلند وبر تر مخلوق ہے اور اپنے اندر بے مثال اور قیمتی گوہر رکھتا ہے یہ بات اس کو (حبّ ذات کی بناپر) اپنی ذاتی کرامت کی حفاظت وپاسداری کے لئے دعوت دیتی ہے اور اخلاق کی بلند قدروں کی طرف کھینچتا ہے: "اکرم نفسک عن کل دنےۃ و ان ساقتک الیٰ الرغائب فانک لن تعتاض بما تبذل من نفسک عوضاً"[۲] اپنے نفس کو ہر طرح کی پستی سے پاکیزہ رکھو! چاہے وہ پستی پسندیدہ اشیاء تک پہونچا ہی کیوں نہ دے کیونکہ جو اپنی عزّت نفس تم دوگے اس کی قیمت اور عوض تمہیں کبھی مل نہیں سکتا۔

" انسان کی حقیقت" چونکہ آسمانی قداست و پاکیزگی کی حامل ہے اور وہ علم، قدرت اور آزادی کے چشمہ سے سیراب ہوا ہے لہٰذا وہ جھوٹ، باطل، طبیعت کی اسیری، گراوٹ اور پستی و ذلت و شہوت اور جہل میں ہاتھ پاؤں مارنے کے مخالف ہے اسی وجہ سے ہوشیار انسان ہرطرح کے اخلاقی رذائل سے کہ جو اس کی عزت اور غیرت

۱۔لقد کرمنا بنی آدم...... و فضلناھم علی کثیرممن خلقنا تفضیلا۔ سورۂ اسرائ، آیت ۷۰۔

۲ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

سے منافات رکھتے ہیں، بیزار ہوتا ہے۔[1] اس کے مقابل ایک ایسا انسان جو ذلّت، پستی اور فرومایہ ہونے کا احساس کرے اور اپنے اندر پائی جانے والی عظیم شرافت پریقین نہ رکھے، وہ ہر طرح کے نا پسند اخلاقی افعال کے ارتکاب سے بے پرواہ ہوتا ہے: اللئیم لا یستحی، اللئیم اذا قدر ا فحش واذا وعد اخلف، اللئیم لا یرجیٰ خیرہ ولا یسلم من شرہ ولا تؤمن غوائلہ، اللئیم مضاد لسائر الفضا ئل و جامع لجمیع الرذائل۔[2] کمینہ شخص شرم نہیں کرتا، کمینہ جب قدرت پاتا ہے برائی کرتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے، کمینہ سے خیر کی امید نہیں کی جا سکتی اور اس کے شر سے محفوظ نہیں رہا جا سکتا اور اس کے فسادوں سے بے خوف نہیں رہا جا سکتا، کمینہ تمام فضائل کا مخالف اور تمام رذائل کا حامل ہوتا ہے۔ من ھانت علیہ نفسہ فلا تامن شرہ۔[3] جو انسان خود کو بے حیثیت سمجھتا ہو اس کے شر سے بے خوف نہ رہو۔

اس مطلب کی وضاحت نفسیاتی اعتبار سے خود انسان کے خیال واعتقاد سے ہماہنگ ہونا یا نہ ہونا ہے:... اگر میں بے رحمانہ اور احمقانہ عمل کا مرتکب ہوں تو میری عزت نفس ملامت کا شکار ہوجائے گی۔ کیونکہ وہ عمل میرے ذہن کو اس امکان کی طرف متوجہ کرے گا کہ میں ایک بیوقوف اور ظالم انسان ہوں۔ سینکڑوں آزمائش کے درمیان کے عدم موافقت کے نظریہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ واضح ترین نتائج ایسے حالات میں حاصل ہوئے ہیں جو انسان کی عزت نفس سے مربوط ہیں، کیونکہ جس طرح امید کی جاتی ہے کہ جو افراد زیادہ عزت نفس کے مالک ہیں، اگر ان سے بے رحمانہ اور احمقانہ رفتار سرزد ہو جائے تو دوسروں سے زیادہ نا موافقت کا احساس کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی انسان معمولی عزت نفس رکھتا ہو تو کیا پیش آسکتا ہے؟ اگر ایسا انسان غیر اخلاقی اور احمقانہ عمل کا ارتکاب کرے تو زیادہ ناموافقت کا احساس نہیں کرے گا ...دوسری طرف وہ انسان جوزیادہ عزت نفس کا مالک ہے، غالباً وہ ایک برے عمل کے ارتکاب کے وسوسہ کے مقابل مقاومت کرتا ہے، اس لئے کہ بے برے کام اس کے اندر زیادہ سے زیادہ نا موافقت ایجاد کردیتا ہے۔[4]

۱۔ الصدق عزّ والکذب عجز، سچ عزت (کا سبب) ہے کتاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲٤٦ ؛ الغیبۃ جھد العاجز، مازنی غیور قط، غیبت عاجز کی کوشش ہے، کسی غیر تمند نے کبھی زنا نہیں کیا (نہج البلاغہ، ح ۲۹۷) ؛ الکذب والخیانۃ لیسا من اخلاق الکرام، جھوٹ اور خیانت اچھے اخلاق سے نہیں ہیں (غرر) وموت فی عز خیر من حیاۃ فی ذل، عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر، (بحار الانوار، ج ٤٤، ص ۱۹۲)

۲۔ غرر الحکم، تیسری فصل، ص ۲٦۰۔

۳۔ بحار الانوار، ج ۱۷، ص ۲۱٤۔

٤۔ روانشناسی اجتماعی، ترجمہ شکرکن، ص ۱۵۰ ، ۱۵۱ ۔

اس وجہ سے اخلاقی تربیت کی ایک روش شخصیت کا احترام ہے یعنی ایسے امور کا انجام دینا کہ جن سے خود کو یقین ہو یا جس کی تربیت کی جارہی ہے اس کو اپنی قدروقیمت کا یقین حاصل ہو۔ ایڈلر، A، y .a d l e r جوکہ ایک فردی نفسیات کا موجد ہے اس نے احساس کمتری کو اپنے نظریہ کی اساس قرار دی ہے اورا سے علت اور تمام غیر معمولی رفتار کی علت اور سرچشمہ سمجھتا ہے۔احساس کمتری رنگین دھاگہ کے مانند جو نفسیاتی اختلال کے تمام حالات میں کھنچا ہوا ہے۔ ایک غصہ وریا بے صلاحیت بچہ سن رسیدہ ہوکر بھی نفسیاتی تعادل کی قوت نہیں رکھتا ہے۔ نفسیاتی مریض، مجرمین، جنسی منحرفین اور روحی بیمار سباپنی نا رسائی اور ضعف کے احساس کا رنج و الم برداشت کرتے ہیں۔ اور مسلسل شک وتردید اور گمراہی میں زندگی بسر کرتے ہیں اورایک معتمد و مستحکم مرکزتلاش کرتے ہیں...احساس کمتری طبیعی ارتقا کے لئے رکاوٹ بنتا ہے [1] اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ بچہ مکمل اس احساس یٔنغوطہ لگاتا ہے اور لاحاصل ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود خود کواس حالت سے نجات دینا چاہتا ہے، اس حالت مینّبد گمانی اور وحشت احساس کمتری کی راہ کوکھول دیتی ہے اور بچہ نفسیاتی اختلال کا شکار ہوجاتا ہے، اس موقع پر ذہنی ونفسیاتی حرکت، سکو ن اور سکوت کا شکار ہوجاتی ہے ، اس معنی میں کہ بچہ پھر اپنے ضعف اور نقائص کو دور کرنے پر قادر نہیں ہوتاہے، ناچار اس کے علاوہ کوئی راہ نہیں رکھتا کہ خیالی تعادل بخشنے(جھوٹی تلافی) سے خود کو ماحول کے حوالے کردے۔ [2]

احساس کہترنامی کتاب میں، ایڈلر کے نظریہ کی توضیح کے سلسلہ میں جو احساس کمتری سے پیدا شدہ زندگی کی روش کی اس طرح منظر کشی کرتے ہیں: احساس کمتری درجہ کیفیت اور سب سے پہلے نتیجہ کے اعتبار سے جو اس سے تجربے کے ضمن میں حاصل ہوتا ہے، انسان کے طرز زندگی کی تعیین کرتی ہے۔یہاں پر تین اساسی سازوسامان اور اس کے بعد تین طرز زندگی کو مشخص کیا جاسکتاہے ، طبیعی جبران کا سازو سامان، گریز وناامیدی کا ساز و سامان اور خیالی جبران کاساز وسامان۔

۱۔ طبیعی تلافی:

یہ تلافی ایک نتیجہ خیز اساسی روش کے پایہ پر استوار ہے کہ جو نفسیاتی محوروں کی واقعی تعیین کرتا ہے، مثال کے طور پر ایک حادثہ کا شکار انسان کہ جو جسمی اور عضوی نقص رکھتا ہے، اسے صحیح کرنے یا مرکزی اعصابی مشین اور دیگر اعضاء کے وسیلہ سے اسی ایک تلافی کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے۔

۱۔ ایڈلر: روانشناسی فردی، ترجمہ حسن زمانی، ص ۵۹۔

۲۔ ایضاً، ص۵۷۔

۲۔ گریز اور ناامیدی:

واقعیت سے فرار کرنے کے علاج یا ناکامی اور محرومیت کے ظاہر ہونے کے علاج کا ساز وسامان ایسے موارد میں استعمال ہوتا ہے کہ جب طبیعی تلافی ممکن نہیں ہوتی ہے یا اس کے لئے راہ بند ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان اپنے آپ کوناتوانی اور شکست دوچار سمجھتاہے، اپنی نسبت شک کرتا ہے اور اس کے اندر قوت وجرأت کی کمی محسوس ہوتی ہے، اس وقت وہ متعدد اور پے درپے شکستوں اپنے آپ کو پاتا ہے اور ناکامی کی وادی میں پے درپے غوطہ لگاتا رہتاہے، اوریہی شکستیں اس کے پہلے احساسات کو تقویت بخشتی ہیں ایسے موارد میں زندگی کا نقشہ مسئولیت اور ذمہ داری سے گریز اور ہر قسم کی سعی و کوشش سے لاشعوری کے طورپردوری کری بنیادکھنچ جاتا ہے

یہ المناک تغیر تدریجاً اور ہر دفعہ زیادہ خلاق انسان کی فعالیت کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ محدود کردیتا ہے۔

۳۔ خیالی تلافی:

کچھ مواردمیں گریز اوریاس کے غالب ہونے کے بجائے، انسان یا تو خیالی تلافی کی راہ کا انتخاب کرتا ہے یا ان صفات کو معمولی اور بے قیمت شمار کرتاہے جو دوسرونکے اندر پائی جاتی ہیں اور اس میں نہیں ہیں ۔یا بلافاصلہ ایسی عیاشیوں میں لگ جاتا ہے کہ جو فکراور مشکلات کو وقتی طورپر اس کے ذہن سے دور کردیتی ہیں اور ا سے ایسی لذتیں دیتی ہے کہ جو ایک منطبق وموافق عمل کے نتیجہ میں اس کو نصیب ہوتی ہیں ۔[1]

جیسا کہ ملاحظہ ہوا، ایڈلر کے نظریہ کی بنیاد عملیاختلال کی وضاحت کے سلسلہ میں عزت نفس کے فقدان اور خود اس کی تعبیر کے مطابق احساس کمتری کے اثرپر استوار ہے۔

نفسیات میں من ازم کے نظریئے بھی کلی طورپر انسان کے نفسیاتی وجذباتی ابعاد و جوانب اور اس کی نظرپر تاکید کرتے ہیں ان کے مشترک اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ تمام انسان انقلاب و تحول کے بالاترین درجہ تک پہونچ سکتے ہیں،

۲۔ انقلاب و تحول کے راستہ میں آزادی کا وجود ان بلندیوں تک پہونچنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے

۳۔ عام طورپر موانع خارجی اور بیرونی ہیں۔

۱۔ دکتر منصور، احساس کہتری، ص۶۰، ۶۱۔

"مزلو"اور "راجرز" انسان کے اپنے شخصی اور تحقق کے لئے دوسروں سے زیادہ تاکید کرتے ہیں وہ طریقے اور فنون کہ شخصیت کی تعظیم کے حصول کے لئے جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

الف۔اکرام واحترام:

مزلو ضرورت احترام کو مستقل طور پر ذکر کرتا ہے معاشرے کے نفسیاتی بیماروں کے علاوہ تمام افراد اپنے لئے احترام کے قائل ہیں، ان کی خواہش ہے کہ خود کو بااہمیت محسوس کریں اور اس اہمیت کی بنا محکم اور استوار پایہ پر رکھی گئی ہو۔۔۔توانائی، کامیابی، تجربہ، مہارت، شایستگی، دنیا کا مقابلہ، استقلال، آزادی، مرتبہ اور اعتبار کی ضرورت، (ایسی عزت واحترام کہ لوگ اس کے قائل ہوں) قدرومنزلت، افتخار، شہرت، نفوذاہمیت وبزرگی ان سب چیزوں کی طرف میلان اسی خواہش سے پیدا ہوتی ہیں۔۔۔جب اپنے احترام کی خواہش پوری ہوجائے توانسان اپنے خوداعتمادی، اہمیت، توانائی اور کفایت کا احساس کرتا ہے اور اپنے وجود کو دنیا میں مفید اور لازم سمجھتا ہے۔ لیکن ان ضرورتوں اور خواہشوں کا پورا نہ ہونا احساس کمتری، کمزوری اورناامیدی کا باعث ہوتا ہے۔۔۔سالم ترین اور ثابت ترین عزت نفس، احترام کے اُس پایہ پر استوار ہے جس کے ہم مستحق ہیں۔نہ یہ کہ ظاہری شہرت چاپلوسی اور خواہشات پر۔۔۔[1] کارل راجرز بھی مکمل طور پر اس کا قائل ہے اور اپنے علاج کا طریقۂ کار اُسی کی بنیاد پر تلاش کرتا ہے۔ اس کی نظر میں دو اساسی چیزیں درج ذیل ہیں:

۱۔ہر انسان کی عظمت وبزرگی نیز اس کی اہمیت کا نظریہ رکھنا۔

۲۔اس بات کا معتقد ہونا کہ لوگ اچھے اور قابل اعتماد ہیں۔

راجرز کے علاج اور مشورت کا طریقہ مُراجع محوری کی بنیاد پر ہے؛یعنی تیکنیکی صرف اصالت و حقیقت، غیر مشروط مثبت تعیین اور مخلصانہ درک کی نشاندہی کے لئے ہیں۔ احساسی اورجذباتی عناصر معالج اور مُراجع کے رابطہ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ و تیکنیکیجو اس اکرام واحترام کے احساس کو ،جس کی تربیت کی جاتی ہے اس تک منتقل کرسکتی ہیں، یہ ہیں:موقع ومحل کی طرف توجہ اور حضور ذہن رکھنا، اُس پرکان دھرنا، احساسات یا اس کی باتونکے محتوا اور مفہوم کا ضروری مواقع میں انعکاس (اس لئے کہ تربیتپانے والا سمجھے کہ اس کی باتوں پر توجہ دے رہا ہے) گفتگو کے علاوہ دوسری نشانیاںیعنی چہرہ، رخ اور جسم کی حرکتیں اس بات کی عکاسی کررہی ہوں کہ گویا وہ اس کی باتوں کو اہمیت دے رہا ہے۔

۱۔مزلو، روان شناسی شخصیت سالم، ص۱۵۵،۱۵۴۔

"خلوص یا مخلصانہ درک" متربی (یعنی جس کی تربیت کی جاتی ہے) سے رابطہ ایجاد کرنے میںّا ساسی کردار ادا کرتا ہے۔ راجرز کے بقول ہمدلی و خلوص ایک ایسا طریقۂ کار ہے جودیگرافراد کے متغیر احساسات کی نسبت حساس ہونے اوران کے درمیان عاطفی وجذباتی پیوند کا متضمن ہے۔ ایک مدت تک دوسروں کی زندگی جینا اور ان کی احساساتی دنیامیں واردہونا اور ان کے احساسات کے بارے میں قضاوت سے اجتناب کرنا (ان کے احساسات کو سمجھنے کے لئے کوشش کرنا)۔ اسی طرح ہمدلی و خلوص مخاطب کے غیر کلامی علائم کے درک کا مستلزم ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہمدلی کے لئے سب سے پہلے تربیت پانے والے کے عاطفی تجربہ کو دقیق انداز میں درک کریں پھراس کے بعد جوکچھ ہم نے سمجھاہے کلمات اوراشاروں کے قالب میں اُس تک منتقل کریں۔ ہلکی مسکراہٹ، امیدبخش نظر، کبھی اس کے شانہ اور جسم پرہاتھ رکھنا اور ظریف انداز میں ہنسی مذاق کرنا اس سلسلہ میں مؤثرہیں۔

ہمدلی، دوستی اوررابطہ برقرار کرنے کے لئے ایک مہارت ضروری ہے جن کا اکثر تربیتی طریقوں جیسے احترام واکرام میں مربی محتاج ہوتا ہے۔ اور اس کوچاہئے کہ اُس تک پہنچنے کے لئے اپنے اندراس کی آمادگی پیدا کرے "خود تربیتی طریقہ" میں اپنی شخصیت کے ساتھ اسی رابطے کا ایجاد کرنالازم وضروی ہے۔

پیغمبر اکرم اور ائمہ معصومین (ع) کی سیرت دوسروں کے حق میں ان کے احترام واکرام سے بھری پڑی ہے جیسے: سلام کرنا نیز سلام کرنے میں پہل کرنا حتیٰ بہ نسبت بھی، بچوںبچوں کے ساتھ کھیلنا؛بچوںکے اچھے نام رکھنے کی تاکیدکرنا نیز انہیں اچھے القاب سے پکارنا، نو واردانسان کو جگہ دیناجس کے بارے میں قرآن کریم کا صریحی حکم ہے۔[1]

نیک گفتاری اورخوش زبانی کی تاکید کرنا قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ.[2] دسیوںدیگراحکام اورتاکیدات کے جواسلامی معاشرہ میں مومنین کے احترام واکرام کی جانب توجہ کی حکایت کرتے ہیں یہاںتک کہ مومن کی حرمت اوراُس کی رعایت حرمت کعبہ سے بالاترتصورکی گئی ہے۔[3]

۱۔ (یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللهُ لَکُمْ...)سورہ مجادلہ، آیت ۱۱ ."ایمان والو!جب تم سے مجلس میں وسعت پیدا کرنے کے لئے کہا جائے تو دوسروں کو جگہ دیدو تاکہ خدا تمھیں (جنت میں) وسعت دے..."۔

۲۔ سورہ أسراء آیت ۵۳. "میرے بندوں سے کہدیجئے کہ صرف اچھی باتیں کیا کریں"

۳۔ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا: "المؤمن اعظم حرمة من الکعبة" بحار، ۶۸، ص۱۶۔

مومن حرمت کے لحاظ سے کعبہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس کے علاوہ جو چیز بھی مسلمان کی ہتک حرمت اور توہین کا باعث ہو، اسلام میں اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ حضرت علی نے انبار شہر کے رہنے والوں سے جو ان کے استقبال میں پیادہ اور غلامانہ انداز میں آئے تھے، فرمایا:

یہ کون سا کام ہے جو تم انجام دیتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ ایک رسم ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے حکّام اور فرمانرواؤں کا احترام کرتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا:

خدا کی قسم تمہارے فرمانروا اور حکّام اس کام سے کوئی استفادہ نہیں کرتے اور تم لوگ بھی اپنے اس عمل سے دنیا میں زحمت و مشقت اٹھاتے ہو۔ اور آخرت میں بھی تمہاری بد بختی کا سبب ہے۔ [۱]

حتّیٰ اُن موارد میں بھی کہ ایک عمل ظاہری طور پر اکرام ہے لیکن حقیقت میں دوسروں کے ذلیل و خوار ہونے کا باعث ہے۔ اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حسین بن ابی العلاؑ کچھ لوگوں کے ہمراہ مکہ کے سفر میں ہم سفر ہوا۔ اور ہر منزل پر اپنے دوستوں کی مہمان نوازی میں ایک بھیڑ ذبح کرتا تھا۔ اور جب سفر کے دوران حضرت امام جعفر صادق۔ کی خدمت میں آیا تو حضرت نے اُس سے کہا: آیا مومنین کو ذلیل و خوار کرتے ہو؟ حسین بن ابی العلاؑ نے امام کے سوال و جواب سے سمجھ گیا کہ اُس کے احباب تنگدستی کی وجہ سے اس کے مانند عمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے لہٰذا وہ اپنے آپ میں ذلت و خواری کا احساس کرتے تھے۔

تربیت پانے والے یا فرزند سے مشورہ کرنا بھی اس کے احترام و اکرام کے مانند ہے وہ اس طریقۂ عمل سے خود کو عالی مرتبہ اور عظیم شخصیت خیال کرتا ہے، خداوند عالم حتیٰ پیغمبر اکرم سے فرماتا ہے: "اپنی امت اور ماتحت افراد سے مشورہ کرو"۔ [۲]

فرزند کے لئے کسی گھر یا کمرہ کا مخصوص کرنا (جبکہ اس کا امکان ہو) اور بطور کلی ہر قسم کی مالکیت اور تملک کا احساس بھی ان امور میں سے ہے کہ جو انسان کے احترام و اکرام کے احساس کا باعث ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت ۳۷۔

۲۔ (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) سورہ آل عمران، آیت ۱۵۹۔

ب۔بغیر شرط کے مثبت توجہ:

محبت اور علاقہ انسان کی اساسی ضرتوں میں سے پنجن کا مختلف ماہرین نفسیات نے مختلف اندازمیں کیا ہے، کارن ہورنائے [Hornay, k]ان دونوں کو "محبت" اور "تصویب اعتبار و محبوبیت" کے عنوان کے تحتذکر کرتا ہے، جان بالبی [Bowlbyj]نے"محبت ودل بستگی"کے مفہوم کو اپنے نظریہ کی بنیاد قرار دی ہے اور بچے کی سیرت کے رشدوارتقاء کو دلبستگی کی ضرورت صحیح طور سےپوری کرنے میں خیال کیاہے۔ مزلو جسمانی اور امن و سلامتی کی ضرورتوں کی تأمین و تضمین کے بعد تعلق اور محبت کی ضرورت کوسب سے اہم ضرورت سمجھتاہے۔

محبوب دوستوں کانہ ہونا ایک بیوی اورایک بچے کو شدت سے احساس ہوتاہے۔وہ دوسرونکے ساتھ عاطفی روابط کے محتاج ہیں بعبارت دیگروہ اپنے گروہ یاخاندان اور فیملی یناًایک مرتبہ کامحتاج ہیں... نفسیاتی کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ عشق و محبت کی ضرورتوں سے بے بہرہ ہونا ناکامی اور ناسازگاری کی بنیادہے۔(۱)

راجرز کے نظریہ کے مطابق مثبت توجہ بغیر شرط کے انسان کے اندر عزت ونفس کا احساس پیدا کرتی ہے جو کہ دوسروں کی طرف سے خصوصاً اپنے سرپرستوں کی طرف سے گرم اور محبت آمیز، تعلقات روابط،قلبی لگائو، قبولیت اور مہربانی کو شامل ہے بے قید وشرطتوجہ مثبت اس معنی میں ہے کہ جوتاثیر وتاثرایک انسان سے دوسرے انسان کے روابط کی بنیادپر اور اس احساس سے وجودمیں آتی ہے کہ تربیت پانے والا ہرصورت میں ایک بااہمیت شخص ہے۔ اگر انسان احساس کرے کہ محبت(مثبت توجہ) اُس صورت میں حاصل کرے گاکہ جب دوست رکھنے کے قابل ہو تو اپنے اندر سے تنفر وبیزاری کے احساس کو دور کرکے دوست رکھنے والی تصویرباقی رکھنے کی کوشش کرتاہے،یہاں پر نہ یہ کہ احساس تنفر خود اس کے خیال میں ناموافق ہے بلکہ انسان کو مثبت توجہ کے کھو جانے پر بھی تہدید کرتا ہے ، ایسے موقع پر زبردستی اس پر فضیلت پیدا کرنے کے شرائط کو لادنا تجربیات کے انکار کا موجب ہوتاہے اور جسم اور اس کی شخصیت درمیان شگاف پیدا ہوجاتا ہے، لیکن اگر والدین (یا مربی) اپنے فرزند کی طرف بدون شرط اور مثبت توجہ رکھتے ہوں اور وہ احساس کرے کہ والدین اس کی اہمیت کے قائل ہیں، تو انکار تجربیات کی پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔(۲)

۱۔ روانشناسی شخصیت سالم، ص۱۵۰تا۱۵٤۔

۲۔ روانشناسی شخصیت ، ص۲۲۱۔

بے شک توجہ مثبت بدون شرط تربیت حاصل کرنے والے کی شخصیت کے احترام وتکریم کا باعث ہوگی اور اس کے اندر عزت نفس کا احساس پیدا کرے گی۔ اہم بات یہ ہے کہ تربیت پانے والا خود ہی یہ احساس کرے کہ وہ ایک منفرد اور مشخص انسان کے عنوان سے مربی کی توجہ اور عنایت کا مرکز ہے، اگر یہ احساس ثابت ہوجائے تو اس کی ہر ناپسند رفتار وکردار کی (صحیح طرز کے ساتھ) مخالفت کی جا سکتی ہے لیکن اسی حال میں یہ احساس بھی رکھتا ہو کہ خود اُس کو لوگ دوست رکھتے ہیں اور مخالفت حقیقت میں اس کے ناپسندیدہ اعمال ورفتار سے ہے، جیسا کہ قرآن کریم حضرت لوط کی زبانی ان کی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(قَالَ اِنِّی لِعَمَلِکُمْ مِنَ الْقَالین)[1]

"انھوں نے کہا: میں تمہارے کردار کا دشمن ہوں"۔

حضرت علی نے بھی حضرت رسول خدا کی حدیث نقل فرمائی ہے:

"اِنَّ اللهَ یُحِبُّ الْعَبْدَ وَیَبْغُضَ عَمَلَهُ...."۔[2]

"خداوند سبحان کبھی کبھی کسی بندے کو دوست رکھتا ہے لیکن اس کے عمل کو دشمن رکھتا ہے"۔

بچوں کے ساتھ برتائو کے سلسلہ میں بھی روایات میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ قلبی لگائو اور نرمی کے ساتھ برتائو کرو، انھیں بوسہ دو، ان کے مہرو محبت میں کمی نہ کرو تاکہ محبت کی احتیاج ان کے اندر نفسیاتی الجھنوں وبیماریوں میں تبدیل نہ ہوجائے، جو شخص دوسروں کی محبت سے بہرہ مند ہو!، وہ دوسروں کے ساتھ احسان ومحبت کر سکتا ہے۔ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں:

"بچوں کو دوست رکھو اور انہیں اپنے رحم وکرم کے سایہ میں قرار دواور جب بھی اُن سے وعدہ کرو تو اُسے وفا کرو"۔[3]

۱۔ سورہ شعرائ، آیت ۱٦۸۔

۲۔ نہج البلاغہ، خ ۱٥٤۔

۳۔ "أَحِبُّوا الصبیان وارحموهم وَاذا وعدتموهم شیئاً ففولهم" کافی، ج٦، ص٥۲۔

حضرت امام جعفر صادق بھی فرماتے ہیں:

"خداوند سبحان ضرور بالضرور اپنے اُس بندے کو جو اپنی اولاد سے بہت محبت کرتا ہے مورد رحمت قرار دیتا ہے"(۱)

"اپنے فرزندوں کو زیادہ بوسہ دو، کیونکہ بہشت میں ہر بوسہ کے بدلہ ایک درجہ ہوگا"(۲)

محبت اور مہربانی پیغمبر اکرم کی سنت اور سیرت ہے، نیز انسانوں کی اخلاقی تربیت ہدایت میں آپ کی کامیابی کا راز بھی یہی نکتہ ہے: "فَبِمَارَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَو كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَولِكَ فَاعْفُ عَنهُم وَاسْتغفِر لَهُم"(۳)۔ پس اللہ کی رحمت وبرکت سے آپ کے ساتھ نرم خو اور پُر محبت ہیں، اور اگر تند خو اور سخت دل ہوتے تو یقیناً آپ کے آس پاس سے وہ لوگ پراگندہ ہوجاتے۔ لہٰذا اُن سے درگذر کیجئے اور اُن کے لئے بخشش و مغفرت طلب کیجئے۔

پیغمبر اکرم کی سنت اور سیرت کے لئے بھی جو اُن کو پتھر مارتے تھے، دعا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَایَعْلَمُوْنَ" [خدایا! میری قوم کی ہدایت کر اس لئے کہ وہ نہیں جانتی ہے[وہ انسانوں کے ساتھ بدون شرط مثبت توجہ کا بالاترین درجہ ہے کہ جو اللہ کی تمام مخلوقات سے گہرے لگائو اور عشق سے حاصل ہوتا ہے۔

البتہ توجہ مثبت بلاشرط کی توفیق، صرف تمام انسانوں کے ساتھ عشق کرنے کے نتیجہ میں ممکن ہے۔ اہم یہ ہے کہ نکتہ خالص اور بے ریا محبت دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور گہرے لگائو اور شخصیت کے احترام کا باعث ہوتی ہے، نہ کہ جو کچھ تکلف اور دکھاوے سے پیدا ہوتی ہے۔

اپنے عشق و محبت کو اپنے فرزندوں یا تربیت پانے والوں میں ظاہر کرنے کے لئے ہر فرصت سے استفادہ کرنا چاہئے، جیسے اوقات ان کے ساتھ ہم گذاریں؛ مشترک رابطوں اور چاہتوں کو پروان چڑھائیں؛ باہم کھیلیں، ان سے کہیں کہ ہم تمھیں دوست رکھتے ہیں، اُن کے ساتھ اس طرح برتائو رکھیں کہ گویا وہ روئے زمین کی سب سے اہم انسان ہیں، ان کے پائدار اور ناقابل فراموش آثار وواقعات وجود میں لائیں، ان کی تعریف کریں وغیرہ وغیرہ...۔(۴)

۱۔ "انّ اللہ لیرحم العبد لشدّة حُبّه لولده" کافی، ج٦، ص٥٢۔

۲۔ "اکثرو من قبلة اولادکم فانّ لکم بکلّ قبلةٍ درجةً فی الجنّة۔" وسائل الشیعہ، ج١٥، ص٢٠٢۔

۳۔ سورہ آل عمران، آیت ١٥٩۔

٤۔ استفان مارستون، معجزہ تشویق، ترجمہ تور اندخت تمدن، ص٨١۔

محبت کا ظاہر کرنا اور اس کا بیان کرنا عاطفی روابط میں بہت اہم ہے۔ روائی کتابوں میں اس سلسلہ میں مستقل اور جداگانہ باب پایا جاتا ہے: حضرت امام جعفر صادق۔ نے فرمایا: "جب کوئی کسی انسان کو دوست رکھے تو اسے اطلاع دے کیونکہ یہ دوستی کے پائدار ہونے کا موجب ہوگا"[۱] خداوند سبحان بھی حضرت موسیٰ کی نسبت اس طرح سے محبت کا اظہار کرتا ہے: "یقیناً دوبارہ بھی ہم نے تم پر احسان کیا جب ہم نے تمہاری ماں کو وحی کی ... اور اپنی مہر و محبت کو تم پر ڈال دیا تاکہ میرے زیر نگرانی پرورش پاؤ۔"[۲] اور اپنے حبیب محمد مصطفی کی جان کی قسم کھاکر محبت اور لطف کا اعلان کرتا ہے: "آپ کی جان کی قسم وہ لوگ اپنی مستی میں سر گرداں ہیں"[۳]

قرآن کی مختلف تعبیریں لوگوں بالخصوص مومنین کی نسبت خداوند عالم کے بے پایان لطف وکرم کو بیان انسانوں کے عظیم مربی کے عنوان سے بیان کرتی ہیں، قومی، عبادی، "اِنّی اَخَافُ عَلَیْکُم، هَلْ لَکَ یَااَیُّهَا الّذِیْنَ آمنوا۔۔۔"وغیرہ۔ آخری نکتہ یہ ہے کہ محبت کے اظہار میں ہمیں اعتدال اور میانہ روی کی رعایت کرنا چاہئے اور محبت میں افراط سے ہمیں اجتناب کرنا چاہئے؛ کیونکہ یہ چیز فرزندوں کو بے حوصلہ وبے اعتماد بنادیتی ہیں، اس وجہ سے مشکلات زندگی کے موقع پر حقارت (کمتری) اور ناتوانی کا احساس کرتے ہیں، کیونکہ سماج اور جس ماحول میں وہ ہیں اس میں اتنی محبت اور مہربانی انھیں نصیب نہیں ہوگی۔ محبت میں افراط تربیت پانے والے کی تربیت میں تاثیر کو زائل کردیتی ہے۔

حضرت امام محمد باقر فرماتے ہیں: "سب سے بُرے آباء وہ ہیں جو محبت اور نیکی میں افراط سے کام لیتے ہیں"[٤]

۱۔ "اذا احببت رجلاً فاخبره بذلک فانّه اثبت للمودة بینکما "کافی، ج۲، ص٦١٥، باب اخبار الرجل اخاه بحبه (انسان کا اپنے برادر ایمانی) اپنی محبت کی اطلاع دینا کو۔

۲۔ (وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّةً اُخْریٰ والقیت علیک محبّةً منی ولتضع علی عینی)(سوره طٰهٰ، آیت ۳۷تا ۳۸)

۳۔ (لَعَمْرُکَ اِنَّهُمْ لَفِی سَکْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ)سورۂ حجر، آیت ۷۲۔

٤۔ " شر الأباء من دعاه البرالی الافراط "(تاریخ یعقوبی، ج۳، ص ۵۳)۔

ج۔ اغماض (چشم پوشی):

کمزوریوںاور خطائوں کا اظہار عزت نفس کے برباد ہونے اور شخصیت کے پامال ہونے کا باعث ہوتاہے، لہٰذا ان سے اغماض اورچسم پوشی ان کے لئے تربیت پانے والے کی شخصیت کی تعظیم وتکریم ہوگی۔جب کسی سے کوئی خطا سرزد ہو یا خطا کا احتمال دیں۔ تو اس کی اخلاقی تربیت اور حفظ عزّت نفس کے لئے تین مرحلے نظر میں رکھے جاسکتے ہیں:

۱۔ صحت پر حمل کرنا چاہیئے یا اس کی اچھے طریقہ سے توجیہ کرنی چاہیئے؛

خطا کے ثابت ہونے سے پہلے اگر خطا کی توجیہ کرنے کے قرائن اور احتمالات موجود ہوں تو صحت پر حمل کیا جا سکتا ہے جو کہ اسلامی فقہ میں ایک مسلم الثبوت اصل ہے۔ لہٰذا احتمال خطا کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیئے اور اپنے تجسس اور کھوج سے کشف فساد اور ایک مسلمان کی آبروریزی کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔

حضرت علی نے فرمایا:

"اپنے] ایمانی [بھائیوں کے کام کی اچھے سے اچھے عنوان سے توجیہ کرو یہاں تک کہ اس کے خلاف تم پر ثابت ہوجائے، نیز ان کی باتوں کی نسبت بھی جب تک کہ اچھی توجیہ کا امکان ہے بدگمانی نہ کرو"۔(۱)

۲۔تغافل اور تجاہل:

اگر تربیت پانے والے کی خطا ثابت ہوجائے لیکن وہ پہلی مرتبہ تھی اور حالات کے مطابق ہم تشخیص دیں کہ اس کو نظرانداز کرنا اور اس کی شخصیت کا تحفظ اصلاح کا باعث ہو گا تو تغافل اور تجاہل سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ؛یعنی یہ ظاہر کریں کہ یہ خطا اس سے سرزدنہیں ہوئی ہے اوراس کی توجیہ کو بھی قبول کریں، باوجودیکہ اس کے صحیح نہ ہونے سے با خبر ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"دوسروں کے ساتھ معاشرت اور زندگی گزارنے کے حالات کی اصلاح ایک ایسے ظرف کے مانند ہے جس کا دوثلث]دو تہائی[زیرکی اور ایک ثلث] ایک تہائی[تغافل ہے"۔ (۲)

"جزئی امور سے تغافل کرکے خودکو بلند مرتبہ اور عالی قدر بناؤ"۔(۳)

۱۔"ضَع اَمر اَخِیکَ عَلیٰ اَحسنه حتّیٰ یاتِیکَ مَایقلبک عنه وَلَاتظُنَّنَّ بکلمة خرجت من اخیک سوائً وانت تجد فی الخیرسبیلاً" (کافی، ج۲، ص۳۶۲)۔

۲۔"صلاح حال التعایش والتعاشر ملاء مکیال ثلثاه فطنة وثلثه التغافل"۔(اخلاق فلسفی، ص۳۵۹)۔

۳۔"عظموا اقدارکم بالتغافل عن الدنی من الامور" ۔(ایضاً، ص۲۲۴)۔

حضرت علی نے فرمایا: "تجاہل وتغافل سے بہتر کوئی زندگی نہیں ہے۔"[1] تغافل تربیت حاصل کرنے والے کی تکریم و تعظیم کے علاوہ اسے اس بات کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مربی کے کرم و بخشش کی تلافی کرے اوریہی امر اس کی اصلاح اورخطا کے دوبارہ نہ کرنے کا سبب بنے گا۔

۳۔ عفوودرگذر:

خطاکے مسلم اورآشکارہونے کے بعد، اب بھی چشم پوشی اورنظرانداز کرنے کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ اگرہم یہ احتمال دیں کہ دوسروں کی خطاکو معاف کرنا ان کی بیداری اوراصلاح کا باعث ہوگی (کہ عام طورپر ایسا ہی ہے) توعفوکرناہی بہترہے۔خداوندغفور سماج اور معاشرہ میں ایک جاری وساری سیرت کے عنوان سے عفوودرگذرکی تاکیدکرتاہے: (خُذِ الْعَفْو)۔[2] "اے پیغمبر!عفوودرگذرکواپنا شعاربنالو"۔

......"ان لوگوں سے درگذرکرو اوران سے چشم پوشی کروکہ خدانیکوکاروں کودوست رکھتاہے"۔[3]

عفوودرگذرکرنا چاہئے کیا تم نہیں چاہتے کہ خداتمہیں معاف کردے اورخدابخشنے والااورمہربان ہے"۔[4]

روایات کی نظرسے بھی عفوودرگذشت مکارم اخلاق اورسماجی اوراجتماعی روابط میں نمایاں مرتبہ کا حامل ہے اوردوسروں میں اخلاقی فضائل کی راہ ہموارکرنے والاہے:

پیغمبراکرم نے فرمایاہے: "ایک دوسرے کو معاف کروتاکہ تمہارے درمیان سے کینے اورکدورتیں ختم ہوجائیں۔"[5]

عفوودرگذرخداکے بندوں کی عزت میں اضافہ کرتاہے، لہٰذاعفوکروتاکہ خداتمیں عزیزقراردے۔[6]

حضرت علی سے منقول ہے: "عفوودرگذشت تمام مکارم اخلاق کا تاج ہے۔"[7]

۱۔ "لاعقل کالتجاهل" (غررالحکم ودررالکلم۔) ۲۔ سورہ أعراف، آیت ۱۹۹۔

۳۔ (فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ) (سورہ مائدہ، آیت ۱۳)۔

٤۔ (وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا، اَلَاتُحِبُّوْنَ اَن یَغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ۔) (سورہ نور، آیت ۲۲)۔

٥۔ "تعافوا تقسط الضغائن بینکم" (کنز، ۷۰۰٤)۔

٦۔ "العفو لایزید الّا عزاًفاعفوا یعزکم الله"۔ (ایضاً، ۱۲،۷۰)۔

۷۔ "العفو تاج المکارم۔" (غررالحکم، فصل دوم، ص۲٤٥)۔

قرآن بھی فرماتاہے: (فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ)(۱) "آپ خوبصورتی کے ساتھ درگذر کردیں۔ " صفح" ترشروئی اورعتاب کے بغیردرگذر کرنے کے معنی میں ہے۔قدرت رکھنے کے باوجودمعاف کردینے کے بارے میں روایات میں بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ حضرت امام حسین فرماتے ہیں: "لوگوںمیں سب سے زیادہ درگذر کرنے والا وہ ہے جو قادر ہونے کے باوجود معاف کردے۔"(۲)

حضرت علی فرماتے ہیں: "بہترین عفو درگذشت وہ عفوودرگذشت ہے کہ جوقادرہونے کے باوجودمعاف کردی جائے۔"(۳)

انھوںنے اپنے فرزند حضرت امام حسن سے وصیت میں عفو و درگذر کو سزا سے زیادہ انسان کی صلاح کاباعث جاناہے: "جب تمہارے نزدیک کسی سے کوئی خطاسرزد ہوجائے، تو عادلانہ درگذر عقلمند کے لئے سزاسے زیادہ موثرہے۔"(٤)

پیغمبر اکرم بھی عفوکو موجب اصلاح جانتے ہیں:

ایک انسان نے اپنے خدمت گزاروں کے رویہ کی رسول اکرم کی خدمت میں شکایت کی۔تو حضرت نے فرمایا: انھیں معاف کردو تاکہ ان کے دل نیکیوں کی طرف مائل ہوں"۔عرض کیا: اے پیغمبر خدا !وہ لوگ کاموں میں سستی کرتے ہیں !فرمایا: انھیں معاف کردو"۔(٥)

اغماض وچشم پوشی کے ذریعہ بغیر رفتار کے نفسیاتی نقطۂ نظر (اس کے تحریکی پہلو کے علاوہ) "خاموشی" کے طریقہ سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے: خاموشی اس طریقۂ کارکو کہا جاتا ہے کہ اُس میں رفتار کا واقع ہونا بغیرتقویت کے رہ جائے اور تکرار ایک رفتار کی تقویت کے بغیر اُس رفتار کے مکمل توقف کا باعث ہوتی ہے... مثال کے طور پر استادنا مطلوب رفتارسے بے اعتنائی کرے تو طالب علموں کے شور شرابہ کو خاموش کرسکتا ہے(٦) البتہ عفو و درگذر کے خاموشی سے بھی کہیں زیادہ عمیق معنی پائے جاتے ہیں، اگرچہ عام طور وہ پر خاموشی کا مستلزم ہے۔

۱۔ سورہ حجر، آیت ۸۵۔

۲۔ "ان اعفی الناس من عفی عنه قدرته "(بحار، ج٧٤، ص٤٠١)۔

۳۔ "احسن العفو كان عن قدرة"(غرر الحکم، فصل دوم، ص٢٤٦)۔

٤۔ "اذا استحق احد منک ذنبا فان العفو اشدّ من الضرب لمن كان له عقل"(بحار، ج٧٧، ص٣١٦)

٥۔ مستدرک الوسائل، ج٢، ص٨٧۔

٦۔ سیف، تغییر رفتار ورفتار درمانی، ص٣٨٢۔

د- ذمہ داری دینا:

جب انسان خود کو قوی اور توانا محسوس کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اُس سے کوئی کام ہوسکتا ہے تو وہ افتخار وعزت کا احساس کرتا ہے، تربیت پانے والے انسان کی تکریم کے لئے اُس کے اندر عزت کا احساس پیدا کرنا چاہئے، تاکہ اُس سے ذلت اور کمتری کا احساس جاتا رہے، لہٰذا ضروری ہے کہ تربیت پانے والے کی توانائیوں کے ظاہر ہونے کا امکان پیدا کریں تاکہ اسے یقین ہو کہ اس سے بھی کام ہوسکتا ہے اور وہ بھی کسی کام کا آدمی ہے تربیت پانے والوں اور فرزندوں کے درمیان ذمہ داری دینا اور کاموں کو تقسیم کرنا اُن کی شخصیت کی تعظیم وتکریم کا باعث ہوتا ہے اس کے دوسرے موارد اخراجات کی تنظیم کا امکان، انتخاب اور کسی بات کے طے کرنے کے لئے مہلت دینا، بعض ذمہ داریوں کو سپرد کرنا وغیرہ ہے، اور ذمہ داری کی سپردگی اگر عاقلانہ اور ظریف نگرانی کے ساتھ ہو تو اخلاقی تبدیلی کا باعث ہوسکتی ہے، مندرجہ ذیل داستان نے "پیاژہ" نامی معاصر نفسیات کو حیرت میں ڈال دیا ہے، توجہ فرمائیے: ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان میں نے ایک مؤسسہ وادارہ کا دیدار کیا تو وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوا، یہ مؤسسہ مجرم بچوں سے مخصوص تھا اوریورپ کے مشرقی علاقے میں واقع تھا، یہ ایک ماہر اور مدبر مدیر کے زیر ادارت تھا، وہ چاہتا تھا کہ جن بچوں اور نوجوانوں کی اُس نے ذمہ داری لے رکھی ہے، ان پر اعتماد کرے، یہاں تک کہ مؤسسہ کے نظم وضبط کو ان کے حوالے کردے اور اہم ترین ذمہ داری اُن میں سے شریر ترین کے حوالے کردے، اس تجربہ کے دو پہلو نے ہمیں مخصوص انداز میں اپنی طرف مائل کیا، ایک نووارد اور تجربہ کار افراد کی "تربیت" دیگر نوجوانوں کے اجتماعی گروہ کے ذریعہ اور دوسرے موسسہ کی داخلی نظم وضبط اور اشارے عدالتی امور بھی ان شاگردوں کے سپرد تھے جو روز شب پر محیط تھے، ذرا تصور کریں ان پر اس قدر اعتماد کہ مدرسہ کے قواعد اور دستورات کو شاگردوں کی جماعت معین کرتی ہے نہ بزرگ افراد، نو واردافراد میں کیا اثر رکھتی ہے۔ جہاں پر جو بچے اور نوجوان کسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے اور بچوں کے عدالتی محکمہ نے انھیں مجرم قرار دیا تھا اور وہ لوگ طولانی تادیب اور سزا کے منتظر تھے، یکبارگی خود کو اُن نوجوانوں کے درمیان دیکھتے تھے کہ جو جرم کے تمام مراحل گذارنے کے بعد اپنا علاج کرکے نئی زندگی چاہ رہے تھے، ایک منظم گروہ رکھتے تھے اوربلافاصلہ نووارد افراد کو اپنے جرگہ میں قبول کرکے تمام امور، فرائض اور ذمہ داریاں ان کے حوالے کردیتے تھے، کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب ایسے افراد زندان کے داروغہ سے روبرو ہونے کے بجائے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کرتے تھے تو یکبارگی بدل جاتے تھے اور پھر اس کے بعد ان میں کج رفتاری کی تکرار نہیں ہوتی تھی اس مؤسسہ کے ادارہ کرنے والے عظیم مربی کی خوبصورت ترین ایجادیہی بات تھی

اگر اس ادارہ کے شاگردوں سے کوئی خطا سرزد ہوتی تھی تو وہ عدالت اُس خطا کی تحقیق کرتی کہ جو ان ہی شاگردوں سے تشکیل پائی تھی اس حیرت انگیزعدالت کی نظریہ اور اس کے احکام وہاں کے اخبار میں شائع ہوئے تھے...۔(۱)

قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم کی سیرت دوسروں کو (خصوصاً نوجوانوں کو)ذمہ داریاں سونپنے کے بارے میں اُن کی استعداد کو بڑھانے اور ان کی شخصیت کا احترام کرنے کے لئے بہت سے واقعات کی نشاندہی کرتی ہیں مثلاً طالوت جیسے جوان کا انتخاب بنی اسرائیل کی قیادت کی ذمہ داری کے لئے ، اسامہ کی کمانڈری اور مصعب بن عمیر نامی جوان کا مدینہ کے لئے سب سے پہلے مبلغ کے عنوان سے تعارف کرانا وغیرہ۔

٤۔ اخلاقی اقدار کی دعوت دینا

جبکہ پہلی دو روشوں کے مطابق موانع برطرف ہوجائیں اورماحول موافق وسازگار ہوجائے نیز تکریم شخصیت کی روش سے باطنی آمادگی پیدا ہوجائے مربی کلی استفادہ کے ذریعہ اخلاقی اقدار کی دعوت کی کلی روش سے استفادہ کے ذریعہ تربیت پانے والوں کو اخلاقی فضائل کی طرف مائل وجذب کرسکتا ہے، بعبارت دیگر "اقدار کی تبلیغ" کرسکتا ہے۔(۲)

علم نفسیات تبلیغ کے مخصوص شرائط کو تین عنصر پیغام دینے والے (مبلغ) پیغام لینے والے اورپیغام میں لحاظ کرتا ہے کہ جو پیغام کی تاثیر اور نفوذ کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔

پیغام کی بعض مسلّم الثبوت خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ مخاطب کو اپنی جانب جلب (مائل) کرے۔(نیاپن رکھتا ہو اور دیگر امور سے الگ اورممتاز ہو)۔

۲۔ مخاطب کے نزدیک قابل درک ہو۔

۱۔ پیانزہ: تربیت رہ بہ کجا می سپارد، ۱۰۱، ۱۰۲۔

۲۔ تربیت پانے والا بھی "خود تربیتی" روش سے استفادہ کے ذریعہ پیغام دینے والے، پیغام لینے والے اورپیغام کی شرائط ملاحظہ کرسکتا ہے اور زیادہ صحیح اور مطلوب کا انتخاب کرسکتا ہے۔

۳۔اہمیت کے لحاظ سے مخاطب کے نزدیک قابل قبول ہو۔

٤۔اسے حفظ کرسکتا ہو اور بوقت ضرورت اُسے یاد کرسکتا ہو۔

٥۔ایک موضوع کے مثبت اور منفی (قوت وضعف) دونوں پہلو بیان کئے جائیں۔

٦۔پیغام کی تکرار، ترغیب و دلچسپی کے اثر کو مزید بڑھا دیتی ہے، اس شرط کے ساتھ سستی اور خستگی کا باعث نہ ہو۔

۷۔ایسے پیغامات جو زیادہ خوف ودہشت کے حامل ہوتے ہیں کمتر تاثیر رکھتے ہیں، کیونکہ اضطراب اور گھبراہٹ کو اس درجہ بڑھا دیتے ہیں کہ انسان اس کی صحت کا انکار کرنے لگتا ہے، مگر یہ کہ اُسے کسی اور ذریعہ سے یقین ہوچکا ہو۔

۸۔پیغام دینے والا یا مبلغ محبوب، باحوصلہ، مخلص، مطمئن، وفادار، قابل اعتماد، عاقبت اندیش، ہوشیار اور صادق ہو۔

پیغام اس بات کے لئے جو کہ خارجی اور مخالف دباؤ کے مقابل تاب لا سکے (قدرت بخش سکے) اس طرح سے جاگزین ہو کہ پیغام قبول کرنے والے کی دلچسپی میں اضافہ ہوجائے:

١۔نئے پیغام کو دیگر یقین و اعتقاد کے ساتھ مخلوط کرے۔

٢۔اپنے یقین و اعتقاد کی دلیلوں کی تحقیق کرے۔

۳۔متعارض دلیلوں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھے اور صحیح ترمیم یا اہم تر کا انتخاب کرے۔

٤۔رائے اور نظریہ کا بدلنا اپنے آزادنہ انتخاب کے زیر اثر ہو نہ کہ ترغیب دلانے والے کی زور زبردستی سے۔

اس روش کو منطق کی کتابوں میں "خطابہ" کہتے ہیں[1] اور اس طرح تعریف کرتے ہیں: خطابہ ایک ایسا علمی طریقہ ہے جس کی مدد سے لوگوں کو اُس چیز میں خاموش جس کی تصدیق کی ہم امید رکھتے ہیں، بصورت امکان خاموش اور قبول کرایا جاسکتا ہے۔ جو امور خطابہ کی تاثیر کو زیادہ کردیتے ہیں، بعض قائل سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

١۔ علمی یا اجتماعی اعتبار سے اپنا تعارف کرائے (دوسرے لوگ بھی یہ کام کرسکتے ہیں)

١۔ مظفر، المنطق، ص٤١٥اور اس کے بعد (اس فرق کے ساتھ کہ یہاں پر مفہوم زیادہ عام اور صناعت شعر کو بھی شامل ہوتا ہے)۔

۲۔اس طرح ظاہر ہوکہ اس کی تعظیم وتکریم نیز اس کی باتوں کی تصدیق کا باعث ہو، جیسے یہ کہ لباس، ہاتھ اور جسم کی حرکتوں، آنکھوں کے اشاروں، حزن و مسرت کی حالت وغیرہ کے اعتبار سے میٹنگ (جلسہ) اور موضوع سخن سے ہم آہنگ اور مرتبط ہو۔

۳۔ "بات کرنے میں" اس کی آواز غرض کے مطابق ہو (کبھی بلند تو کبھی آہستہ اور کبھی ترجیع تو کبھی تقطیع و....) آواز کا اچھا ہونا، اچھے انداز میں پیش کرنا اور طرز بیان میں تصرف اورتبدیلی بھی اہم امور میں سے ہے۔

٤۔ "مخاطبین" کے عواطف واحساسات کو جلب کرے اور ان کے اندر اس طرح نفسانی تأثّر کی حالت اور ذہنی آمادگی ایجاد کرے کہ جو غرض کے مطابق ہو، کبھی رقت و رحمت کی حالت تو کبھی خشم ونفرت کا انداز اور کبھی تبسم اور مسرت ایجاد کرے، اس بات کے لئے کہ جلسہ خشکی اور جمود کی حالت سے خارج ہوجائے اور قائل کی طرف متوجہ ہونیکی کیفیت حالت ، ان کے اندر ایجاد کرے، کبھی ضروری ہے کہ انھیں لطیفوں کے ذریعہ ہنسائے یا کسی حکمت آمیز نکتہ سے انھیں حیرت میں ڈال دے ۔ کبھی مخاطبین کی تعریف وتوصیف لازم ہے (اعتدال کی حد میں) لیکن ان کی ہر طرح کی توہین و تحقیر سے پر ہیز کیا جائے۔

۵۔ شہادت حال، یعنی عملی صداقت کے گواہ بھی قائل کی بات کے نفوذ میں موثر امور میں شمار ہوتے ہیں، اس طرح سے کہ فضیلت، صدق، امانت، علم اور معرفت سے مشہور ہو یا دوسری جہت سے محبوبیت رکھتا ہو یا یہ کہ اس کی گفتگو میں صدق وصفا اور اخلاص کی علامتیں ظاہر ہوں حضرت امیر المومنین علی۔کے بقول: "کوئی بھی شخص کچھ اپنے دل میں پنہاں نہیں کرتا مگر یہ کہ اس کی زبان کے اچانک کلماتہیں یا چہرے کے آثار سے ظاہر ہوجاتا ہے"۔[۱] بعبارت دیگر قائل کو چاہئے اپنے بیان پر ایمان رکھتا ہو، کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں اثر کرتی ہے"

"آپ حکمت اور اچھی نصیحت (موعظہ) کے ذریعہ اپنے رب کی راہ کی طرف دعوت دیجئے اور اُن سے بہترین انداز میں بحث وجدال کیجئے[۲]

۱۔ "ما اضمر احد شيئاً الّا ظهر في فلتات لسانه وصفحات وجهه" (نہج البلاغہ کلمات قصار ۲۶)۔

قرآن کریم کی زبان میں اس روش کو "موعظہ" سے تعبیر کیا گیا ہے البتہ موعظہ و نصیحت روش کے مرادی جنبہ کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، لیکن قرآن کی اس سہ گانہ تقسیم میں تقریباً اقدار کی دعوت کی روش سے ہم آہنگ ہے۔

۲۔ سورہ نحل، آیت ۱۲۵۔

موعظہ یعنی انسانوں کے عواطف واحساسات سے[۱] انھیں حق کی دعوت دینے کے لئے استفادہ کرنا۔ قرآن نے موعظہ کو صفت "حسنہ" سے مقید کیا ہے، کیونکہ:... نصیحت اُس صورت میں موثر واقع ہوتی ہے کہ ہر طرح کی خشونت، تند کلامی، فوقیت طلبی، طرف مقابل کی تحقیر وتوہین، ضد اور ہٹ دھرمی وغیرہ سے خالی ہو لہٰذا موعظہ اُس وقت اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے کہ احسن اور خوبصورت اندازمیں بیان ہو۔[۲]

اخلاقی اقدار کی دعوت کے طریقے درج ذیل ہیں:

الف۔ انذار وبشارت:

انذار[۳] یا ترہیب ڈرانے اور ہوشیار کرنے نیز بُرے اعمال کے بُرے نتائج اور عواقب کی طرف انسان کو متوجہ کرنے کے معنی میں ہے کہ اس میں ایک قسم کا ڈرانا بھی ہے۔ "تبشیر"(بشارت دینا) یا ترغیب انسان کو نیک امور اور مطلوب کاموں کے نتائج سے آگاہ کرنے کے معنی میں ہے کہ جو سرور و شادمانی کا باعث ہے۔ انسان فطری طور پر لذت اور نعمت کی طرف راغب ہوتا ہے اور درد والم سے اجتناب و دوری چاہتا ہے۔ اسی لئے اگر انذار وتبشیر مخاطب کے قبول کرنے اور اس کے یقین کے مطابق ہو تو موثر ہے، یعنی اگر مخاطب فکری واعتقادی اصول ومبانی کے لحاظ سے تصدیق کرے کہ یہ عمل ان لذتوں کا حامل ہے یا فلاں آلام کا باعث ہے تو بلاشبہہ ایسا انذار یا تبشیر موثر واقع ہوگا۔

قرآن کریم اور انبیائے الٰہی نے اس وسیلہ سے کثرت سے استفادہ کیا ہے، جیساکہ قرآن تمام انبیاء کو "مبشرین اور منذرین" کہتا ہے[٤] اور خود کو "نذیر"[٥] اور "بشریٰ"[٦] کہتا ہے۔

۱۔ مفردات راغب معجم مفردات الفاظ قرآن، میں اس کے دو معنی ذکر ہوئے ہیں: ۱۔"ایسی زجر وتوبیخ جو خوف دلانے کے ساتھ ہو"کہ جو اقدار کی دعوت کے فنون اور طریقوں میں شمار ہے۔ ۲۔"هو التذكير بالخير فيما يرق له القلب" خیر کے ساتھ نیصیحت کرنا اس چیز کے بارے میں جس کے لئے دل نرم ہوجائے۔کہ یہی عام معنی یہاں پر مراد ہے۔ المیزان، ج۱۲، ص۳۷۳۔ تفسیر نمونہ، ج۱۱، ص٤٥٥ پراسی عام معنی کو قبول کیا ہے۔۲۔ تفسیر نمونہ، ج۱۱، ص٤٥٦۔ المیزان میں بھی یہ بات ایک دوسرے انداز سے بیان کی گئی ہے:"من هنا يظهر انّ حسن الموعظه انما هو من حيث حسن اثره فى الحق الذى يراد به بأن يكون الواعظ نفسه متعظا بمايعظ ويستعمل فيها من الخلق ما يزيد وقوعها من قلب السامع موقع القبول فيرق له القلب ويقشعر به الجلد ويعيه السامع ويخشع له البصر"۔

۳۔ "الانذار اخبار فيه تخويف كما ان التبشير اخبار فيه سرور۔"(المفردات)۔٤۔ سورہ أنعام، آیت۸۔ ٥۔ سورہ مدثر، آیت۳٦۔ ٦۔ سورہ بقرہ، آیت۹۷۔

انذار وتبشیر سے استفادہ کرنے میں قرآن کریم کے تربیتی انداز میں دو نکتہ قابل توجہ ہے:

ایک۔ قرآن کریم میں انذار وتبشیر کا انسانی عواطف واحساسات کے اجاگر کرنے کا اہم رول ہے کہ ایک طرف خوف[۱]، خشیت[۲] اور خشوع[۳] خداوندعالم کی نسبت مخاطبین میں برانگیختہ کرتا ہے اور دوسری طرف محبت[٤]، شوق[۵] اور امید ان کے دل میں پروان چڑھاتا ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے درمیان ایک موازنہ ایسا توازن وتعادل ایجاد کرتا ہے کہ جو نہ یاس اور ناامیدی کا باعث ہوتا ہے اور نہ ہی غرور و بے خیالی کا روایات میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ مبلغ کو چاہئے کہ مخاطبین کو خوف ورجا کے درمیان رکھے۔[٦]

دو۔ انذار وتبشیر کے مصادیق کا استعمال: قران کریم میں اس کا دائرہ وسیع ہے، خداوندعالم ہر انسان کے لئے "رضوان" اور "روح" و "ریحان" کی بات نہیں کرتا، بلکہ بعض کو لذیذ غذائوں خوبصورت اور زربخت لباسوں، فرحت بخش تفریح گاہوں وغیرہ کے وعدے سے امیدوار کرتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں بلندپروازی نہیں کرنی چاہئے، بلکہ افراد کی استعداد اور ظرفیت کے مطابق، مختلف بشارتوں اور نعمتوں سے متعلق گفتگو کرنی چاہئے۔

ب۔ داستان گوئی:

داستان میں ایسا جادو ہوتا ہے کہ جو روحوں کو مسحور کرلیتا ہے، وہ کونسا جادو ہے اور کس طرح روحوں پر اثر انداز ہوتا ہے؟کوئی انسان بھی اس کے لئے حد و حدود معین نہیں کرسکتا آیا یہ خیال ہے کہ جو داستان سے پیدا ہوتا ہے اور داستان کے محل وقوع اور منزلوں کی یکے بعد دیگر تعقیب کرتا ہے اور اُسے ذہن میں ایک محسوس واقعیت سے تبدیل کردیتا ہے؟ یا انسان کے "وجدان کی مشارکت" داستان کے ہیرو کے ساتھ ہوتی ہے کہ جو آدمی کی روح میں اس کی تاثیر کا باعث ہوکر واضح اور روشن انداز میں احساسات وافکار میں جاگزیں ہوجاتی ہے؟

۱۔ (لمن خاف مقام ربه جنتان)(سورۂ رحمن، آیت٤٦)۔ ۲۔ (انما انت منذر من یخشاها۔)(سورۂ نازعات، آیت ٤٥)۔۳۔ (الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبهم لذکر الله۔) (سورۂ حدید، آیت١٦)۔٤۔ (والذین آمنوا اشدُّ حبّاً لله۔)(سورۂ بقرہ، آیت١٦٥)۔٥۔ (ان الذین آمنوا اولٰئک یرجون رحمة الله۔)(سورۂ بقرہ، آیت٢١٨)۔٦۔ "خیر الاعمال اعتدال الرجاء والخوف"۔ (غرر الحکم، فصل ٤، ص ١٥٦)۔

یا داستانی موقعیت سے انسان کی روح کے متاثر ہونے کی وجہ سے ہے، جب انسان عالم خیال میں خود کو اس کے حوادث وواقعات کے درمیان داخل تصور کرتا ہے اور دور سے ماجرے کا نظارہ کرتا ہے، لیکن یہ چاہتا ہے کہ نجات دینے والا یا نجات یافتہ ہو؟ جو بھی ہو داستان کی یہ سحر انگیز تاثیر قدیم الایّام سے انسان کے ساتھ رہی ہے، ہمیشہ اس کی زندگی کے ساتھ روئے زمین پر سیر کرتی رہی ہے اور کبھی ختم نہیں ہوگی۔[1]

داستان گوئی ایک ایسا طرزز اور اسلوب ہے کہ جو جذابیت اور سامع کو اپنے ہمراہ کرنے کے علاوہ داستان کے اغراض ومقاصد کو قبول کرنے کے لئے عاطفی راہ بھی ہموار کرتی ہے قرآن کریم نے انسانوں کی اخلاقی تربیت کے لئے داستان کا زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے داستان سن وسال کے تمام مراحل میں مفید اور مورد توجہ ہے، البتہ داستان کا مضمون سامعین کی سطح اطلاع وآگاہی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ خداوندعالم اپنے قصہ گوئی کے اہداف سے متعلق قرآن کریم میں فرماتا ہے:

(لَقَد كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُوْلِی الْاَلْبَابِ، مَاكَانَ حَدِيْثاً يُفْتَرىٰ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِیْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَومٍ يُؤمِنُوْنَ)[2]

"یقینا ان کے واقعات میں صاحبان عقل کے لئے سامان عبرت ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے گھڑھ لیا جائے یہ قرآن پہلے کی تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اس میں ہر شے کی تفصیل ہے اور یہ صاحبان ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت بھی ہے"۔

یہ اہداف درج ذیل ہیں:

ایک۔عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے۔

دو۔واقعیت اور حقیقت کا بیان ہے اور جھوٹ اور افتراء پردازی سے مخلوط نہیں ہے۔

تین۔حقائق امور کو بیان کرکے تجزیہ وتحلیل کرتا ہے۔

چار۔ہدایت ورحمت کا ایک وسیلہ ہے۔

۱۔ نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی، ص۱۲۴۔

۲۔ سورہ یُوسف آیت ۱۱۱۔

قرآنی داستان میں عواطف کو تحریک کرنے اور اُ سے ابھارنے کے علاوہ، تعقل وخردمندی کی پرورش بھی پائی جاتی ہے، قرآنی قصے انسانوں کے درمیان اخلاقی روابط کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں اور آخر کار، یہ اخلاقی فضائل ہیں جو کامیابی کے ساتھ میدان سے باہر آتے ہیں اور پستیاںاور ذلتیں اورسیاہ رو ہوجاتی ہیں ہابیل وقابیل ، موسیٰ وفرعون، موسیٰ وقارون، موسیٰ اور عبد صالح، آدم وحوّا، بنی اسرائیل کی گائے، ابراہیم اور اسماعیل،یوسف اور ان کے بھائی، لوط اور ان کی قوم وغیرہ کی داستانیں بہت سے اخلاقی اور تربیتی نکات کی حامل ہیں۔ وہ نکتہ جو قرآنی داستانوں میں توجہ کو جلب کرتا ہے ، یہ ہے کہ پست میلانات کا ذکر نہیں چھیڑتا اور مردو عورت کے روابط سے متعلق داستانوں میں حریم حیا کو محفوظ رکھتا ہے اور جزئیات کے ذکر سے اجتناب کے ذریعہ پردہ دری نہیں کرتا ہے۔

داستان سے مناسب اور بجا استفادہ خصوصاً قرآنی داستانوں یا ائمہ طاہرین علیہم السلام اور بزرگان دین سے متعلق داستانوں سے آسان زبان میں بیانات کی مقبولیت میں حیرت انگیز اثر ایجاد کرتا ہے۔[١]

ج۔تشبیہ و تمثیل:

"تمثیل "ایک موضوع کا کسی دوسری صورت میں بیان کرنا ہے اس طرح سے کہ دونوں قسموں کے درمیان شباہت پائی جاتی ہو اور اس کے ذکر سے پہلا موضوع زیادہ سے زیادہ واضح ہوجائے۔[٢] مَثَل جو کچھ پوشیدہ اور نامعلوم ہے اسے آشکار کردیتی ہے اور ماہیت امور کو واضح کردیتی ہے، مسائل کا بیان امثال کی صورت میں مخفی اورپوشیدہ معانی سے پردہ اٹھادیتا ہے اور مبہم اور پیچیدہ نکات کو واضح کردیتا ہے۔ مثل پند و نصیحت کی تلخی کو کم کرتی اور مسرت وشادمانی کا باعث ہوتی ہے اور مختصر الفاظ میں بہت سے معانی کا افادہ کرتی ہے اور کنایہ کے پردہ میں مطالب کی تعلیم دیتی ہے اورنہایت سادہ، آسان نیز محسوس زبان میں عقلی پیچیدگیوں کو ذکر کرتی ہے۔[٣] بلاشبہہ عام لوگوں کے درمیان متعارف اور شناختہ شدہ تربیتی وسائل میں سے ایک ضرب الامثال، تمثیلوں اور تشبیہوں سے مناسب استفادہ کرنا ہے۔ قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پر ان مثلوں سے استفادہ کیا ہے۔[٤]

١۔ مثنوی معنوی اخلاقی داستانیں اسی طرح کی ہیں۔

٢۔ "المثل عبارة عن قوله فی ش ء یشبه قولاً فی شء آخر بینهما مشابهة لیبین احدهما الاخر ویصوره" المفردات راغب۔

٣۔ اصول وروش ہای تربیت در اسلام، ص ٢٦٢ ملاحظہ ہو۔

٤۔ ٢٤٥ضرب المثل اور ٥٣ مورد تمثیل ہاے دینی۔

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"قرآنی مثلیں بہت سے فوائد کی حامل ہیں لہٰذا دقیق انداز میں ان کے معنی کے بارے میں غور و خوض کرو اور (بغیر توجہ کے) ان سے گزر نہ جائو"۔[1]

قرآنی مثالیں، جیسے دنیا کے سرانجام کی تشبیہ سرسبز گھاس کے پژمردہ ہونے سے، کفار کے اعمال کی تشبیہ سراب سے، منافقین کے بارے میں متعدد تشبیہیں، اُس بوڑھی عورت سے تشبیہ جو دھاگا کاتتی ہے وغیرہ وغیرہ، یہ سب مثالیں قابل غور ہیں۔ قرآنی مثلیں تربیت کے لحاظ سے درج ذیل فوائد کی حامل ہیں:

تعلیم عبرت، تفکر و تامل، تشویق و ترغیب، تنبیہ و آگاہی، تبیین و تقریر، پند و نصیحت اور پیچیدہ مسائل کو ذہن سے قریب کرنا۔

مثالوں میں اہم نکتہ یہ ہے کہ اس کے سطحی معانی میں توقف نہیں کرنا چاہئے بلکہ تعقل و تفکر کے ساتھ اُس کے عمیق اور گہرے معانی میں ڈوب جانا چاہئے۔ تربیت کے لحاظ سے بھی مربی کو یہ نہیں چاہئے کہ مثل میں موجود تمام نکتوں کو تربیت پانے والے کے لئے واضح و بیان کرے بلکہ اسے موقع دے کہ وہ اپنی تلاش و کوشش سے زیادہ سے زیادہ معانی کشف کرے۔

د۔ سوال و جواب:

کبھی ایک سوال کا ذکر مطلب کی طرف افراد کی توجہ اور حواس کے یکجا ہونے کا باعث ہوتا ہے، سوال کا ذکر کرنا اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخاطبین کی تحقیق و تلاش کی حس بیدار ہو اور جواب دہی کے لئے ضرورت محسوس کریں، بالخصوص اگر سوال اس طرح پیش کیا جائے کہ ان کے لئے نیاپن اور جاذبیت رکھتا ہو اور اس آسانی سے جواب نہ دے سکیں، ایسی صورت میں دل وجان سے قائل کی طرف آئے تاکہ اس کی باتیں سنیں۔ قرآن نے بھی متعدد مقامات پر اس روش سے استفادہ کیا ہے:

(هَلْ اَتَاکَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ)[2] "کیا تمھیں ڈھاپنے والی قیامت کی بات معلوم ہے؟"۔

(اَلْقَارِعَة مَا الْقَارِعَة وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَة)[3] "کھڑکھڑانے والی، اور کیسی کھڑکھڑانے والی اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ کیسی کھڑکھڑانے والی (قیامت) ہے؟"۔

۱۔ "امثال القرآن لها فوائد فامنعوا النظر فتفکروا فی معانیها ولا تمروا بها"۔

۲۔ سورہ غاشیہ، آیت ۱۔

۳۔ سورہ قارعہ، آیت ۱تا۳۔

(هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنَ مِنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَذْکُوراً)[1]

"کیا انسان پر ایسا وقت بھی آیا ہے کہ جب وہ کوئی قابل ذکر شے سے نہیں تھا؟"۔

کبھی سوالات کو دوسروں کی زبان سے بھی بیان کرتا ہے:

(یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ)[2]

"(اے پیغمبر!) آپ سے یہ لوگ انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔

(یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ)[3]

"(اے پیغمبر!) یہ لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔

(یَسْتَفْتُونَکَ قُلِ اللهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلَالَةِ)[4]

"(اے پیغمبر!) یہ لوگ آپ سے فتویٰ دریافت کرتے ہیں تو آپ ان سے کہدیجئے کہ خداوند کلالہ (بھائی بہن) کے بارے میں حکم بیان کرتا ہے..."۔

پیغمبر اکرم کے بیانات میں بھی سوال و جواب کے طریقے کثرت سے پائے جاتے ہیں:

"آیا تم میں سب سے افضل شخصکے بارے میں خبر نہ دوں..."؟

"آیا خدا کے نزدیک بہترین اعمال کی خبر نہ دوں..."؟

"آیا تمہیں لوگوں میں سب سے بڑے انسان کی خبر نہ دوں..."؟

"آیا تمہیں ایسے لوگوں سے باخبر نہ کروں جو اخلاق میں مجھ سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں...؟

اخلاقی اقدار کی دعوت کے لئے کلی طور پر آیات و روایات، نصیحت آمیز اشعار اور بزرگوں کے کلمات سے استفادہ کہ جو "مقبولات عقلی" شمار ہوتے ہیں، دعوت کی تاثیر میں دوگنا اضافہ کردیتا ہے۔

اخلاقی اقدار کی طرف دعوت کی روش سے استفادہ "خود تربیتی" کی صورت میں یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو اس دعوت کے معرض میں قرار دیتے ہیں۔

۱۔ سورہ انسان، آیت ۱۔ ۲۔ سورہ انفال، آیت ۱۔ ۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۸۹۔ ٤۔ سورہ نسائ، آیت ۱۷٦۔

دوسری فصل:

اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

۱۔ عقلانی قوت کی تربیت

(اقدار اور موعظہ کی دعوت) گذشتہ روش کے برعکس کہ عام طور پر انسان کے عاطفی پہلو پر تاکید کرتی ہے، اس روش میں بنیادی تاکید انسان کے شناختی، معرفتی اور ادراکی پہلو پر ہے، جس طرح عاطفی محرّک رفتار کے اصول ومبادی میںشمار ہوتا ہے، فائدہ کا تصور وتصدیق بھی شناخت کیاصول نومبادی میں سے ہے کہ یہ روش اس کی ضرورت پوری کرنے کی ذمہ دار ہے۔

قرآن کریم اور معصومین علیہم السلام کے ارشادات وتعلیمات اس روش اور طریقے پرتاکید کرتے ہیں، اور اس کے حدود، موانع اور مقتضیات کو بیان کرتے ہیں۔

قرآن نے تعقل، تفقہ، تدبر، لبّ، حجر، نہیٰ، حکمت، علم و فہم جیسے الفاظ کا استعمال (ان ظریف تفاوت کے لحاظ سے بھی جو ان کے درمیان پائے جاتے ہیں) کا اس روش سے استفادہ کے لئے کیا ہے۔ قرآنی آیات مندرجہ باتوں کے ذریعہ اپنے مخاطبین کی معرفت اور عقشلانی قوت کی پرورش کرتی ہے:

استفہام تقریری یا تاکیدی کے ذریعہ سے [۱] گذشتہ افراد یا اکثریت کی اندھی تقلیداور پیروی کرنے کی ممانعت ہے، [۲] ان لوگوں کی مذمت جو تعقل نہیں رکھتے، [۳] ان لوگوں کی مذمت جو بغیر دلیل کے کسی چیز کو قبول کرلیتے ہیں، [٤] تعقل وتدبر کی دعوت، [۵] موازنہ اور تنظیر، [٦] احسن انتخاب پر ترغیب وبشارت [۷] وغیرہ۔

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ٤٤۔ سورہ قیامت، آیت ۲۔

۲۔ سورہ زخرف، آیت ۲۲۔۲۳۔۲٤ اور سورہ أنعام، آیت ۱۱٦۔

۳۔ سورہ أنفال، آیت ۲۲۔

٤۔ سورہ أنعام، آیت ۱۱٦۔ سورہ زخرف، آیت ۲۰۔

۵۔ سورہ یوسف، آیت ۱۰۵۔

٦۔ سورہ زمر، آیت ۹، سورہ رعد، آیت ۱٦ اور سورہ نحل، آیت ۷٦۔

۷۔ سورہ زمر، آیت ۱۸۔

روایات بالخصوص اصول کافی کی کتاب عقل وجہل اور دیگرروائی ماخذ میں بھی عقل وتعقل کو عظیم مرتبہ کا حامل قرار دیا گیاہے اور انسان کے اخلاقی تربیت سے متعلق خاص طور پر اس کے نقش وکردار کو موردتوجہ قراردیا گیا ہے۔ (۱)

علمائے اخلاق کی تربیتی روش میں بھی ان کی اصلاحی تدبیروں راہنمائیوں کا ایک قابل توجہ حصہ انسان کی شناختی پہلو سے متعلق ہے، جیسے انسان کے ذہنی تصورات کی ایجادیا تصحیح خود عمل یا اخلاقی صفت سے، اعمال کے دنیوی اور اخروی عواقب و نتائج کی ترسیم، اخلاقی امور کے بُرے یا اچھے لوازم اور ملزومات ان کے اخلاقی نظریہ میں بھی، غضب اور شہوت کی قوتوں پر عقلانی قوت کے غلبہ کو اخلاقی رذائل سے انسان کی نجات اور اخلاقی فضائل کی طرف حرکت کا سبب ہے، اس لئے کہ قوۂ عقل کے غلبہ سے تمام قوتوں کے درمیان اعتدال پیدا ہوتا ہے اور فضیلت کا معیار بھی اعتدال۔ تفکر وتعقل کے وہ موارد جو اخلاقی تربیت میں مؤثر ہوسکتے ہیں، آیات وروایات میں ان کا تعارف کرایا گیا ہے:

۱۔ طبیعت:

"زمین وآسمان میں کتنی زیادہ علامتیں اور نشانیاں ہیں کہ جن پر سے لوگ گذرتے ہیں اس حال میں کہ اُن سے روگرداں ہوتے ہیں"۔ (۲)

۲۔تاریخ:

حضرت علی فرماتے ہیں:

"حضرت اسماعیل کے فرزندوں، اسحاق کے فرزندوں اور یعقوب کے فرزندوں سے عبرت حاصل کرو، کس قدر ملتوں کے حالات آپس میں مشابہ اور ان کے افعال وصفات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن کے پراگندہ اور متفرق ہونے کے بارے میں غور کرو، جس وقت روم وفارس کے بادشاہ اُن کے ارباب بن گئے تھے (۳)... میرے بیٹے! یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے گذشتہ افراد کی عمر کے برابر زندگی نہیں پائی ہے، لیکن اُن کے کردار میں غور وفکر کیا ہے، ان کے اخبار کے بارے میں تفکر کیا ہے اور ان کے آثار میں سیر وسیاحت کی ہے کہ ان میں سے ایک کے مانند ہوگیا، بلکہ گویا جو کچھ ان کی تاریخ سے مجھ تک پہنچا ہے ان سب کے ساتھ میں اول سے آخر تک ہمراہ تھا"۔ (٤)

۱۔ اصول کافی، ج ۱، باب جنود عقل وجنود جہل۔ ۲۔ سورہ یوسف، آیت ۱۰۵۔ ۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ، ۱۹۲۔ ٤۔ نہج البلاغہ، مکتوب ۳۱۔

۳۔ قرآن:

"آیا قرآنی آیات میں غور وفکر نہیں کرتے؟ یا (یہ کہ) ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں"۔ [۱]

٤۔ انسان:

حضرت امام حسینؑ کی دعائے عرفہ کے پہلے فقرات سے اور توحید مفضل (بحار، ج۳) سے مفید اور کارآمد نکات معلوم ہوتے ہیں: اخلاقی قواعد کا اثبات اور تزکیہ باطن عام طور پر بغیر عقلانی قوت کی تربیت کے ممکن نہیں ہے، یہ روش خود سازی اور دوسروں کی تربیت سے وجود میں آسکتی ہے شناخت و معرفت کے ماہرین نفسیات بالخصوص "پیاژہ" اس روش کی بہت زیادہ تاکید کرتا ہے وہ اخلاقی نمونوں تک رسائی کو "قابل تعمیر" اور فعّال وخود سازی روش جانتا ہے نیز معتقد ہے کہ اخلاقی تحول و انقلاب شناخت کے رشد وتحول کے بغیر ممکن نہیں ہے؛یہاں پر ایک قسم کی عجیب وحیرت انگیز ہماہنگی، اخلاقی وعقلانی تربیت میں پائی جاتی ہے جیسے یوں ذکر کیا جاتا ہے کہ آیا جو کچھ تربیت خارج سے انسان کو دیتی ہے تاکہ اس کے اکتسابی یا فردی ادراک کو بے نیاز اور مکمل کرے، سادہ قواعد اور حاضر آمادہ معراف میں محدود منحصر ہوسکتا ہے؟ ایسی صورت میں آیا مراد یہ نہیں ہے کہ (صرف) کچھ تکالیف ایک طرح کی اور حس اطاعت انسان پر لازم کی جائے... یا یہ کہ اخلاقی تربیت سے استفادہ کا حق عقلی تربیت حق کے مانند یہ ہے کہ انسان حق رکھتا ہو کہ عقل واخلاق کو اپنے اندر واقعاً جگہ دے یا کم ازکم ان کے فراہم کرنے اور ان کی تعمیر میں شریک اور سہیم ہو، تاکہ اس مشارکت کے نتیجہ میں وہ تمام افراد جو ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں، ان کی تعمیر پر مجبور ہوجائیں۔ لہٰذا اخلاقی تربیت کی راہ میں، "خود رہبری" کا مسئلہ عقلی خود سازی کے مقابلہ میں ان افراد کے درمیان جو اس کی تلاش میں ہیں ذکر کیا جاتا ہے۔ [۲]

جو طریقے اس روش کے تحقق میں استعمال کئے جاسکتے ہیں درج ذیل ہیں:

الف۔ افکار کی عطا اور اصلاح:

اخلاقی اعمال فکر کی دو قسموں سے وجود میں آتے ہیں:

پہلی قسم:

انسان کا اپنی ھستی کے بارے میں آگاہ ہونا، دنیا، نظام عالم، مبدأ اور معاد کی نسبت وہ کلی یقین و معتقدات ہیں کہ انھیں خداشناسی اور فلسفہ حیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واضح ہے کہ انسان کی نگاہ اپنے اطراف کے عالم پر اُس کی اخلاقی رفتار پیمؤثر ہے۔ اعتقادات جیسے خدا کی قدرت کا احاطہ اور حضور عالم کا توحیدی انسجام یا نظام تقدیر، خدا پر توکل، تمام امور کا اس کے حوالہ کرنا، تسلیم ورضا وغیرہ سارے کے سارے ہمارے اخلاقی رفتار میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ (اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرآنَ اَمْ عَلیٰ قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا)(سورہ محمد، آیت ٢٤) ٢۔ پیاژہ: تربیت رہ بہ کجا می سپرد، ص۵۳۔

آج کل سلامتی کے ماہرین نفسیات اس نکتہ کی طرف توجہ رکھتے ہیں کہ خدا شناسی اور انسجام عالم کی حس کی نسبت، انسان کی مقاومت کے لئے ایک ایسا مرکز فراہم کرتی ہے کہ جو اخلاقی متانت کہ انسان کی سلامتی کے لئے عالم کو دبائو میں ڈالنے والے حوادث کے مقابل تاثیر گذار ہے۔

انسجام کی حس ایک مقابلہ کا مأخذ ہے، حس انسجام (دنیا کے نظم و ضبط میں تنظیم ویگانگی کا احساس کرنا) ایک قسم کی خداشناسی ہے کہ جس سے مراد مندرجہ امور کی نسبت دائمی اور مستمرّ اطمینان کے احساس ہے:

۱۔ ایسے محرک جو انسان کی پوری زندگی میں باطنی اور بیرونی ماحول سے پیدا ہوتے ہیں، تشکیل شدہ منظم، پیشین گوئی کے قابل اور قابل توجیہ ہیں۔

۲۔انسان ان ضرورتوں سے روبرو ہونے کے لئے کہ جن کو ان محرکات نے ایجاد کیا ہے، کچھ وسائل ماخذ رکھتا ہے؟

۳۔یہ ضرورتیں، ایسی کوششیں ہیں جو سرمایہ گذاری اور وقت صرف کے لائق ہیں۔ یہ لوگ دنیا کو قابل درک اور قابو میں کرنے کے لائق جانتے ہیں اور زندگی کے واقعات و حوادث کو بامعنی محسوس کرتے ہیں۔[۱]

دوسری قسم:

ایسے افکار ہیں کہ جو عمل کی اصلاح اور صحت سے متعلق ہیں اور یہ کہ یہ خاص رفتار عمل کرنے والے کے ہدف سے یگانگت رکھتی ہے۔اور حقیقت میں اطلاعات دینے کے ایک طریقہ سے مربوط ہے۔

البرٹ الیس شناخت سے متعلق ماہر نفسیات ہے کہ جو اپنی نجاتی روش کے سلسلہ میں عقلی اور عاطفی علاج سے استفادہ کرتا ہے اُس نے غیر عقلی تفکر کے نمونے پیش کرنے کے شاتھ اُس کا علاج جدید آمادگی اور جدید افکار و معتقدات کو اُن کا جاگزین کیا جانا ہے کبھی غیر اخلاقی رفتار یانا مطلوب صفات غلط نظریہ اور خیال کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ جو دھیرے دھیرے انسان کے فکری نمونے بن جاتے ہیں اورا یسے نظریوں کا تبدیل ہونا اخلاقی تربیت کے لئے ضروری ہے، غیر عقلی (غیر معقول) تفکر کے بعض نمونے ہر طرح کی اخلاقی رفتار کی تبدیلی سے مانع ہوسکتے ہیں، الیس ان موارد کو اس طرح بیان کرتا ہے:

۱۔انسان اس طرح فرض کرے کہ اُن افراد کی جانب سے جو اس سے متعلق اور اُس کے لئے اہم ہیں موردتائید، اور لائق محبت و احترام واقع ہو۔

۱۔ Psyhology Health/.p327

۲۔جب بھی انسان سے کوئی لغزش ہوجائے تو اس کے لئے صرف اتنا اہم ہے کہ وہ مقصّر کا سراغ لگائے اور اسے سزا دے۔
۳۔اگر مسائل اس کی مراد کے مطابق نہ ہوں تو اُس کے لئے حادثہ آمیز چیز ہوگی۔
٤۔سب سے زیادہ آسان یہ ہے کہ انسان مشکلات اور ذمہ داریوں سے فرار کرے، نہ کہ اُن کا سامنا کرے۔

ب۔ اخلاقی استدلال:

پیاژہ اور کلبرگ نے اس روش سے استفادہ کیا ہے اس طرح سے کہ داستانوں کو بچوں کے شناختی تحوّل و انقلاب کی میزان کے مطابق اس طرح بیان کرتے تھے کہ ان کے ضمن میں داستان کا ہیرو اخلاقی دوراہہ پر کھڑا ہے اور یہاں پر داستان کے مخاطب کو چاہیئے کہ جو استدلات وہ بیان کرتا ہے ان سے اپنی اخلاقی قضاوت کا استخراج کرے مربی جزئی دخالتوں سے اس اخلاقی بحران کی بحث چھیڑے (البتہ ان سے آگے قدم نہ بڑھائے یا کوئی استدلال پیش نہ کرے) اور صرف بالواسطہ ہدایت کرے اور ان کے استدلات کو صاف وشفاف کرے۔ یہ استدلات تربیت پانے والے کے ذہن میں نقش چھوڑتے ہیں اور اُسے انجانے طریقہ سے اس کی اخلاقی رفتار میں ہدایت کرتے ہیں۔

اخلاقی استدلال بلاواسطہ اور خود عمل پر بھی ناظر ہوسکتے ہیں؛ یعنی انسان کا روبرو ہونا اپنے اعمال کے نتائج کے ساتھ۔ علمائے اخلاق کی روش میں بھی اس طرح کے اقدامات پائے جاتے ہیں: عمل کے نتائج و آثار روش سے واضح انداز میں انسان کے لئے مجسّم ہوتے ہیں اور مخاطب کو یقین حاصل ہوتا ہے کہ یہ عمل اس طرح کے نتائج وآثار کا حامل ہے، درحقیقت ہم اس کے لئے موقعیت کی توصیف کرتے ہیں (بغیر اس کے کہ اُس میں امر و نہی درکار ہو) اور یہ خود انسان ہے کہ جو ان نتائج کو درک کرکے انتخاب کرتا ہے اور اس کے عمل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے قرآنی آیات کبھی عمل کے ملکوتی کو مجسّم کرکے اس روش اور اسلوب سے استفادہ کرتی ہیں:

"اے صاحبان ایمان !... تم میں سے بعض بعض کی غیبت نہ کرے آیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یقیناً اُسے ناپسند کروگے (لہٰذا) بے شک خدا سے ڈرو کہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے"۔[۱]

۱۔ سورہ حجرات، آیت ۱۲۔

کبھی اعمال کے دنیوی یا اخروی نتائج کی منظر کشی کرکے افراد کو ان کے عواقب سے آشنا کرتا ہے:

"ایک دوسرے سے مجرموں کے بارے میں سوال کریں گے: "کس چیز نے تمہیں سقر (کی آگ) میں جھونک دیا ہے؟" وہ کہیں گے: "ہم نمازگذاروں میں سے نہیں تھے، اور مسکینوں اور بے نوائوں کو ہم کھانا نہیں دیتے تھے..."[۱]

ج۔ مطالعہ اور اطلاعات کی تصحیح:

مطالعہ لغت میںان معانی میں استعمال ہوتا ہے: کسی چیز کے معلوم کرنے کے لئے اُس کو دیکھنا، کسی کتاب یا کسی نوشتہ کا پڑھنا اور اس کا سمجھنا.......۔

آخری سالوں میں اطلاعات فراہم کرنے والوں کے اقدام نے بہت سے ماہرین نفسیات کی توجہ اپنی طرف جلب کرلی ہے[۲] کیونکہ جو اطلاعات انسان کے ذہنی سسٹم میں وارد ہوتی ہیں، وہ انسانی رفتار کو جہت دینے میں ایک اہم اور قابل تعیین کردار ادا کرتی ہیں۔ البتہ اطلاع کی فراہمی کا انداز بھی اہم ہوتا ہے کہ افکار کی عطا کی بحث میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ بِک [Beck] منجملہ ان کے ماہرین نفسیات میں سے ہے کہ جو اسی طریقۂ عمل سے افسردگی کی بیماریوں کا علاج کرتا ہے۔ اخلاقی بیماریوں کا علاج کرنے یا کلی طور پر صحیح اخلاقی تربیت یا فضائل اخلاقی کی راہ پیدا کرنے میں اسی طرز واسلوب سے مدد لے سکتے ہیں، یعنی اخلاقی مشکلات کے سلسلہ میں علم اخلاق کی مناسب کتابوں کا مطالعہ اور جدید اطلاعات کے حصول سے انسان اپنے عمل کے اسباب وعوامل کو پہچان لیتا ہے اور اس میں تبدیلی یا اصلاح انجام دیتا ہے اور بالواسطہ طور پر اخلاقی تربیت کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی اس کی سابق اطلاعات سے متعارض اطلاعات اُسے غور وفکر اور فیصلہ کرنے نیز تجدید نظر کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

د۔ مشورت ومشاورہ:

اس سے مراد مربی اور تربیت دیئے جانے والے یا والدین اور فرزندوں کے درمیان ایک طرح کا معاملاتی رابطہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مدد اور حمایت سے مسئلہ کا تجزیہ و تحلیل کریں اور اخلاقی مسائل میں ایک مشترک راہ حل تک رسائی حاصل کریں۔ یہ طرز تربیت پانے والی شخصیت کے احترام واکرام

۱۔ سورہ مُدثر، آیت ۴۰ تا ۴۴۔

۲۔ روان شناسی رشد بانگرش بہ منابع اسلامی، ج۲، ص۶۲۶۔

کے علاوہ اخلاقی تربیت کے اعتبار سے رشد عقلی کا باعث ہوتا ہے:

"مَنْ شَاوَرَ ذَوِی الْعُقُوْل اسْتَضَاء بانوار العقول "[۱]

"جو انسان صاحبان عقل وہوش سے مشورہ کرے، وہ ان کے نور عقل وخرد سے استفادہ کرتا ہے"۔

اسلامی روایات، مشورہ کو رشد وہدایت کا ذریعہ سمجھتی ہیں اور شایستہ افراد سے مشورہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ تاکید کرتی ہیں:

"دوسروں سے مشورہ کرنا ہدایت کا چشمہ ہے اور جو کوئی خود کو دوسروں کے مشورہ سے بے نیاز تصور کرے تو اُس نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا ہے"۔[۲]

اس روش میں تربیت پانے والے کا مقصد عقلانی توانائی کا حصول اور اخلاقی مسائل میں فیصلہ کرنا ہے، یعنی مشورت کے ذریعہ اسے آمادہ کریں کہ "خود رہبری" اور "فعّال" کی روش کو ہدایت کے سالکین کو اخلاقی تربیت کی راہ میں لے آئے اور اپنی اخلاقی مشکل کو حل کر سکے، مشورہ میں پہلا قدم مراجع (تربیت دیا جانے والا) نہیں اٹھاتا؛ بلکہ مربی کو اس سے نزدیک ہونا چاہئے اور رابطہ ایجاد کرکے یا کبھی مسائل میں اُس سے راہ حل طلب کرکے، اُسے اپنے آپ سے مشورت سے کرنے کی تشویق کرنی چاہئے۔[۳]

۲-۔ عبرت حاصل کرنے کے طریقے

کلمہ "عبر" ایک حال سے دوسرے حال میں گذرنے اور عبور کرنے کو کہتے ہیں اوراعتبار (عبرت آموزی) ایک ایسی حالت ہے کہ مشہور چیز دیکھنے اورجو کچھ اس کے نزدیک حاضر ہونے سے ایک نامشہود پیغام تک رسائی حاصل کرلیں لہٰذا اس روش سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اندر امور وحوادث کے دقیق مشاہدہ اور اس میں غور وخوض کرنے سے باطنی تبدیلی حاصل ہوجاتی ہے کہ اس انفعال نفسانی کی حالت کے نتیجہ میں، اُس حادثہ کی گہرائی میں موجود پیغام کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے، عینی مشاہدہ وہ بھی نزدیک سے انسان میں ایسا اثر کرتا ہے کہ سننا اوردوسروں کا بیان کرنا اتنا اثر نہیں رکھتا۔

۱۔ غرر الحکم ودرر الکلم ج۵ ص۳۳۶ ش ۸۶۳٤۔

۲۔ الاستشارۃ عین الھدایۃ وقد خاطر من استغنی برایہ نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۹ ص ۳۱۔

۳۔ اسلامی تعلیمات مختلف جہات سے مشورت کے مسئلہ پر تاکید کرتی ہیں؛ مزید معلومات کے لئے سید مہدی حسینی کی کتاب "مشاورہ وراہنمائی در تعلیم وتربیت " ملاحظہ ہو۔

اس کی دلیل پہلے مشاہدات کا زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہونا ہے؛ سنی سنائی چیزوں کے بر عکس کہ اُس میں عام طور پر شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔ برہان عقلی میں یقینیات میں سے ایک مشاہدات یا محسوسات ہیں۔ دوسرے حادثہ کی جانب اس کے جزئیات سمیت توجہ دینا، کے شناختی وعاطفی قالب اورڈھانچوں کے مطابق دیکھنے والے اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ وہ واقعہ بہتر جا گزیں ہو اور انسان کے نفسیاتی قالب میں جگہ پائے۔ البتہ کبھی تاریخی یاداستانی بیانات .بیان کرنے والے کی ہنر نمائی کے زیر اثر اس درجہ دقیق ہوتے ہیں کہ گویا سننے والا یاپڑھنے والاخود اس حادثہ کے اندر اپنے موجود محسوس کرتاہے ۔ نمائشی ہنر میں جیسے فیلم وغیرہ میں اس طرح کا امکان پایاجاتا ہے۔ قرآن وروایات میں عبرت آموزی کا طریقہ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے، عبرت آموزی کے طریقے درج ذیل ہیں:

الف۔گذشتگان کے آثار کا مشاہدہ:

تاریخ کے صفحات ایسے لوگوں کے وجود سے بھرے پڑے ہیں جنھوں نے خطا کے بار کو کاندھے پر اٹھایا اور غیر صحیح راہ پر گامزن ہوگئے ہیں، گذشتگان کے باقی ماندہ آثار میں غور وفکر کرنے سے ہمیں تعلیم کرناپڑتا ہے کہ ہر گناہ وخطا سے کنارہ کشی کے لئے لازم نہیں ہے کہ خود تجربہ کریں اور اس کی سزا اور انجام دیکھیں۔ تاریخی عمارتیں، میوزیم، کھنڈر، دفینے وغیرہ ان انسانوں کی علامتیں ہیں جنھوں نے انھیں وجود بخشا ہے۔ قرآن ہمیں ان کی جانب سیر وسفر اور گذشگان سے تجربہ حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے: "آیا ان لوگوں نے زمین میں گردش نہیں کی ہے تاکہ اپنے پہلے والوں کے انجام کا مشاہدہ کریں کہ وہ کس طرح تھا؟ وہ لوگ ان سے زیادہ قوی تھے اور انھوں نے روئے زمین پر زیادہ ثابت اور پائدار آثار چھوڑے ہیں، خدا نے انھیں ان کے گناہوں کے عذاب میں گرفتار کردیا اورخدا کے مقابل ان کا کوئی بچانے والا نہیں تھا"۔ [۱] عمار ساباطی نقل کرتے ہیں: حضرت امیر المومنین علی۔ مدائن آئے اور ایوان کسریٰ میں نازل ہوئے اور "دلف بن بحیر" ان کے ہمراہ تھا، آپ نے وہاں نماز پڑھی اور اٹھ گئے.... حضرت کی کے خدمت میں ساباطیوں کا ایک گروہ تھا، آپ نے منازل کسریٰ میں چکر لگایا اور دلف سے فرمایا: "کسریٰ اس جگہ مقام ومنزلت کا حامل تھا"دلف نے کہا: خدا کی قسم ایسا ہی ہے جیسا آپ فرمارہے ہیں۔

---

۱ ۔ سورہ مٔومن آیت ۲۱۔

پھر اس گروہ کے ہمراہ اُن تمام جگہوں پر گئے اور دلف کہہ رہے تھے: "اے میرے سید وسردار آپ اس جگہ کے بارے میں اس طرح آگاہ ہیں گویا آپ ہی نے ان چیزوں کو یہاں رکھا ہے۔ جب حضرت مدائن کی طرف سے گذرے اور کسریٰ اور اس کی تباہی کے آثار مشاہدہ کئے تو حضرت کی خدمت میں موجود افراد میں سے ایک نے یہ شعر پڑھا:

جرت الریاح علی رسوم دیارہم

فكأنهم كانوا على ميعاد

ان کے گھروں کے مٹے ہوئے نشانات پر ہوائیں چل رہی ہیں گویا وہ اپنی وعدہ گاہ پر ہیں۔

حضرت نے فرمایا: تم نے یہ آیات کیوں نہیں پڑھیں؟

واہ! انھوں نے کیسے کیسے باغات اور بہتے چشمے چھوڑے ہیں، کھیتیاں اور عمدہ مکانات چھوڑ گئے ہیں اور وہ نعمتوں میں مزے اڑا رہے ہیں، (ہاں) ایسا ہی تھا اور ہم نے دیگر لوگوں کو ان کی میراث دے دی پھر تو ان پر آسمان وزمین نے گریہ وزاری نہیں کی اور نہ انھیں مہلت دی گئی۔[۱]

اس کے بعد حضرت نے فرمایا: یہ لوگ گذشتگان کے وارث تھے، پس وہ خود بھی آئندہ والوں کے لئے میراث چھوڑ کر گئے، انھوں نے نعمت کا شکر ادا نہیں کیا لہٰذا ناشکری کے زیر اثر اُن سے ساری نعمتیں سلب ہوگئیں، نعمات کی ناشکری سے پرہیز کرو کہ تم پر بلائیں نازل ہوجائیں گی....۔[۲]

نہج البلاغہ میں اس نکتہ کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے:

"تمہارے لئے گذشتہ امتوں کی سرنوشت میں عبرتیں ہیں، عمالقہ اور ان کی اولاد کہاں ہیں؟ فراعنہ اور ان کے اخلاف کہاں ہیں؟ اصحاب رس جنھوں نے پیغمبروں کو قتل کیا ہے کی سنتوں کو پامال کیا ہے اور جبّاروں کی رسومات کو باقی رکھا، کہاں ہیں؟ ۔"[۳]

خداوند متعال فرماتا ہے: "پھر آج تم]فرعون[کو تمھارے بدن کے ساتھ بچالیتے ہیں تاکہ ان کے لوگوں کے لئے جو تمہارے بعد آئیں گے، عبرت ہو۔[٤]

۱۔ سورہ دُخان آیات ۲۵، ۲۹۔ ۲۔ بحارالانوار ج۷۸ص ۹۲۔

۳۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۲۔ ٤۔ (فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیة)(سورہ یُونس آیت ۹۲)۔

قبروں کی زیارت اور ان لوگوں کے حالات کے بارے میں غور وفکر جو روئے زمین پر سرکشی اور تکبر کرتے تھے اور آج بغیر حرکت کے اورانتہائی ذلت وخواری کے ساتھ خاک میں دفن ہیں، انسان کو خاضع بلکہ ا سے فرمانبردار بنا دیتا ہے، کبرو نخوت کو فروتنی وخاکساری سے تبدیل کردیتا ہے اورآدمی کو یہ فرصت دیتا ہے کہ خود کو درک کرے اور اپنی عاقبت کے بارے میں غور کرے۔

حضرت علی نے آیہ شریفہ: "کثرت مال واولاد کے باہمی مقابلہ (یا اس پر تفاخر) نے تمہیں غافل بنادیا ہےیہاں تک کہ تم نے قبروں سے ملاقات کرلی" [1] کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"آیا اپنے آباء واجداد کے مقام نزول پر افتخار کرتے ہیں؟ یہ لوگ فخر وافتخار سے زیادہ عبرت کے سزاوارہیں اگرچہ اُن کے آثار بینانہیں ہیں اور ان کی زندگی کی داستان ختم ہوچکی ہے، لیکن عبرت آموزنگاہیں ان کی طرف دیکھ رہی ہیں اور عقلمندوں کے گوش شنواآوازوں کودرک کرتے ہیںاور بے زبانی سے ہم سے گفتگو کرتے ہیں...۔ [2]

مربی حضرات معمولی توجہ اور بصیرت و عبرت آموزی کی دعوت سے، ان تفریح گاہوں سے جو تاریخی جگہوں پر برپا ہوتی ہیں، اخلاقی اور تربیتی ضرورت کا استفادہ کرسکتے ہیں، گروہی یا فردی مسافرت وسعت نظر اوردل ایجاد کرنے کے علاوہ بہت زیادہ مفید اور عبرت آمیز ہے۔

ب۔ طبیعت اور موجودات کی طرف نظر:

زمین میں سیر وسیاحت کرنے سے انسان کو عجائب خلقت سے بہرہ مند ہوتا ہے "اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے! زمین میں گردش کرو پھر موجودات کی وجہ تخلیق کے بارے میں غورو فکر کرو۔" قرآن کریم نے موجودات طبیعت سے عبرت حاصل کرنے کو مورد توجہ قراردیاہے:

"چوپائوں کے وجود میں تمہارے لئے عبرت کے (اسباق) ہیںکہ ان کے شکم اندر سے گوبر اور خون کے درمیان سے تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیںجو پینے والوں کے لئے انتہائی خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور کھجور اورانگور کے پھلوں سے اچھی اور پاکیزہ روزی حاصل کرتے ہو، صاحبان عقل وہوش کے لئے اس میں واضح نشانیاں ہے"۔ [3]

۱۔ سورہ تکاثر آیت ۱، ۲۔

۲۔ بحار الانوار ج ۷۷ ص ۴۳۰و ۴۳۲۔

۳۔ سورہ، نحل آیت ۶۶تا ۶۷۔

"خدا شب وروز کو دگرگوں کرتا ہے، اس میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک عبرت ہے"۔(۱)

عالم کی حیرت انگیز چیزیں، انسان کو خاضع اور خاشع بناتی ہیں، بہت سی گندگیوں کا سرچشمہ اور اخلاقی پستیوں کا منبع "خود خواہی" (۲) اور خود بینی وتکبر ہے ، اس وجہ سے اخلاقی تربیت کے اہداف میں "خود خواہی" سے دوری اختیار کرنا ہے، پیاژہ کے بقول: "... اخلاقی تربیت کے دو بنیادی مسئلے یہ ہیں: "انضباط کا برقرار کرنا" اور "خود پسندی سے نکلنا" (۳) عالم کی عظمت کی اور اس کے عجائب کی طرف ، انسان کو خودی سے باہر نکالتے ہیں اور مکارم اخلاق کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

ج ۔ موجودہ حوادث اور واقعات کی جانب توجہ:

ہم اپنے زمانے میں زندگی گزارتے ہیں اور قبل اس کے کہ تاریخ کے سینہ میں حوادث اور واقعات دفن ہوجائیں ہم اُن سے عبرت حاصل کرسکتے ہیں حضرت امیر المومنین علی۔ فرماتے ہیں: "میں اپنے قول کا خود ذمہ دار اور اس کی صحت کا ضامن ہوں، جو شخص بھی زمانے کے ناگوار حوادث سے عبرت حاصل کرے، شبہات میں مبتلا ہونے کے وقت تقویٰ اس کی حفاظت کرے گا"۔(٤)

اپنے بارے میں ایک سرسری نظر اوران مختلف واقعات کا نظارہ کہ کبھی ہم زمان ہونے کا حجاب ہمیں اُس سے غافل کردیتا ہے، شخصیتوں کی پستی وبلندی اور ان کی ظاہری عزت وذلت کا گردش زمانہ میں ہمیں پتہ دیتا ہے، عمل کی جزائیں اورپوشیدہ حکمتیں راہ حوادث کے پس پردہ انتہائی نصیحت آموز ہیں اور یہ عینی تجربے عبرت کے قیمتی ذخیروں میں سے ہیں۔

د۔ گذشتگان کے قصوں میں غور و فکر:

گذشتہ افراد کی داستان زندگی بھی ہمارے لئے عبرت آموز ہوسکتی ہے۔یہاں پر عبرت حاصل کرنے والا گذشتہ افراد کے آثار کے واقعی میدانوں اور وقت حاضر نہیں ہوتا، لیکن داستان اور اس کے نشیب وفراز میں غور وفکر کے ساتھ ، اس کی خالی فضا میں پرواز کرتا ہے کہ اس کا عبرت آمیز رخ عینی مقامات سے کمتر ہے لیکن اس سے نزدیک ہے۔

۱۔ سورۂ نور آیت ٤٤۔ ۲۔ من رضی عن نفسه ظهرت علیه المعایب، ما اضرّالمحاسن کا لعجب (غرر الحکم) فصل ٦، ص۳۰۸)۔

۳۔ تربیت رہ بہ کجا می سپرد، ص۹۳۔ ٤۔ نہج البلاغہ خطبہ ١٦۔

قرآن حضرت یوسف کی داستان نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ان کی داستانوں میں صاحبان عقل کے لئے درس عبرت ہے"۔(۱)
یا غزوہ نضیر کے واقعات نقل کرنے کے بعد فرماتا ہے: "پس اے صاحبان بصیرت عبرت حاصل کرو"۔(۲)
ایک دوسرے جگہ پر جنگ بدر کے اہم واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمیں عبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے: "یقیناً اس ماجرہ میں صاحبان بصیرت کے لئے ایک عبرت ہے"۔(۳)

قرآنی آیات اور روایات کے طرز تربیت میں جو کہ عبرت آموزی کی تاکید کرتی ہیں، دو نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔ عبرت حاصل کرنا ایک (٤) دور اندیش عقل (٥) اور بیدار دل (٦) رکھنے کا مستلزم ہے۔

اسی لئے یہ روش عقلانی قوت کی روش کی پرورش کے بعد ذکر ہوئی ہے، یعنی عام طور پر عقلانی عمیق نظر کے بغیر عبرت آموزی ممکن نہیں ہے۔ اسی لئیحضرت امیر المومنین علی نے مکرر فرمایا ہے: "عبرتیں کتنی زیادہ ہیں اور عبرت حاصل کرنے والے کتنے کم ہیں"۔(۷)

۲۔ دوسرے یہ کہ آیات وروایات کی روشنی میں عبرت کے لئے ان صفات کا ہونا ضروری ہے:
عصمت وپاکدامنی، دنیا سے کنارہ کشی، لغزش وخطا کی کمی ، اپنی معرفت ، طمع وآرزو کا کم ہونا، فہم ودرک اور تقویٰ۔(۸)

۱۔ سورہ یوسف آیت ۱۱۱۔

۲۔ سورہ حشر آیت ۲۔

۳۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۳۔

٤۔(ان فی ذلک لعبرة لاولی الابصار)سورہ آل عمران، آیت ۱۳۔

٥۔ (لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الالباب)سورہ یوسفآیت ۱۱۱۔

٦۔(ان فی ذلک لعبرة لمن یخشی) سورہ نازعات، آیت ۲٦۔

۷۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۹۷۔

۸۔ میزان الحکمۃ ج٦ص۳۸تا ۳۹۔

۳۔ عمل کی پابندی اور مداومت

یہاں تک ان طریقوں کی بحث تھی جو اخلاقی (عاطفی یا شناختی رفتار کے مبادی پر اثر انداز ہوتی ہیں یا وہ روشیں جو ماحول کے عوامل میں موثرثابت ہوتی ہیں۔ پیاژہ نفسیاتی عوامل کے تحول کے شمار میں رشد داخلی کے علاوہ اجتماعی تعامل وتعویض اور اکتسابی تعادل جوئی، تمرین ومشق اور اکتسابی تجربہ کو ایک مستقل عامل جانتا ہے۔[۱]

اخلاقی تربیت میں ہدف یہ ہے کہ تربیت پانے والا اخلاقی رفتار کے کمال تک پہنچ جائے یعنی عمل کرے۔ جتنا اس عملی تجربہ کی تکرار ہوگی اور اس کی مداومت کی جائے گی"ظاہر سازی "[۲]کی صورت میں جدید نفسیانی شکلیں تشکیل پاجائیں گی، بعینہ جیسے اخلاق کی اصطلاح میں جنھیں ملکات اخلاقی کہتے ہیں۔

قرآن کریم عمل کو خاص اہمیت دیتا ہے: "انسان کے لئے اس کی کوشش اور تلاش کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس کی کوشش]کانتیجہ [عنقریب دکھائی دے گا"۔[۳]

بہت سی آیات میں قرآن ایمان کو کافی نہیں جانتابلکہ عمل کو اس کی تکمیل کے لئے لازم وضروری شمار کرتا ہے:

جو لوگ نیک عمل کرتے ہیںخواہ مرد ہوں یا عورت، جبکہ مومن ہوں، وہ لوگ جنت میں داخل ہوجائیں گے اور خرمے کی گٹھلی کے گڑھے کے برابر بھی ان پر ستم نہیں ہوگا"۔[٤]

شایستہ کاموں (عمل صالح) سے مراد غالباً وہی اخلاقی اعمال ہیں۔ افراد کے درجات ومراتب بھی ان کے اعمال کے اعتبار سے ہیں، یعنی افرادکی درجہ بندی کا ایک معیار ان کا عمل ہے۔

"ان میں سے ہر ایک کے لئے جو عمل انھوں نے انجام دیا ہے، اس کے مطابق مرتبے ہیں اور تمہا را رب وہ جو کچھ کرتے ہیں اس سے غافل نہیں ہے"۔[۵]

۱۔ دیدگاہ پیاژہ ص ۳۵تا۳۷۔

۲۔ وہ فعالیت جو آدمی کے پہلے والے نفسیاتی تار وپود کو کو تبدیل کرتی ہے تاکہ وہ خود کو اس ماحول کے حالات کے موافق بنائے جس میں وہ موجود ہے۔ (روانشناسی ژنتک، ص۲٤٤)۔۳۔ سورہ ٔنجم آیت ۳۹، ٤٠۔٤۔ (مَنْ یَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثیٰ وَھُوَ مُؤمِن فَاُوْلٰئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَایُظْلَمُوْنَ نَقِیْراً)(سورہ ٔنسائ، آیت ١٢٤)۔

۵۔ (لِکُلٍّ دَرَجَات مِمَّا عَمِلُوا، وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ۔)(سورہ أنعام، آیت ١٣٢)۔

روایات بھی عمل کی ترغیب وتشویق کے ساتھ اسے ایک فائق مرتبہ دیتی ہیں:

حضرت علی: "آج عمل کا دن ہے اور کوئی محاسبہ نہیں ہے، اور کل محاسبہ کا وقت ہے اور عمل کی گنجائش نہیں ہے"۔[١]

حضرت امام محمد باقر۔ فرماتے ہیں: "کوئی بھی شخص جو کچھ خدا کے نزدیک اُس کے لئے فراہم ہوا ہے اسے نہیں پاسکتا مگر عمل کے ذریعہ "[٢] حضرت علی فرماتے ہیں: "انسان کی ہمراہی عمل کے سوا کوئی بھی نہیں کرے گا"۔[٣]

عمل کے استمرار اور اس کی مداومت کے بارے میں درج ذیل آیات و روایات کو بعنوان شاہد پیش کیا جاسکتا ہے:

"اگروہ لوگ راہ راست میں ثبات قدمی اور پائداری کا مظاہرہ کریں تو یقیناً انھیں خوشگوار پانی نوش کرائیں گے"۔[٤]

حضرت علی۔: " وہ کم اعمال جس کی پابندی اور مداومت کرو، ایسے زیادہ اعمال سے زیادہ امید بخش ہیں کہ جن سے تھک جاتے ہو۔"[٥]امام محمد باقر: "خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ عمل ہے جس پر مداومت اور پابندی ہو، اگرچہ کم ہی ہو"۔[٦]

سلوکی مکتب کے ماہرین نفسیات پاولف، ثراندایک اور اسکینر میں سے ہر ایک حصول تعلیم کے متعلق عمل کی مشق اور تکرار کے بارے میں ایک نظر رکھتے ہیں، ثراندایک اپنے قانون تمرین[٧] میں کہتا ہے: "محرک اور جواب کے درمیان پیوند اور ارتباط استفادہ کے زیر اثر قوی ہوجاتے ہیں"[٨]

١۔ "الیوم عمل ولا حساب وغداً حساب ولا عمل "۔(نہج البلاغہ، خ٤٢)۔

٢۔ "لا ینال ما عند الله الّا بالعمل"(وسائل الشیعہ ج١ص ٦٩)۔

٣۔ "المرء لایصبحه الّا العمل"(غرر الحکم، فصل٤، ص١٥١)۔

٤۔ (وَاَنْ لَواسْتَقَامُوا عَلَی الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنَاهم مَاءً غَدَقاً)(سورہ جن، آیت١٦)۔

٥۔ "قلیل تدوم علیه ارجی من کثیر مملول منه۔"(شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج١٩، ص١٦٩)۔

٦۔ "احب الاعمال الی الله عزوجل مادام العبد علیه وان قلّ"(وسائل الشیعہ ج١ ص٧٠)۔

٧۔ ہرگنہان نظریہ ھای یادگیری، ترجمہ یوسف،٢٧٥۔

٨۔ ہرگنہان نظریہ ھای یادگیری، ترجمہ یوسف، ص٧٨۔

گاتری ایک دوسرا سلوکی ماہر نفسیات ہے جو اپنے تعلیم وتربیت کے نظریہ میں اس سلسلہ میں کہ کیوں مشق نتیجۂ عمل کو بہتر بناتی ہے لکھتا ہے:.. کسی عمل کا سیکھنا یقیناً مشق کا محتاج ہے، ہماری نظر میں اس امر کی دلیل یہ ہے کہ عمل ایسا نتیجہ دیتا ہے کہ جو مختلف موقعیت کے تحت اور مختلف حرکتوں کے ذریعہ کہ جو ان موقعیتوں سے مناسبت رکھتی ہیں حاصل ہوتا ہے، ایک عمل کا سیکھنا ایک حرکت کے (جیسے جسم کے کسی حصہ کا عام طور سے سکڑنل جو کہ تداعی سے حاصل ہوتا ہے) سیکھنے کے برعکس یقیناتمرین ومشق کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ ضروری ہے کہ مقتضی حرکتیں اپنی نشانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کو وجود بخشیں۔ حتی کہ ایسا سادہ عمل جیسے کہ ایک کھلونا ، فاصلہ جہت اور کسی چیز کی موقعیت کی بنیاد پر مختلف حرکتوں کو شامل ہوتا ہے۔ ایک کامیاب تجربہ اس بات کے لئے کہ بچوں کو کسی عمل کے لئے آمادہ کرے، کافی نہیں ہے، کیونکہ جو حرکت ایک حالت میں حاصل ہوتی ہے ممکن ہے کہ دوسری بار کامیاب نہ ہو"۔[۱]

پھر مہارت اور تشکیل عادت کے بارے میں کہتا ہے:

دلیل اس بات کی کہ کامل مہارت حاصل کرنے کے لئے کیوں زیادہ مشق اور تکرار کی ضرورت ہے؟ یہ ہے کہ یہ مہارتیں محتاج ہیں کہ زیادہ اور خاص حرکتیں بہت سی محرکانہ موقعیتوں کے ساتھ جڑی ہوں، ایک مہارت، ایک عام عادت نہیں ہے، بلکہ عادتوں کا ایک عظیم مجموعہ ہے کہ جو مختلف موقعیتوں میں ایک معین نتیجہ دیتا ہے... خلاصہ یہ کہ ایک مہارت کثرت عمل سے تشکیل پاتی ہے[۲] تھوڑا سا غور کہا جاسکتا ہے کہ اخلاقی ملکات اور فضائل بھی اس نظریہ میں مہارتوں سے مانند وجود میں آتے ہیں اور انسان میں ثبات پاتے ہیں، اس وجہ سے اگرچہ صرف مکتب سلوکیت کا نظریہ (تعلیم وتعلم میں شناختی یا عاطفی کے عوامل کی جانب توجہ نہ ہونا) ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہے[۳] لیکن کسی عمل کی مشق کا اثر ایک اساسی عامل کے عنوان سے قابل انکار نہیں ہے۔ ارسطو" اخلاق" نامی کتاب میں کہتا ہے: "جس طرح ہم گھر بنا کے معمار ہوجاتے ہیں، عادلانہ عمل انجام دینے سے عادل ہوجاتے ہیں اور پرہیزگاری کا عمل انجام دے کر پرہیزگار بن جاتے ہیں اور کوئی بہادری کا کام کرنے سے بہادر ہوجاتے ہیں"[٤] اور یہ بالکل اسی دقیق طور پر مداومت عمل کی روش کو بیان کرتا ہے۔

۱۔ ہرگنہان نظریہ ھای یادگیری، ترجمہ یوسف ، ص۲۷۵و۲۷٦۔ ۲۔ ایضاً، ص۲۷۷۔ ۳۔ مکاتب روانشناسی ونقد آن ج٦ص ١٤١۔ ٤۔ ارسطو، اخلاق نیکوماخس، ترجمہ ابو القاسم حسینی، ج١، ص۳۷۔

اخلاقی کتابوں کے مؤلفین بھی عملی روش پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں اور اخلاقی بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں نظری روش ساتھ یا اس عمل پہلو پر بڑی تاکید کرتے ہیں کہ جس سے مقصود اخلاقی فضائل کے مطابق افعال انجام دینے کا اہتمام وتمرین ہے ایسے اعمال میں مشغول ہونا ہے جو اخلاقی رذائل کے خلاف ہیں ۔

ملا محمد مہدی نراقیاخلاقی بیماریوں کے طریقہ علاج کے بارے میں فرماتے ہیں:

"انحراف اورکج روی (عدم اعتدال)کی علت اگر جسمانی بیماری ہو تو اس کے برطرف کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جلد سے جلد طبی علاج کریں، اور اگر اس کی علت نفسانی ہو تو اس کا علاج وہی بالکل جسمانی علاج کی طرح ہے، جسمانی علاج میں سب سے پہلے ایسی غذا سے جو بیماری کی ضد ہو علاج کرتے ہیں، مثال کے طور پر سردمزاج بیماری کا علاج گرم مزاج اور تند غذائوں سے کرتے ہیں، اگر فائدہ نہ ہوا تو پھر دوا سے ، اس کے بعد زہر مار کے ذریعہ آخر میں عضو کو جلاکے یاکاٹ کے (جراحی) کے ذریعہ معالجہ کرتے ہیں۔ نفسانی بیماریوں میں بھی قانون ایسا ہی ہے، اس طرح سے کہ انحراف اور کجروی کو جاننے کے بعد اس اخلاقی فضیلت کو حاصل کرنے لئے کہ جو اس انحراف کی ضد ہے، اقدام کرے اور ان افعال سے جو اس فضیلت کے آثار شمار ہوتے ہیں یہ امر غذا کے مانند اس اخلاقی رذیلت کو زائل کرنے میں اثر کرتا ہے۔ پھر اگر مفید واقع نہ ہوتو پھر مختلف صورتوں میں فکری، زبانی اور عملی طور پر اپنے نفس کو موردتوبیخ وسرزنش قرار دے، پھر اگر وہ بھی موثر نہ ہو تو پھر ایک منفی اور متضاد صفت کے آثار کو کہ جو اس اخلاقی صفت سے تضاد رکھتے ہوں حدّاعتدال میں انجام دے گا، جیسے ڈرپوک انسان دلیرانہ عمل انجام دے اورخود کو خطرناک کام میں ڈال دے اور کنجوس انسان اس صفت کے زوال کے لئے جود و بخشش کا سہارا لے ۔ یہ مرحلہ جسمانی مداوا میں تریاق اور زہرمار دوا کے مانند ہے۔ اگر اس مرحلہ تک بھی اخلاقی بیماری مستحکم طور پر برطرف نہ ہوئی، تو پھر خود کو طرح طرح کی ان سخت تکلیفوں اور ریاضتوں کے ساتھ رنج وزحمت میں بتلا کرے جو اس اخلاقی رذیلت کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کا باعث ہوں، یہ مرحلہ جسمانی علاج میں عضو کے جلانے اور قطع کرنے کے مشابہ ہے کہ جو آخری مرحلہ ہے"۔[1]

۱۔ جامع السعادات ج ۱ ص۹۷، ۹۸۔

جیساکہ معلوم ہے کہ اخلاقی تربیت کے سلسلہ میں علمائے اخلاق نے عمل اور مشق پر خاص طور سے توجہ دی ہے، اس وجہ سے اس روش کے تحقق کے لئے درج ذیل طریقوں کو بیان کیا جاسکتا ہے:

الف ۔ مشق اور عادت ڈالنا:

ہم یہاں پر "عادت" کے متعلق اخلاقی فلسفہ کے لحاظ سے بحث نہیں کرنا چاہتے جیسے یہ بحث کہ آیا اخلاقی فعل عادت کی حاکمیت اور اس کے غلبہ کے ساتھ اخلاقی ہونے سے خارج ہوجاتا ہے یا نہیں ؟[۱] اور نہ نفس شناسی کے لحاظ سے بحث کرنا چاہتے ہیں مثال کے طور پر عادت کیا ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں اور کس طرح وجود میں آتی ہے؟[۲] بلکہ اس سے یہاں پر مراد یہ ہے کہ مشق اور تکرار کے ذریعہ ایسے مرتبہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ اخلاقی مسائل ملکات میں تبدیل ہوجائیں، جیساکہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے:

"اَلْعَادَۃ طبع ثانٍ"[۳] "عادت انسان کی دوسری طبیعت اور شرست ہے"۔

بلندترین اصول ومبادی اور مکارم اخلاق میں تربیت کی مرکزیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تربیت پانے والے کے لئے کچھ حدتک جسمانی، نفسیاتی اور اخلاقی پسندیدہ عادات حاصل ہوں، تاکہ زیادہ سے زیادہ ارادہ اور توانائی کا مصرف ان کی جانب توجہ دینے سے آزاد ہوجائے۔ اس موضوع میں اسلام کی تربیتی روش سے متعلق دو نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔دینی واجبات اور فرائض میں عمل کا استمرار اور پابند:

۔دینی واجبات اور فرائض میں عمل کا استمرار اور پابند اس حدتک اہمیت کی حامل ہے کہ ترک عمل کے لئے اس کی قضا اور کبھی کفار بھی لازم ہوجاتا ہے، اخلاقی امور میں بھی "نذر" اور "عہد وقسم" کو اخلاقی فعل کو اپنے لئے ایک فریضہ کی صورت میں اپنا سکتا ہے، اگرچہ ان روشوں سے زیادہ استفادہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اپنی حیثیت اور منزلت کو کھوبیٹھے گایا انسان پر بہت گراں اور شاق گزرے گا، البتہ معمولی انداز میں بھی خود سے تعہد کرسکتا ہے کہ اخلاقی فعل کو پابندی کے ساتھ انجام دے گا، تاکہ اُس کا ملکہ نفس میں راسخ ہوجائے۔

۱۔ استاد مطہری، تعلیم وتربیت دراسلام، ص۷۵ پر ملاحظہ ہو۔

۲۔ احمد صبور اردوبادی: معمائے عادت۔

۳۔ غررالحکم، فصل۲، ص۳۲۲۔

۲۔کیفیت عمل کی جانب توجہ کرنا:

اسلام میں عمل کی ظاہری شکل وصورت آخری مقصود نہیں ہے، بالخصوص اخلاقی فعل اسلام کی نظر میں خاص اخلاقی اصول و مبادی کا حامل ہونا چاہئے، جیسے صحیح نیت، عمل کی صحیح شکل وصورت اور لوازم عمل کی جانب توجہ (جیسے یہ کہ عمل کے بعد ریا، منّت گذاری اور اذیت کے ذریعہ اس عمل کو ضائع نہ کرے)۔ حضرت امام جعفر صادق نے خداوندعالم کے ارشاد:(لِيَبْلُوَكُم أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً)[۱] (تاکہ خدا تمھیں آزمائے کہ تم میں سب سے بہتر عمل کرنے والا کون ہے ؟) کے متعلق فرمایا:"اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی زیادہ عمل کا مالک ہو، بلکہ خشیت خداوندی اور درست نیت کے لحاظ سے بہتر اعمال مراد ہیں"۔[۲]

ب ۔ اضداد سے استفادہ:

اخلاقی رذائل کو زائل کرنے سے متعلق یہ طریقہ تربیتی طریقوں میں سے سب سے زیادہ مؤثر ہے، اضداد سے سلوکی مکتب کے نظریات میں "تقابلی ماحول سازی" کے عنوان سے رفتار بدلنے کے لئے استفادہ کیا جاتا ہے۔ تقابلی ماحول سازی ایسا نتیجہ ہے کہ جس میں ایک ماحول کا جواب ایک دوسرے ماحول کے جواب سے جو اُس سے ناسازگار اور ناموافق ہوتا ہے، جانشین ہوتا ہے، اور یہ سبب ہوتا ہے کہ اس ماحول کا جواب جو کہ نامطلوب ہے (اور ہم چاہتے ہیں کہ تبدیل ہوجائے) جدید ماحول کے محرک کے ہوتے ہوئے نہ دیا جائے، اس کا اہم ترین فن منظم طریقہ سے (خیالی) حساسیت کا ختم کرنا اور واقعی حساسیت اور خود حساسیت کا ختم کرنا ہے۔[۳] اخلاقی کتابوں میں بھی اس روش سے کثرت کے ساتھ استفادہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ابو حامد غزالی "کبر" کے ختم کرنے سے متعلق لکھتا ہے:

"اگر کوئی اپنے دوست ورفیق سے علمی مناظرہ میں کوئی حق بات سنے اور احساس کرتا ہے کہ رقیب کی حقانیت کا اعتراف اُس کے لئے مشکل ودشوار ہے، تو اسے چاہئے کہ اس کبر کے معالجہ کے لئے اپنے اندر کوشش کرے...... عملی طریقہ اس طرح ہے کہ رفیق کی حقانیت کا اعتراف جو کہ اس کے لئے دشوار ہے، اپنے اوپر لازم کرے اور اُ سے برداشت کرے اور اس کی تعریف وتوصیف کے لئے اپنی زبان کھولے اور مطلب سمجھنے کے سلسلہ میں اپنی ناتوانی اور کمزوری کا اقرار کرے اور اس کا چونکہ اُس نے اُس سے ایک بات سیکھی ہے، شکریہ ادا کرے.... لہٰذا جب بھی اس امر کی متعدد بار پابندی کرے گا، اُس کے لئے طبیعی اور عادی ہوجائے گا اور حق قبول کرنے کی سنگینی، آسان ہوجائے گی"۔[٤]

۱۔ سورہ ٔہود آیت ۷۔ ۲۔ کافی ج۲ص ۱٦ ۔۳۔ علی اکبر سیف، تغییر رفتار و درمانیص ۲۵۲ ۔ ٤۔ احیاء علوم الدین ، ج۳، ص ۳٤٤۔

مرحوم نراقی نے بھی علاج کے طریقوں میں ایک طریقہ اخلاقی رذائل کے خلاف افعال کا انجام دینا قرار دیا ہے، اس توضیح کے ساتھ کہ کبھی اخلاق کی ایک منفی صفت کے زائل ہونے کے لئے ایک دیگر منفی صفت (کہ جو اعتدال کی حد میں ہو) کا سہارا لیں، مثال کے طور پر خوف ختم کرنے کے لئے جسارت آمیز اور شجاعانہ عمل انجام دینا چاہئے تاکہ خوف ختم ہوجائے۔

حضرت امیر المومنین علی فرماتے ہیں: "جب کسی چیز سے ڈر محسوس کرو تو اُس میں کود پڑو، کیونکہ کبھی کسی چیز سے ڈرنا، خود اس چیز سے سخت اور ناگوار ہوجاتا ہے"۔[1] اس روش سے متعلق قرآن کا تربیتی نکتہ یہ ہے کہ بری عادات اور اخلاقی رذائل کا یکبارگی اور اچانک ترک کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ ا سے مرحلہ وار اور تدریجاً انجام دیا جائے۔ شراب‌خوری، ربا، جوئے بازی اور بعض دیگر امور کے بارے میں قرآن نے تدریجی مقابلہ پیش کیا ہے۔

ج۔ ابتلاء اور امتحان:

"ابتلا" "بلیٰ" کے مادہ سے ہے یعنی اس کی اصل "بلیٰ" ہے بوسیدہ اور فرسودہ ہونے کے معنی میں اور ابتلا (یعنی آزمائش) کو اس لئے ابتلا کہتے ہیں کہ گویا کثرت آزمائش کی وجہ سے فرسودہ ہوجاتا ہے۔ ابتلا افراد کے متعلق دو نکتوں کا حامل ہے:

۱۔ جو کچھ اس کے لئے مجہول اور نامعلوم ہے اُس سے آگاہی اور شناخت۔

۲۔ انسان کی نیکی یا برائی کا ظاہر ہونا[2]۔ امتحان کی تعبیر بھی ابتلا اور آزمائش کی نوع پر بولی جاتی ہے[3] امتحان اور آزمائش ہمیشہ عمل کے ذریعہ ہے، کیونکہ ابتلا بغیر عمل کے بے معنی ہے، عمل کے میدان میں انسان کے باطنی صفات ظاہر ہوتے ہیں اور اس کی صلاحتیں قوت سے فعلیت تک پہنچتی ہیں۔ اسی لئے ابتلا اور امتحان فیزیکل اعتبار سے ایک عملی طرز ہے یا عمل کی پابندی کرنا ہے۔ اس میں اور تمرین و عادت میں فرق یہ ہے کہ مشق و تمرین ایک اخلاقی فضیلت کی نسبت ملکہ ایجاد کرنے کے لئے معین ہے لیکن طرز ابتلاء میں، کام عمل اور سختیوں اور مشکلوں کی تہ میں واقع ہونا مقصود ہے۔ اس روش اور طرز کی بنیاد پر مربی کو چاہئے کہ تربیت حاصل کرنے والے کو عمل میں اتار دے تاکہ خود ہی پستیوں اور بلندیوں کو پرکھے اور تلخ و شیرین کا تجربہ کرکے میدان سے سرفراز اور سربلند باہر آئے۔ تربیت پانے والے خود بھی مستقل طور سے ایسے شیوہ پر عمل کرسکتے ہیں۔

۱۔ "اذا هبت امراً فقع فيه فانّ شدّة توقيه اعظم ممّاتخاف منه"۔(نہج البلاغہ، ح۱۷۵)۔

۲۔ المفردات۔

۳۔ ایضاً۔

"المیزان" میں مرحوم علامہ طباطبائی کا کلام الٰہی کے امتحانوں کے سلسلہ میں تربیتی عنوان سے قابل توجہ ہے: "... اس وجہ سے انسانوں کے لئے عام الٰہی تربیت حُسن عاقبت اور سعادت اس دعوت دینے کے اعتبار سے امتحان ہے کیونکہ انسان کے لئے حالات کو مشخص و معین اور آشکار کرتی ہے کہ آیا یہ شخص کس عالم سے متعلق ہے: عالم ثواب وا جزا یا عالم عقاب و سزا۔ اس وجہ سے خداوند متعال اپنے تصرفات کو حوادث کی تشریع اور توجیہ کے عنوان سے بلائ، ابتلاً اور فتنہ نام دیتا ہے، مثال کے طور پر عام عنوان سے فرماتا ہے: (اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً)[۱] "بے شک ہم نے روئے زمین کی ہر چیز کو زمین کی زینت قرار دیا ہے تاکہ ان لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے" یا فرماتا ہے: (وَنَبْلُوکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً)[۲] "... اور ہم اچھائی اور برائی کے ذریعہ تم سب کو آزمائیں گے..." یا فرماتا ہے: (اَنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ)[۳] "تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں" وغیرہ۔

یہ آیات جیسا کہ آپ ملاحظہ کررہے ہیں انسان سے متعلق ہر مصیبت وبلا کو "الٰہی امتحان وآزمائش" شمار کرتی ہیں تمام امور کے لئے جیسے اس کا وجود، اس کے اجزا اور اعضاء جیسے آنکھ، کان یا اس کے وجود سے خارج چیزیں جو اُس سے مربوط ہیں جیسے اولاد بیوی، رشتہ دار، احباب، مال، جاہ و مرتبہ مقام اور وہ تمام امور کہ جن سے وہ کسی قسم کا فائدہ حاصل کرتاہے، اسی طرح ان کے مقابل امور جیسے موت اور تمام مصیبتیں۔ ان آیات میں افراد کے اعتبار سے بھی ایک عمومیت پائی جاتی ہے یعنی مومن وکافر، نیکوکار اور گناہگار، انبیاء اور ان سے کم درجہ والے سارے افراد معرض بلا و امتحان میں ہیں، لہٰذا یہ اللہ کی ایک جاری وساری سنت ہے کہ کوئی اس سے الگ نہیں ہوسکتا"۔[٤]

۱۔ سورہ کہف آیت ۷۔

۲۔ سورۂ انبیاء آیت ۳۵۔

۳۔ سورۂ تغابن آیت ۱۵ ۔

٤۔ المیزان ج٤ ص٣٦۔

یہ بات کہ امتحان اور ابتلاء جملہ امور میں تمام افراد کے لئےاللہ کی بلا استثناء ایک جاری سنت ہے ، ابتلا کے تربیتی روش سے منافات نہیں رکھتی، کیونکہ اس طرح کے امور کے ساتھ ہمارے طرز عمل کو ایک تربیتی طرز کے عنوان سے مانا جاسکتا ہے یعنی مشکلات میں صبر و تحمل اور نعمات میں شکر کہ جس کی بازگشت ہمارے طرز عمل ہی کی جانب ہے، خود اخلاقی تربیت کے عوامل میں محسوب ہوسکتا ہے: اور ہم قطعی طور پر تم کو کچھ چیزوں جیسے خوف، بھوک، اموال، نفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو بشارت دیدو، (وہی لوگ) کہ جب ان پر مصیبت پڑتی ہے، کہتے ہیں: "ہم خدا ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے"[1]

اس کے علاوہ اگرچہ آیات میں خیر وشر، نعمت ونقمت، سختی اور سہولت سب کو امتحان اور ابتلا کے مصادیق میں شمار کیا گیا ہے حتی کہ بعض روایات میں شکر وکشادگی کی منزل میں طرز عمل کو صبر وناگواری کے وقت سے زیادہ سخت جانا گیا ہے، لیکن جو چیز امتحان کے موقع پر افراد کی توجہ کا زیادہ ترمرکز ہوتی ہے وہ ناگوار، رنج آمیز اور اندوہگین حوادث وواقعات کا مقابلہ کرنا ہے، چنانچہ مذکورہ آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ خوفناک اور ہولناک امور، بھوک، دلبندوں اور عزیزوں کے فقدان، اموال اور سرمایہ حیات کی نسبت آفات وحوادث وغیرہ سے (کہ جنھیں اصطلاح میں "مصیبت" کہا جاتا ہے) تمھیں آزمائیں گے، ان امور کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادگی اور اُن سے ہمارا طرز مقابلہ ان میدان کو ایک تربیتی اور اصلاحی مدرسہ بناسکتا ہے۔

ابتلاء اور سختیوں سے مقابلہ کے تربیتی علائم روایات میں یوں بیان ہوئیہیں: گناہ سے پاک ہونا، باطنی خاکساری وتذلل اور خارجی سرافرازی وسربلندی، کبر ونخوت کا زائل ہونا، درجہ بلند ہونا، شدائد ومشکلات کے سامنے ثابت قدمی، آخرت اور خدا کی ملاقات کا اشتیاق۔

"...یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خدا نے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے (عمل میں) آزمائش کرے اور جو کچھ تمہارے ضمیر کی حقیقت ہے اُسے آشکار کردے اور خدا سینوں کے اسرار سے آگاہ ہے"۔[2]

۱۔ سورہ بقرہ آیت ۱۵۵۔۱۵۶۔

۲۔ (وَلِيَبْتَلِيَ اللّهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُم، وَاللّهُ عَلِيْم بِذَاتِ الصُّدُوْرِ)(سورہ آل عمران آیت ۱۵٤)۔

حضرت امام جعفر صادقؑ نے بھی فرمایا: "وہ لوگ آزمائش کی بھٹی میں آزمائے جائیں گے، جس طرح سونے کو بھٹی میں آزمایا جاتا ہے اور خالص کئے جائینگے جس طرح سونا کھرا اور خالص کیا جاتا ہے"۔[۱]

سید قطب کی تحریر کے مطابق: تمام وسائل پر حوادث کی ایک تربیتی وسیلہ کے عنوان سے فضیلت وبرتری یہ ہے کہ ایسی خاص حالت روح میں پیدا کرتے ہیں کہ گویا اس کو پگھلادیتے ہیں۔ حادثہ روح کو کامل طور سے جھنجھوڑدیتا ہے وردّ عمل (تاثیر وتاثر) ایک حرارت اس کے باطن میں ایجاد کردیتا ہے کہ کبھی نرم کرنے کے لئے یا نرم کرنے کی حدتک پہنچنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہ حالت روح میں نہ ہمیشہ پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی نفس کے لئے آسان ہے کہ سکون واطمینان اور امن وامان یا راحت طلبی کی حالت میں اس تک پہنچ جائے۔

"... ایک مثل لوگ کہتے ہیں: جب تک لوہا گرم ہے کوٹ لو، () کیونکہ لوہے کی گرمی کے وقت اُس پر ہتھوڑا مارنا آسان ہے اور اسے جس شکل میں چاہے بدل سکتے ہیں... اس وجہ سے سختیوں اور حوادث سے استفادہ کرنا تربیت کے اہم مطالب میں سے ہے، کیونکہ نفس کے پگھلنے اور گداز ہونے کی صورت میں مربی تربیت دئے جانے والے کو ارشاد وتہذیب کے جس رنگ میں چاہے رنگ سکتا ہے وہ اس طرح کہ کبھی اس کا اثرزائل نہیں ہو گا یاکم ازکم جلدی زائل نہیں ہو گا"۔[۲]

اسی طرح سختیو ں سے استفادہ اور عیش وراحت سے دوری کو اس شیوہ کا مکمِّل (پورا کرنے والا) جانا جا سکتا ہے، سختیاں انسان کے گوہروجودکو جلا بخشتی ہیں، اور اس میں نکھار اورچمک پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سختی، مقاومت کہ جوحادثوں اور سختیوں کی طوفان میں ہمیں حاصل ہوتی ہے، انسان کو نادرست اخلاقی میلانات اور رجحانات کے مقابل محفوظ رکھتی ہے اس وجہ سے روایات میں تاکیدکی گئی ہے کہ بچہ تھوڑا سا کو مشکلات اور سختیوں سے دوچار کرو۔

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں:

"بہترہے بچہ عہدطفولیت میںزندگی کی ناگزیر سختیوں اور مشکلوں کا سامنا کرے جو کہ حیات کا تاوان ہے تاکہ جوانی اوربڑھاپے میں بردباراورصابرہو"۔[۳]

۱۔ "یفتنون کما یفتن الذهب، یخلصون کما یخلص الذهب"۔(کافی ج ا ص ۳۷۰۔)

۲۔ روش تربیتی اسلام، ص۲۸۸،۲۸۷۔

۳۔ وسائل الشیقہ، ج۵، ص۱۲٦۔

حضرت علی فرماتے ہیں:

"جنگل، ہوا اور طوفان میں پرورش پانے والے درخت باغبان کے پرو ردہ اور تروتازہ درختوں سے بہتر ہوتے ہیں"۔[۱]

اسلام میں جہاد اسی زاویہ سے قابل توجہ و تحقیق ہے دین کے دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ خواہ صدر اسلام میں ہو یا بعد کے زمانوں میں (بالخصوص آخری دفاع مقدس کے دوران) ایک تربیتی اور اخلاقی مدرسہ رہا ہے، اور اخلاق کی بلندیوں پر فائز انسان اُس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں:

"ہم یقینا تمہیں آزمائیں گے تاکہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین کو جان لیں اور (اس طرح) تمھارے حالات کو باقاعدہ جانچ لیں "۔[۲]

ڈاکٹر" ویکٹور فرانکل "سویڈن کا ماہر نفسیات ہے اور ہیومنسٹ معالجین میں سے محسوب ہوتا ہے اور خود بھی ایک طولانی مدت تک جرمنی کے نازیوں چھائونی میں دوسری عالمی جنگ میں اسیر رہا ہے، اس نے اپنی آنکھوں سے جو انسان سوزی کی بھٹیاں دیکھیں اور بھوک، سردی، بیماری اور سخت ترین رنج والم اٹھائے لیکن اس کی جان بچ گئی۔ چھائونی سے آزاد ہونے کے بعد اُس نے اپنے معنوی علاج کے مکتب (Logothrapy)کی بنیاد ان تین راہوں میں سے ایک راہ کے کشف و تفہیم پر رکھی:

۱: ۔اچھے امور کا انجام دینا۔

۲: ۔تجربۂ اعلیٰ جیسے عشق۔

۳رنج والم برداشت کرنا۔

وہ تیسری راہ کی وضاحت میں کہتا ہے: رنج والم کابرداشت کرنا انسان کی بہترین وجودی جلوہ گاہ ہے اور جو بات اہم ہے وہ انسان کا رنج والم کے ساتھ فکر اور سلوک کا انداز ہے۔ ہدف زندگی رنج والم سے فرار کرنا نہیں ہے، بلکہ زندگی کو بامعنی بنانا ہے کہ اُسے واقعی مفہوم عطا کرے۔ ہرچیز کو ایک انسان سے لیاجاسکتا ہے مگر انسان کی آخری آزادی کو اس کی رفتار کے انتخاب میں ڈاسٹایوفسکی کے بقول: میں صرف ایک چیز سے ڈرتاہوں اور وہ یہ کہ اپنے رنج والم کی شایستگی اور لیاقت نہ رکھوں۔[۳]

۱۔ نہج البلاغہ، نامہ، ٤٥۔

۲۔ سورہ محمد آیت ۳۱۔

۳۔ دیکٹور فرانکل: انسان درجستوی معنا۔

د۔معاشرت و مجالست:

اخلاقی ملکات کے رسوخ کے لئے ایک دوسرا عملی شیوہ صالح اور اخلاقی فضائل کے حامل افراد کے ساتھ زندگی گذارنا اور ناپاک نیز اخلاقی رذائل میں مبتلا افراد کی مجالست و ہمنشینی سے اجتناب کرنا ہے، نفس شناسی کے دلائل بہت سی جہتوں سے قابل توجہ ہیں کہ جو تفصیل اور تکرار کے محتاج نہیں ہیں، منجملہ ان کے تقلید اور دوسروں کے اعمال کا مشاہدہ (باندوار کا نظریہ)،قوت بخش چیزوں کے وجود کے ساتھ ماحول سازی اور تداعی (موافقت وہماہنگی) کی ایجاد (اسکینر کا فعال ماحول سازی کا نظریہ ، یعنی مثال کے طور پر ایک اچھے اور صالح گروہ میں اگر ایک اچھا با عمل انسان سے صادر ہو تو دیگر تمام افراد کے ذریعہ اس کی تقویت کی جائے)۔ (نظریہ تسہیل اجتماعی)[1] ہے (دوسروں کا وجود حتی غیر فعال تماشائیوں کا وجود انسان کی فعّالیت کو قوت بخشتا ہے (کیونکہ انسان کے مقصد کو بلندی عطا کرتا ہے)۔

آیات وروایات میں نیکو کاروں کی معاشرت اخلاقی تربیت کے ایک شیوہ کے عنوان سے مورد تاکید واقع ہوئی ہے اور بزرگوں نے بھی اس سلسلہ میں مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

قال الحواریون لعیسیٰ : یاروح اللہ مَن نجالسُ اذاً؟ قال: من یذکرکم اللہ رؤیتہ ویزید فی علمکم منطقہ ویرغبکم فی الآخرۃ عملہ۔

[2]حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے پوچھا:

اے روح اللہ! اس وقت ہم کس کے ساتھ ہمنشینی رکھیں؟ انھوں نے فرمایا: جس کا دیدار تمھیں اللہ کی یاد دلائے، جس کی بات تمھارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا عمل تمھارے اندر آخرت کے متعلق رغبت پیدا کرے۔

یا ابن مسعود، فلیکن جلساؤک الابرار واخوانک الاتقیاء والزھاد لانّ اللہ تعالیٰ قال فی کتابہ:(الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الّا المتقین)۔[3] اے ابن مسعود! تمھارے ہمنشین نیک لوگ ہونے چاہئیں اور تمھارے بھائی (دوست) متقین وزاہدین ہونے چاہئیں اس لئے کہ تم خدائے تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:"اس دن صاحبان تقویٰ کے علاوہ تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوجائینگے"۔

۱۔زمینہ روانشناسی ج۲ص۳۷۲۔

۲۔ بحار الانوار ج۷۷ص۱٤۷۔

۳۔ بحار الانوار ج۷۷ص۱۰۰۔

امام علی: جالس العلماء تزدد حلماً۔[1] علمائے کی ہمنشینی اختیار کرو کہ ان کی ہمنشینی حلم میں اضافہ کرتی ہے۔

امام حسین: مجالس الصالحین داعیة الی الصلاح۔[2] صالحین کی مجالس (نشست) صلاح ونیکی کی طرف دعوت دیتی ہے۔

امام علی: جالس العلماء یزددعلمک ویحسن ادبک وتزکوا نفسک۔[3] علماء کی ہمنشینی اختیار کرو کہ اس سے تمھارے علم میں اضافہ ہوگا، تمھارا ادب اچھا ہوگا اور تمھارا نفس پاک ہوگا۔

امام علی۔: علیک باخوان الصدق فاکثر من اکتسابھم فانّھم عدة عند الرخاء وجُنَّة عند البلائ۔[4] تم پر سچے (نیک) دوستونکی ہمنشینی لازم ہے پس ان سے زیادہ زیادہ سے زیادہ کسب فیض کرو اس لئے کہ وہ آسائش کے وقت وسیلۂ دفاع ہیں اور مصیبت کے وقت سپرہیں۔

امام علی: جانبوا الاشر وجالسوا الاخیار۔[5] بروں سے پرہیز کرو اور نیکوں کی ہمنشینی اختیار کرو۔

حضرت امام محمد باقر۔: لاتقارن ولاتواخ اربعة: الاحمق والبخیل والجبان والکذاب۔[6] چار افراد سے ہمنشینی اور دوستی اختیار نہ کرو: احمق، کنجوس، ڈرپوک اور جھوٹے سے۔

امام علی: مجالسة اهل الهویٰ منساة للایمان۔[7] خواہش پرست کی ہمنشینی ایمان کو بھلادیتی ہے۔

١۔ غرر الحکم فصل ٣ص ٤٧۔

٢۔ بحار الانوار ج٧٨ ص ١٤١۔

٣۔ غرر الحکم فصل ١ص ٤٣٠۔

٤۔ بحار الانوار ج٧٤ ص١٨٧۔

٥۔ غرر الحکم

٦۔ بحار الانوار ج٧٤ ص١٨٧۔

٧۔ نہج البلاغہ ج٨٦۔

۴:۔ تشویق اور تنبیہ کا طریقہ

"تشویق "لغت میں آرزو مند کرنے، شوق دلانے اور راغب کرنے کے معنی میں ہے۔(فرہنگ معین)

یہاں پر"تشویق" سے مراد انسان کی درخواست سے متعلق اور مطلوب امور سے عمل انجام دینے کے بعد عمل کے اضافہ یا اس کی تثبیت کے لئے استفادہ کرنا ہے۔

"تنبیہ"بھی لغت میں آگاہ کرنے، بیدار کرنے، تادیب اور سزادینے کے معنی میں ہے (فرہنگ معین)۔یہاں پر تنبیہ سے مراد انسان کے لئے تکلیف دہ اسباب ووسائل سے عمل انجام دینے کے بعد عمل کو دور یا کم کرنے کے لئے استفادہ کرنا ہے۔ اس وجہ سے تشویق یا تنبیہ کو خود انسان یا دوسروں کے ذریعہ عملکو کنٹرول کرنے کا ایک سسٹم جاننا چاہئے کہ پسندیدہ یا ناپسندیدہ عمل کے بعد اس عمل کی زیادتی یا کمی کے لئے ان چیزوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

تشویق یا تنبیہ کا نفسیاتی بنیٰ، فعال ماحول سازی کے نظریہ کے مطابق، درج ذیل آزمائشوں پر استوار ہے:

۱ ۔ہر جواب جو ایک قوت بخش محرک کے نتیجہ میں حاصل ہو، اس کی تکرار کی جاتی ہے ۔

۲ ۔قوت بخش محرک ایک ایسی چیز ہے کہ جواب ملنے کے احتمال کو بڑھاتا ہے۔

۳۔ان قوت بخش چیزوں جو ذاتی طور پر تقویت کرنے کی خاصیت کے حامل ہیں، اولین یا غیر شرطی قوت بخش کہتے ہیں، اوّلین مثبت قوت بخش جاندار کی جسمانی قوت ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جیسے: پانی، غذا، ہوا، وغیرہ۔ اوّلین منفی قوت بخش چیزیں ذاتی طور پر تکلیف دہ خاصیت رکھتی ہیں جیسے: مارپیٹ، گالم گلوج ، زیادہ حرارت اور زیادہ نور وغیرہ۔

٤ ۔ثانوی یا شرطی قوت بخش چیزیںؤہ ہیں جو کلاسیک ماحول سازی (اوّلین بخش چیزوں کے ساتھ ہمراہی چیزوں کے ساتھ ہمراہی اور تداعی) کے اصول کے مطابق تقویت کرنے کی خاصیت رکھتی ہیں جیسے: روپیہ، انعام، نمبر وغیرہ ۔

٥ ۔اگر کوئی رفتار کسی چیز کی تقویت سے بڑھ جائے اور ا سے ایک مدت تک تقویت نہ کریں، تو وہ تدریجاً موقوف ہوجائے گی کہ اُسے "خاموشی"بھی کہتے ہیں۔

٦ ۔تنبیہ، ایک نادرست اورنا مطلوب رفتار کے دور کرنے کے لئےتکلیف دہ محرک و سبب کے وارد کرنے کے معنی میں ہے۔

۷۔ کبھی کبھی تقویت مسلسل تقویت سے زیادہ اثر رکھتی ہے، لہٰذا اگر مربی (تربیت دینے والا) ہر بار مطلوب اور پسندیدہ رفتار کے ظاہر ہونے کے بعد جزاوسزا دے، تو ناخواستہ طور پر اس کے وقوع کا احتمال کم ہوتا جائے گا، لیکن اگر مربی کبھی کبھی چند بار مطلوب رفتار انجام دینے کے بعد جزا دے، تو اس کے توقعکا احتمال زیادہ ہوجائے گا زیادہ موثر یہ ہے کہ تربیت کی ابتدا میں مسلسل جزا ہو اور رضایت بخش سطح تک پہنچنے کے بعد نوبت وار کبھی کبھی ہوجائے۔

۸۔ آغاز میں اجتماعی قوت بخش (ستائش، تائید اور مسکراہٹ وغیرہ) محسوس طور پر قوت بخش چیزوں کے ساتھ استعمال کی جائے اور اس کے بعد محسوس قوت بخش چیزیں ترک کردی جائیں، آیات وروایات میں تشویق وتنبیہ کے تربیتی کردار پر تاکید کی گئی ہے۔

حضرت امیر المومنین علی مالک اشتر کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تمہارے نزدیک نیکو کار اور بدکاریکساں نہ ہوں، کیونکہ یہ امر (یکساں قرار دینا) نیکو کاروں کے نیکی ترک کرنے اور نااہلوں کی بدکاری میں اضافہ کا باعث ہوگا، لہٰذا ادب کی رعایت کے لئے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ حالات کے مطابق برتائو رکھو"۔[۱]

"نیکوکاروں کی اصلاح ان کا ادب و احترام کرنے سے ہوتی ہے اور بدکاروں کی اصلاح ان کی تادیب کرنے (سزا دینے) سے"۔[۲]

"جوکچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب خدا کے لئے ہے، تاکہ جن لوگوں نے برا کیا ہے وہ ان کے کرتوت کی انھیں سزا دے اور جن لوگوں نے احسان ونیکی ہے انھیں اچھا بدلہ دے"۔[۳]

"خداوند سبحان نے جزا اپنی اطاعت پر اور سزا اپنی معصیت پر قرار دی ہے، تاکہ اپنے بندوں کو اپنے عذاب سے باز رکھے اور بہشت کی طرف روانہ کرے"۔[٤]

۱۔ بحار الانوار ج۷۷ ص٤٦۔

۲۔ "استطلاح الاخیار باکرامھم والاشراربتأدیبھم"(بحار الانوار ج۷۸ ص۲٤۵)۔

۳۔ سورہ نجم آیت ۳۱۔

٤۔ نہج البلاغہ حکمت ۳٦۸۔

ادیان الٰہی اور اسلام میں قانون عذاب وثواب کو دو اعتبار سے دیکھا جاسکتا ہے

اول :

یہ کہ ان کا اعلان کرنا انذار وتبشیر کا پہلو رکھتا ہے ، دوسرے یہ کہ ثواب وعقاب کی واقعیت عینی ہے کہ اُن میں سے بعض دنیا میں (جیسے سکون واطمینان، راحت وچین ، زندگی کی آسائش اور عیش وعشرت کو احساس) اور درک کرتا ہے، اس لحاظ سے تشویق وتنبیہ اُن دونوں کی تطبیق واقع سے دور نہیں ہے۔ اُس کا اخروی حصہ جیسے حور وقصر ومحلات وغیرہ بھی ایمانی بصیرت (انسان کا دوسرے عالم اور وعدہ الٰہی کے قطعی ہونے اور اس بات پر اعتقاد رکھنا کہ انسان اپنے اعمال سے اس ثواب یاعقاب کو اس وقت بھی عینی تجسم بخشتا ہے) کے اقتضا کے مطابق حاضر وموجود ہیں اور انھیں بھی تنبیہ وتشویق کے مصادیق میں شمار کرسکتے ہیں۔ اس بناپر بہشت ودوزخ اور اللہ کے وعدہ و وعید سے متعلق تمام آیات ایک طرح بندوں کی تشویق اورتنبیہ کے لئے ہیں تاکہ وہ اپنی عادت اور روش کو بدل ڈالیں اور فلاح وکامیابی اور فضائل اخلاقی کے حامل ہونے کی راہ میں گامزن ہوجائیں۔ لیکن ان لوگوں کے لئے جن کا عقیدہ وایمان کمزور ہے، ان کے لئے وہ آیات انذار وتبشیر ہی کی حد میں ہوں گی ۔

دوسرانکتہ

جس کی ہمیں تاکید کرنی ہے یہ ہے کہ یہاں پر تشویق، ترغیب اور تحریض (ابھارنے) کے علاوہ ایک چیز ہے، تشویق عمل انجام دینے کے بعد کی چیز ہے، لیکن ترغیب وتحریض قبل از عمل سے مربوط ہیں۔ تشویق وتنبیہ کے وہ طریقے جن میں ایک طرح منطقی ترتیب کا لحاظ کیا جاسکتا ہے، درج ذیل ہیں:

الف ۔ عاطفی توجہ:

محبت آمیز نگاہ ، مسکرانا، اورہر قسم کی تائید ، مہر ومحبتاور طلف کا احساس تربیت پانے والے کو عزت نفس کے عمیق احساس میں مبتلا کردیتاہے، کیونکہ ہر انسان حُبّ ذات کے زیر اثر غیروں کی محبت اورتوجہ حاصل کرنے کا محتاج ہوتا ہے۔ [۱] درج ذیل آیات اس سلسلہ میں قابل توجہ ہیں: (وَاخْفِضْ جِنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ المؤمِنِیْنَ) [۲] "اور جو صاحبان ایمان آپ کی اتباع کرلیں ان کے لئے اپنے شانوں کو جھکادیجئے"۔

۱۔اس بات کی مزید توضیح "تکریم شخصیت کی روش"کی بحث میں گذرچکی ہے۔

۲۔ سورہ شعراء آیت۲۱۵۔

(وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ وَلَاتَعْدُ عَيْنَاکَ عَنْهُمْ)(۱)

"اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے ساتھ صبر آمادہ کرو جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی مرضی کے طلبگار ہیں اور خبردار تمھاری نگاہیں ان کی طرف سے نہ پھر جائیں..."۔

ان آیات میں خداوند متعال اپنے مہربان حبیب سے چاہتا ہے کہ مومنین کے لئے لطف ومرحمت کے بازو جھکادیں، ان کی طرف سے چشم محبت نہ ہٹائیں اوران کے ساتھ ہمراہی اور صبر وشکیبائی کریں دوسری آیت میں اپنے رسول کی بلند ترین ان صفات کے حامل ہونے اور مومنین کے ساتھ ایسی معاشرت رکھنے پر معاملات کرنے کی توصیف کرتا اور فخر ومباہات کرتا ہے:

"یقیناً تمھارے پاس تمھیں میں سے وہ پیغمبر آیا ہے کہ تمہاری ہر مصیبت پراس کے لئے بہت ناگوار ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین پر دلسوز ومہربان ہے"۔(۲)

جی ہاں، وہ روح پرورنگاہ جو انسانوں پر عشق ومحبت کے ساتھ پڑتی ہے، انسان کو متحرک کرنے کے لئے کافی ہے اور بلال وسلمان کی صف میں بٹھادیتی ہے۔

ب ۔ زبانی تشویق:

تعریف وتمجید، دعا، شکریہ ادا کرنا اور زبانی قدردانی بھی اُن عام وسائل اور اسباب میں سے ہیں کہ بلند مقاصد اور گرانمایہ اخلاقی اعمال تک رسائی کے لئے اُن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے خداوند عالم اپنے پیغمبر سے چاہتا ہے کہ مومنین سے زکات لینے کے بعد ان کے لئے دعا کریں۔(۳)

حضرت امیر المومنین علی نے بھی مالک اشتر سے خطاب کرتے ہوئے انھیں اس نکتہ کی یاد آوری کی ہے:

... ان کی پے درپے تشویق کرو اور جو انھوں نے اہم کام انجام دئے ہیں انھیں شمار کرو (اہمیت دو) کیونکہ ان کے نیک کاموں کی یاد آوری ان کے دلیروں کو زیادہ سے زیادہ حرکت کرنے پر ابھارتی ہے، اور وہ لوگ جو کام میں سستی کرتے ہیں انھیں کام کرنے کا شوق پیدا ہوگا، انشاء اللہ ۔(٤)

---

۱ ۔ سورہ کہف آیت۲۸۔ ۲۔ سورہ توبہآیت ۱۲۸ ۔۳۔ سورہ توبہ آیت ۱۰۳ ۔ ٤۔ نہج البلاغہ نامہ ۵۳۔

زبانی تشویق میں اہم نکتہ یہ ہے کہ اور موقع و محل سے اس حد تک استفادہ ہو اور افراط وتفریط یا چاپلوسی کی حالت پیدا نہ ہو امام علی نے فرمایا ہے:

جب تم تعریف وثنا کرو تو اختصار پر اکتفا کرو۔(۱)

سب سے زیادہ بے عقلی اور حماقت، تعریف و ستائش یا مذمت میں زیادتی کرنا ہے۔(۲)

"استحقاق سے زیادہ تعریف کرنا چاپلوسی ہے اور اس (استحقاق) سے کم تعریف کرنا حسد یا عاجزی کی علامت ہے"۔(۳)

بہت سے افراد اپنی تعریف و تمجید ہونے سے مغرور ہوجاتے ہیں۔(٤)

ج ۔ عملی تشویق:

انعام، ہدیہ، تحفہ وغیرہ دینا، نمبر، تنخواہ یا حقوق یا مزدوری میں اضافہ کرنا، سیاحت اور تفریح کے لئے لے جانا، کھیلنے کی یا دوستوں کے ہمراہ باہر جانے کی اجازت دیناوغیرہ ، یہ سب عملی تشویق شمار ہوتی ہے کہ موقعیت کے اعتبار سے ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اکرم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت میں ایسے متعددمقامات پائے جاتے ہیں کہ کسی ایک آدمی کے نیک عمل کا مشاہدہ کرنے کے بعد اُسے صلہ اورہدیہ دیتے ہیں حتی کبھی اپنا لباس بھی دیدیتے تھے، جیسے کمیت بن زیاداسدی کی داستان کہ حضرت امام زین العابدین ـ کی خدمت میں پہنچے اور کہا: میں نے آپ کی مدح وثنا میں کچھ اشعار کہے ہیں اور چاہتا ہوں کہ انھیں پیغمبر سے تقرب کا وسیلہ قراردوں۔پھر اپنا معروف قصیدہ آخرتک پڑھا، جب قصیدہ تمام ہو گیا، امام ـ نے فرمایا: "ہم تمہاری جزا نہیں دے سکتے، امید ہے کہ خداوندعالم تمہیں جزادے۔"پھر اس کے بعد اپنے بعض لباس انھیں دیدیئے اوراُن کے حق میں اس طرح دعا کی: "خدا یا! کمیت نے تیرے پیغمبر کے خاندان کی نسبت، اس حالت میں نیک فریضہ اداکیا کہ اکثرلوگوں نے اس کام سے بخل کیا اور شانہ خالی کیا ہے جوحق دوسروں نےپوشیدہ رکھا تھا اس نے آشکار کردیا۔ خدایا! اسے سعادت مندزندگی عطا کر اور اُسے شہادت نصیب کر اور اُسے نیک جزا دے کہ ہم اُس کی جزا نہیں دے سکتے جزا ورناتواں ہیں۔

---

۱ ـ "اذا مدحت فاختصــر "(غرر الحکم، فصل ٤ص٤٦٦)ـ ۲ـ "اکبر الحمق الاغراق فی المدح والذم"(غرر الحکم، فصل ۷ص۷۷)ـ ۳ـ "الثناء بأکثر من الاســتحقاق ملق والتقصیر عن الاستحقاق عیّ أوحسد" (بحارالانوار ج۷۳ص ۲۹۵)ـ ٤ـ "رُبّ مفتون بحسن القول فیه"(بحارالانوار ج۷۳ص ۲۹۵)ـ

کمیت نے بعد میں کہا: "میں ہمیشہ ان دعائوں کی برکت سے بہرہ مند رہا ہوں" حضرت نے اس طریقہ سے کمیت کی روح شجاعت اور حق گوئی کی تشویق اور تائیدکی۔ اسی کے مشابہ داستان حضرت امام علی رضاؑ کے بارے میں بھی دعبل خزاعی کی نسبت ہے جب وہ قصیدہ پڑھ چکے تو حضرت نے وہ دس ہزار درہم کہ جن پر آپ کا نام کندہ تھا اُنھیں عطا کیا اور دعبل نے ہر درہم کو اپنی قوم کے درمیان (دس) درہم میں فروخت کیا۔(۱)

درج ذیل نکات کی رعایت تشویق کی تاثیرمیں اضافہ کرتی ہے:

۱۔تشویق ابھارنے اور قوت بخشنے کا ذریعہ ہے لہٰذا خودوہی ہدف نہیں بن جانا چاہئیے اور تربیت پانے والے کے تمام افکار داذہان کو اپنے ہی لئے سرگرم رکھے۔ تشویق کبھی کبھی کرنا، اس کا فیزیکی سطح سے اجتماعی ومعنوی بلندی کی طرف لے جانا اور تشویق کا مستحق ہونا (رشوت کی حالت کا نہ رکھنا) ایک حدتک مذکورہ اشکال واعتراض کو برطرف کردیتا ہے۔

۲۔ تربیت پانے والے کو تشویق کی علت مکمل طور پرواضح اور معلوم ہونی چاہئے۔

۳۔تشویق موقع ومحل کے اعتبار سے ہو تاکہ کار آمد اور موثرثابت ہو۔

٤۔تشویق کرتے وقت اُس کا کسی دوسرے سے مقائسہ اور موازنہ نہیں کرنا چاہئے؛کیونکہ اُس پر بُرااثرپڑے گا۔

٥۔ مجمع میں تشویق وتحسین کرنا زیادہ اثر رکھتا ہے کیونکہ دوسروں کو بھی آمادہ کرتا ہے۔

د۔ جزاسے محرومیت اور نیکو کار کو جزادینا:

اس مرحلہ کے بعد تنبیہ کے طریقوں یںنداخل ہو جائیں گے۔ مربی تربیت دئے جانے والے کی نا شائستہ حرکات وسکنات کو ختم کرنے کے لئیاسے ان بعض جزائوں اورمواہب سے محروم کردے جن کی وہ امید رکھتا ہے یایہ کہ نیکوکاروں کو جزادے کر اُسے اپنی محرومیت کی جانب متوجہ کرے اور اس کے اشتباہ وخطا کی نشاندہی کرے۔ حضرت علیؑ کے گہربار اور زریں کلام میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "نیکو کار کو جزا دے کر بدکار کو ان کی بدکاری سے روک دو"۔(۲)

۱۔عیون اخبارالرضا، ج۱، ص۱٥٤۔

۲۔ "ازجرالمسیء بثواب المحسن"بحار، ج۷٥، ص٤٤، باب ۳٦

(اَفَمَنْ کَانَ مُؤمِناً کَمَنْ کَانَ فَاسِقاً لَایَسْتَوُونَ)۔[۱]

"کیا وہ شخص جو صاحب ایمان ہے اس کے مثل ہوجائے گا جو فاسق ہے؟ ہرگز نہیں، دونوں برابر نہیں ہوسکتے"۔

(لَایَسْتَوِی اَصْحَابُ النَّاسِ وَاَصْحَابُ الْجَنَّةِ۔۔۔)[۲]

"اصحاب جنت اور اصحاب جہنم ایک جیسے نہیں ہوسکتے"۔

(وَمَایَسْتَوِی الاعمیٰ والبصیروالّذین آمنواوعملواالصالحات ولاالمسء قلیلا ماتتذکرون)۔[۳]

"اور یاد رکھو کہ اندھے اور نابینا برابر نہیں ہوسکتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے ہیں وہ بدکاروں جیسے نہیں ہوسکتے ہیں، مگر تم لوگ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو"۔

خداوند عالم ان آیات میں واضح طورپر نیکوکاروں اوربدکاروں کے مساوی نہ ہونے کا اعلان کرتا ہے، اس سے اس کا مقصود یہ ہے کہ سب جان لیں کہ اچھے لوگوں کے لئے جزا ہے اور ناشائستہ اور قبیح اعمال والوں کے لئے محرومیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہ۔جرمانہ اورتلافی:

جرمانہ نمبرکم کرنے، پیسہ دینے، دوستوں کے لئے مٹھائی خریدنے وغیرہ کی صورتوں میں ہوتا ہے۔تلافی جیسے اس انسان سے عذر کرنا جس کی توہین کی ہے یا جس جگہ کوئی نقصان پہنچایا ہے اس کی تعمیر کرے یا مرمت کرے جرمانہ کے سلسلہ میں توجہ رکھنا چاہئے کہ ادا کرنے یا کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور بے چارگی اور بیزاری کی حالت پیدا نہ ہو۔جرمانہ کے شیوہ سے استفادہ کی شرط یہ ہے کہ انسان کی ایک مدت تک تقویت کی جائے تاکہ پہلے جو اُسے جزائیں دی گئی ہیں بعد میں اُس سے واپس لی جاسکیں۔

اسلام میں دیت کاقانون اس کے حقوقی جنبہ کے علاوہ تربیتی جنبہ سے بھی ایک قسم کا جرمانہ حساب ہوتا ہے۔

و۔ سرزنش وتوبیخ اور جسمانی توبیخ وتنبیہ:

توبیخ، غیض وغضب کی نظر سے شروع ہوتی ہے اور علانیہ توبیخ تک پہنچتی ہے۔[٤]

۱۔ سورئہ سجدہ، آیت ۱۸۔ ۲۔ سورہ حشرآیت ۲۰۔

۳۔ سورہ غافر، آیت ۵۸۔ ٤۔ ایک اعتبار سے مخفی اورپوشیدہ توبیخ کو جرمانہ اورتلافی سے قبل جاننا چاہئے)۔

حضرت علی فرماتے ہیں: "عقلمندوں کی سزا کنایہ اور اشارہ کی صورت میں ہوتی ہے اورنادانوں کی سزا واضح اور صریح انداز میں ہوتی ہے۔[۱]

"تعریض (کنایہ میں توبیخ کرنا) عقلمند کے لئے آشکار توبیخ سے کہیں زیادہ سخت ہے"[۲]

حضرت امام جعفر صادق۔"شعرانی" جوکہ پیغمبر کے چاہنے والوں میں سے تھے، خلوت میں بالواسطہ طور پر نصیحت کے ذریعہ انھیں ان کے ناپسند عمل (شرابخوری) کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اچھا کام سب کے لئے اچھا ہے اور تمہارے لئے سب سے بہتر ہے اس انتساب کی وجہ سے جو تم ہم (اہل پیغمبر) سے رکھتے ہو اور برا کام سب کے لئے برا ہے لیکن تم سے سب سے زیادہ برا ہے اس انتساب کی وجہ سے کہ جو تم ہم سے رکھتے ہو"۔[۳]

جسمانی تنبیہ سب سے آخری مرحلہ میں ہے کہ گذشتہ مراحل میں ناکامی کی صورت مینخاص شرائط وحالات پائے جانے کی صورت میں اُس سے استفادہ ہوتا ہے، تنبیہی طریقہ کلی طریقے پر اور جسمانی تنبیہ خاص طور پر صاحبان نظر کے نزدیک محل اختلاف میں ہے، بعض جیسے سعدی و مولوی جسمانی تنبیہ کے طرفدار تھے، اور اس سے استفادہ کو جائز سمجھتے ہیں کہ بعض دیگر جیسے غزالی، بوعلی اور ابن خلدون نے مربی کو جسمانی تنبیہ سے تین بار سے زیادہ یا غصہ کی حالت میں روکا ہے۔[٤]

ماہرین نفسیات کے درمیان بھی بعض جیسے رین اور ہولز خاص شرائط وحالات پائے جانے کی صورت میں تنبیہ سے استفادہ کو رفتار تغییر کے معاملہ میں مفید جانتے ہیں[٥]

۱۔ "عقوبة العقلاء التلويح وعقوبة الجهال التصريح"(میزان الحکمۃ ج ۱ص ۷۲)۔

۲۔ "التعريض للعاقل اشد من عقابه"(میزان الحکمۃ ج ۱ص ۷۲)۔

۳۔ "يا شقر ان انّ الحسن لكل احد حسن وانه منك احسن لمكانك منّا وان القبيح لكل احدٍ قبيح وانّه منك اقبح"(بحار الانوار ج ٤۷ص ۳٤۹ باب ۱۱)۔

٤۔ نقش تربیت معلم، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ۔

٥۔ ہیلگارد: روان شناسی یادگیر ص ۳۳۷۔

اس کے باوجود اکثر ماہرین نفسیات رفتار کی تبدیلی اور تربیت کے لئے تنبیہ سے استفادہ کے مخالف ہیں۔

اسکینر نہایت تاکید کے ساتھ تنبیہ سے استفادہ کو کلی طور پر خطرناک ، نامطلوب اور بے اثر شمار کرتا ہے اور متعدد دلائل بھی اپنے مدعا کے لئے پیش کرتا ہے:[1]

۱۔تنبیہ دوسرے نامطلوب مضر آثار کا پیش خیمہ ہوتی ہے، جیسے عمومی خوف۔

۲۔تنبیہ انسان کو پتہ دیتی ہے کہ کیا کام نہ کرے نہ یہ کہ کیا کام کرے۔

۳۔تنبیہ دوسروں کو صدمہ پہنچانے کی توجیہ کرتی ہے۔

٤۔تربیت پانے والا اگر مشابہ موقعیت میں واقع ہو جائے اور قابل تنبیہ نہ ہوتو ممکن ہے وہ اسی کام کے کرنے پر مجبور ہوجائے۔

٥۔تنبیہ، تنبیہ کرنے والے اور دوسروں کی نسبت پر خاش ایجاد کرتی ہے۔

٦۔تنبیہ عام طور پر ایک نامطلوب جواب کو دوسرے نامطلوب جواب کا جانشین بنادیتی ہے، جیسے بد نظمی کی جگہ رونا۔

اسکینر اس کے بعد تنبیہ کے لئے بہت سی جانشین چیزوں کا ذکر کرتا ہے، جیسے ایسے مقتضیات کی تبدیلی جو نامطلوب رفتار کا باعث ہوتی ہے اور ناموافق رفتار کی نامطلوب رفتار سے تقویت ، آخر میں نتیجہ نکالتا ہے کہ نامطلوب عادات کے ختم کرنے کا بہترین طریقہ انھیں نظرانداز کرنا یا پھر خاموشی (تغافل اسی کے مانند ہے) اسلام کی نظر میں[2] اگر تربیت نچلے درجوں اور طریقوں سے ممکن ہو تو جسمانی تنبیہ سے استفادہ جائز نہیں ہے اور اس کے علاوہ جسمانی تادیب اور تنبیہ (اس شرط کے ساتھ کہ اس حد میں نہ ہو کہ دیت لازم آجائے تو) جائز ہے انسان کے ولی کے علاوہ کی طرف سے بھی اجازت کے ساتھ ہونا چاہئے۔اس کی مقدار بھی محدود ہے (زیادہ سے زیادہ تین سے دس ضرب تک) فقہاء کے فتاویٰ بھی اسی طرح ہیں۔[3]

۱۔ہرگنھان: روان شناسیادگیری ص۱۳۳۔

۲۔البتہ تنبیہ کے موضوع پر اسلام کی فقہی نظر کا استخراج (حکم اولیہ اور ثانویہ کی صورت میں) مستقل فرصت کا محتاج ہے۔

۳۔امام علی رضا : "التادیب ما بین ثلاث الی عشرۃ"مستدرک الوسائل ج۳ص۲٤۸۔تحریر الوسیلۃ ج۲ص ٤۷۷۔

تنبیہ کی نفی پر اسکینر کے اعتراضات کے بارے میں کلی طور پر کہا جاسکتا ہے:

۱۔ بعض ماہرین نفسیات جیسے رین اور ہولز خاص شرائط وحالات کے تحت (جیسے یہ کہ تنبیہ نامطلوب کاموں کے بعد فوراًبلافاصلہ ہو اور اس حد تک ہو کہ انسان کے لئے تکلیف دہ ہو... تنبیہ کو رفتار کی تبدیلی میں موثر جانتے ہیں اور اس سلسلہ میں آزمائشیں بھی کی ہیں۔

۲۔تنبیہ کے ہیجان آور نتائج (جیسے خوف یا پرخاش) کہ اسکینر جس کا ذکر کرتا ہے اس صورت میں منفی ہوجائیں گے جبکہ پہلے سے مربی اور تربیت پانے والے کے درمیان صرف ایک عاطفی ررابطہ رہا ہو کہ تنبیہ کی تاثیر کی شرط بھی اس طرح کے رابطہ موجود ہونا ہے۔

حضرت امیرالمومنین ؑ کے ایک چاہنے والے نے چوری کی تو حضرت نے اُس کے ہاتھ کو قطع کردیا۔ "ابن کوایٔ" جو کہ خوارج میں سے تھا اس نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے سوال کیا: کس نے تمھارے ہاتھ کو قطع کردیا ہے؟ اس نے جواب دیا: میرے ہاتھ کو پیغمبروں کے اوصیاء کے سید وسردار، قیامت کے دن سرخرو حضرات کے پیشوا، مومنین کی نسبت سب سے زیادہ حقدار... نے ابن کواء غصہ میں بولا: وائے ہو تم پر! وہ تمہارے ہاتھ کو قطع کرتے ہیں اور تو ان کی اس طرح مدح وثنا کرتا ہے؟ اس نے جواب دیا: کیونٔتعریف نہ کروں جبکہ ان کی محبت میرے گوشت وخون میں ملی ہوئی ہے، خدا کی قسم میرے انھوں نے ہاتھ کو صرف حق کی خاطر قطع کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ مجھے آخرت کی سزا سے نجات دیں۔[۱]

۳۔تنبیہ ناپسند استعدادوں اور صلاحیتوں کے کنٹرول کرنے اور خاموش کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جن کے بارے میں نرم رویّہ نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوتا ہے، صرف ممکن طریقہ یہ ہے کہ ایک توبیخ وسرزنش یا پھر نفسیاتی جھنجھوڑ ان کے اندر ایجاد کریں، بالخصوص اگر تسلط پسند اور طغیان آمیز طبیعت رکھتے ہوں، جس طرح انسان کے جسم میں بدبودار اور کثیف غدود کو قطع کردیتے یا جلادیتے ہیں تاکہ دیگر حصوں تک سرایت نہ کرے۔ "البرٹ الیس "ان ماہرین نفسیات میں ہے کہ جو اپنے علاج اور مشاورہ میں ناگہانی سرزنش وتوبیخ اور اس کے مانند دوسری چیزوں سے استفادہ کرتا ہے اور ایک جھٹکا دے مشاورہ کے درمیان مراجع کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔

۱۔ بحار الانوار ج۴۰ ص۲۸۲،۲۸۱۔

اسلام کا سزائی اور جزائی نظام بھی جوکہ خاص جسمانی سزائوں پر مشتمل ہے، اپنے حقوقی پہلوئوں کے علاوہ، تربیتی رخ سے بھی قابل توجہ ہے، کیونکہ انسان کو جرم کی تکرار سے روکتا ہے۔

مذکورہ نکات کے علاوہ تنبیہ کے استعمال میں درج ذیل چیزیں اس کی تربیتی تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں:

۱۔ہر قسم کی تنبیہ سے پہلے ناپسند عمل کی علت کی شناخت سے مطمئن ہوں، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مختلف گھریلو اور روحی مسائل ومشکلات کی بنا پر جوکہ ہم پر پوشیدہ ہیں، یہ خطا سرزد ہوگئی ہو، ایسی صورت میں تنبیہ مشکلات اور پیچیدگی کو اضافہ کرتی ہے۔

۲ ۔ وہ تنبیہ مؤثر ہے جو جذبۂ انتقام اور غیض وغضب کی عنوان سے نہ ہو، اس وجہ سے بے جا سرزنش اور حد سے زیادہ تحقیر وتوہین سے پرہیز کیا جانا چاہیئے۔

۳ ۔تنبیہ سنجیدہ اور حسب ضرورت ہو اور میزان خطا سے آگے نہ بڑھ جائے۔ حضرت علی فرماتے ہیں: "ملامت میں زیادہ روی ضد اور ہٹ دھرمی کی آگ کو بھڑکا دیتی ہے"۔[۱]

٤۔تنبیہ انسان کی نامطلوب صفت یا عمل سے دقیق رابطہ رکھتی ہو اور اسے تنبیہ کی علت کی نسبت مکمل آگاہی حاصل ہو۔

٥ ۔اگر انسان اپنے عمل سے شرمندہ وپشیمان ہوگیا اور اپنی رفتار سے باز آگیا تو اسے لطف ومہربانی کے ساتھ قبول کرلینا چاہیئے۔

۱۔ "الافراط فی الملامة یشبّ نار اللجاجة" (غرر الحکم، ج۱، ص۸۸)۔

تیسری فصل:

اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے

۱۔ خود پر ناظر ہونا

یہ روش مکمل طور پر "خود تربیتی" صورت میں انجام پائے گی، اپنے آپ پر نظارت سے مراد یہ ہے کہ انسان کامل ہوشیاری اور مراقبت کے ساتھ قبول شدہ اخلاقی اقدار کی نسبت کوشش کرے کہ جو (جوارحی یا جوانحی) رفتار و کردار اخلاقی فضائل کے منافی ہیں اس کے وجود میں راستہ پیدا نہ کرنے پائیں اور اُس کے اخلاقی ملکات وقوتوں کے زوال اور سستی کا باعث نہ بنیں۔

اپنے آپ پر روش نظارت کے نفسیاتی مبانی میں دو مرحلے قابل تفکیک ہیں: پہلا مرحلہ اس روش کے استعمال سے متعلق ہے کہ تربیت پانے والا شوق اور مقصد کے اعتبار سے باندازۂ کافی آمادگی رکھتا ہو۔[1]

یہ مرحلہ گذشتہ روشوں کی مدد سے بالخصوص اقدار کی طرف دعوت کی روش اور عقلانی توانائی کی تربیت کی روش کے ذریعہ عملی ہونا چاہیے، یعنی ایک شخص اس نظریہ تک پہنچے کہ یہ اقدار اور اخلاقی مقاصد اُس کے وجود میں پائدار رہیں اور اخلاقی رذائل اُس سے مٹ جائیں دوسرا مرحلہ اس روش کی تاثیر کی کیفیت کو واضح کرنا ہے۔ نفسیاتی نظام کے صادرات اور واردات تدریجی صورت میں ہماری وجودی شکل کی تعمیر کرتے ہیں، اور نفس شناسی کی اصطلاح میںہمارے تزکیہ باطن اور ظاہر کو ایک تعادل پسندی کی طرف آگے بڑھاتی ہے، اس وجہ سے واردات وصادرات کی نوع کیفیت پر نظارت (کہ جو ہماری نیّات اور مقاصد کو بھی شامل ہوتی ہے)اس شکل کو جہت دینے میں کہ جو ان کا نتیجہ ہے، مؤثر بلکہ قابل تعیین ہو سکتی ہے۔

۱۔ اخلاقی کتب میں اسے "مقام یقظہ" یعنی مقام بیداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(اسکینرکے)فعال ماحول سازی کے نمونہ میں یہ روش تقریبی طور پر ایک مستقل روش کے عنوان کے تحت تین مرحلہ بیان کی جاتی ہے۔[۱]

۱۔اپنا مشاہدہ: اپنی رفتار کو وقت کے ساتھ جزئی اور کمّی (مقدار ک)لحاظ سیثبت وضبط کرتا ہے۔

۲۔خود سنجی: (اپنے کو تولنا) موجودہ رفتاروں آئیڈیل نمونہ کے ساتھ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے مقایسہ اور موازنہ کیا جاتا ہے۔

۳۔خود تقویتی: (اپنے آپ کو قوت پہنچانا) ایسی رفتار جو ہدف کو زیادہ قریب کرتی ہے اور اُس سے سنخیت رکھتی ہے، اس پر جزا دی جاتی ہے اور اس کے مدمقابل رفتار کو منفی تقویت کے ساتھ اور کبھی تنبیہ کے ذریعہ قابو اور کنٹرول میں رکھا جاتا ہے۔

اس طرح سے رفتاری آثار ونتائج (پاداش اور تنبیہ) سے استفادہ کرنے سے اپنے آپ پر ایک دائمی نظارت اور مراقبت عمل میں آتی ہے دوسرے طریقے جو اسکینر اپنے کنٹرول اور ضبط نفس کے لئے اس سلسلہ میں ذکر کرتا ہے، یہ ہیں: اور اسباب وشرائط کا آسان یا تنگ کرنا (مثال کے طور پر فضول خرچ انسان، اپنی جیب میں کم پیسہ رکھے)، محرومیت، عاطفی شرائط وحالات پر تسلط، تکلیف دہ محرک سے استفادہ (جیسے گھنٹی والی گھڑی) اور دوسرے امور کی انجام دہی۔

مکتب سلوکیت کا نمونہ اسکینر کے نظریہ کے مطابق رفتار کی نظارت اور جانچ معمولی اور کم اہمیت کی حامل ہیں، لیکن ہم اس نمونہ اور توضیح سے بالاترین سطحوں کے لئے اور اپنے آپ پر نظارت کے لئے استفادہ کرسکتے ہیںّاورنیّات، اہداف ومقاصد حتی کہ اپنی رفتار وکردار کی خوبیوں پر کنٹرول کرسکتے ہیں۔ اخلاقی کتابوں میں یہ روش بہت زیادہ مورد توجہ رہی ہے اور اس سے متعلق مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔[۲] ان کتابوں میں مراقبہ، محاسبہ یا مرابطہ مرزبانی]دشمن سے سرحد کی حفاظت[کے عناوین کے تحت یہ بحث کی گئی ہے۔[۳]

---

۱. Psychoegyobhelthp.103; 10k

۲۔جیسے ان کے محاسبۃ النفس از سید ابن طائوس اور محاسبۃ النفس کفعمی)

۳۔اخلاقی تربیت کی روش میں عرفاء شیعہ نے آخری دوسو سال میں (ملاحسین قلی ہمدانی، میرزا علی آقا قاضی، مرحوم بہاری، حاج میرزا جواد تبریزی، مرحوم علامہ طباطبائی اور امام خمینی تک نے)اپنے آپ پر نظارت (مراقبہ ومحاسبہ) کی روش پر بہت تاکید کی ہے اور اسے اپنے سلوک کی بنیاد قرار دیا ہے۔

"... ابو حامد بندوں کے درمیان صرف صاحبان بصیرت جانتے ہیں کہ خداند عزوجل ان کا محافظ اورنگراں ہے اور محاسبہ میں دقت سے کام لیا ہے اور ان کی نسبت بہت جزئی امور میں بھی سوال اور بازپرس کرتا ہے، لہٰذا یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان امور سے نجات کا راستہ محاسبہ اور مراقبہ کے لزوم کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ کہ نفس کو حرکات اور لحظات کی نسبت جانچتے رہیں، لہٰذا جو اپنے نفس کو روز قیامت کے حساب وکتاب سے پہلے مورد محاسبہ قرار دے تو اُس دن اُس کا حساب آسان اور سوال کے وقت اُس کا جواب آمادہ ہوگا اور نتیجہ نیک اور اچھا ہوگا۔ اور جو کوئی اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے گا اس کی حسرت دائمی اور قیامت کے مواقف میں اُس کا توقف طولانی ہوگا اور اس کی برائیاں ا سے ایسی ذلت وخواری کے گڑھے میں ڈھکیل دیں گی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ خداوندعالم کی اطاعت کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور اُسی نے صبر مرزبانی کا حکم دیا ہے:

(یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوْا۔۔۔)۔[1]

"اے صاحبان ایمان تم لوگ صبر کرو، صبر کی تعلیم دو اور مرابطہ یعنی دشمن سے جہاد کے لئے تیاری کرو..." لہٰذا تم مرابطہ ومرزبانی کرو پہلے مشارطہ کے ذریعہ اس کے بعد مراقبہ کے ذریعہ پھر محاسبہ اور پھر معاقبہ (سزا دینے) کے ذریعہ پھر اس کے بعد مجاہدہ اور معاتبہ (عتاب کرنے) کے ذریعہ..."[2] اس لحاظ سے ایک دوسرے رخ سے بھی اپنے آپ پر نظارت اور نگرانی کا لزوم معلوم ہوا، محاسبۂ اعمال کردار کے تولنے کے لئے موازین قسط کے قرار دینا، قیامت کے دن حساب وکتاب کرنا اور ہمارے نامہ اعمال میں ان کے جزئیات کو ضبط کرنا کہ جن کو ہر شخص واضح طور پر دیکھے گا، ان سب باتوں کے قطعی ہونے کے پیش نظر محاسبہ اوراعمال پر نظارت کے لزوم کے سلسلہ میں کوئی تردید نہیں رہ جاتی اورخداوند اس سے کہیں زیادہ کریم ہے کہ اپنے بندوں سے دوبارہ حساب کا مطالبہ کرے۔ قرآنی آیات اس سلسلہ میں بہت زیادہ واضح ہیں: "ہم عدل وانصاف کا ترازو قیامت کے دن قرار دیں گے، پس کسی نفس پر بھی کسی چیز میں ستم نہیں جائے گا، اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا اُسے ہم لے آئیں گے اور ہم سب کا حساب کرنے کے لئے کافی ہیں"۔[3] "اور جب نامۂ اعمال سامنے رکھا جائے گا، اُس وقت مجرمین کو اپنے نامۂ اعمال کے مندرجات سے خوفزدہ دیکھوگے اور وہ کہیں گے: اے ہم پروائے ہو، یہ کیسا نامۂ اعمال ہے کہ جس میں کوئی]کام[چھوٹا ہو یابڑاچھوڑا نہیں گیاہے، بلکہ سب کو جمع کرلیاہے اور جو کچھ انھوں نے انجام دیا ہے وہ سب اس میں موجود پائیں گے اور تمہارا رب کسی پر ستم روا نہیں رکھتا"۔[4] اپنے آپ پر نظارت کے طریقے درج ذیل ہیں:

۱۔ سورہ آل عمران آیت ۲۰۰۔ ۲۔ احیاء العلوم، غزالی ج۴ص ۴۱۷، ۴۱۸۔ ۳۔ سورہ أنبیاء آیت ۴۷۔ ۴۔ سورہ کہف آیت ۴۹۔

الف۔توبہ:

اپنے آپ پر نظارت کی روش میں جب بھی انسان اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہے تو عام طور پر اپنے صحیفۂ اعمال کو اخلاقی رذائل سے آلودہ دیکھتا ہے۔ ایسی صورت میںاگر ان برائیوں سے الگ اورجدا ہونے کی کوئی راہ اورامید نہ ہو تو انسان بدبختی اور شقاوت کے بھنور میں مکمل طور پر پھنس جائے گا، اورنا امیدی اور رذائل کے ہلاکت بار گڑھے میں گرجائے گا، اس کے علاوہ روحی اور نفسیاتی اعتبار سے گناہ کے اندر اسی حالت پیدا کرتا ہے کہ اگر رذائل نہ ہوں تو آئندہ مواقع پر اور بھی زیادہ گناہوں کے ارتکاب کرنے پر آمادہ ہوجاتاتا ہے۔ اس وجہ سے اپنے اعمال کی غیر ارادی بنیادوں کے لحاظ سے ضروری ہے جیساکہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں:

"جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اُس کے دل میں سیاہ نقطہ ایجاد ہوجاتا ہے، پس اگر توبہ کرلیتا ہے تو مٹ جاتا ہے اوراگروہ گناہ جاری رکھا تو سیاہی اس کے پورے دل کوڈھانپ لیتی ہے اور کامیابی کی راہ مسدود ہوجاتی ہے"۔[۱]

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ "گناہ" کے مختلف مفاہیم ہیں:

نافرمانی اور بے وفائی کا احساس، اپنے آپ کو صدمہ پہنچانا، روح کو خراش لگانا اور سزا کا مستحق ہونا۔ اگر یہ احساس گناہ انسان کی روح پر غالب آجائے اور سلسلہ باقی رہے، تو ذہنی افسردگی کا پیش خیمہ ہوگا اور انسان کو ہر قسم کی اپنی معنوی تعمیر اور اخلاقی فضائل کسب کرنے سے روک دے گا، اس وجہ سے توبہ اپنی ازسرِنو تعمیر کے لئے دوبارہ بازگشت کوکہتے ہیں، وہ تجدید اعمال کے لئے صاف وروشن نامۂ اعمال کے ہمراہ رحمت خداوندی کی امیدوار، منقلب، پختہ ارادہ کی مالک تعمیر کرتی ہے اوریہ توبہ وہی خدا کا لطف اوراس کی رحمت ہے، حضرت امام جعفر صادق۔کے بقول "توبہ اللہ کی رسی اور عنایت ربوبی ہے، لہٰذا بندے ہمیشہ توبہ کی کوشش کریں اور ہر گروہ کا ایک خاص توبہ ہے......"۔[۲]

۱۔ "اذا أذنب الرجل خرج فی قلبه نقطة سوداء فان تاب انمحت وان زاد زادت حتّی تغلب علی قلبه فلا یفلح بعدها ابداً"(کافی ج۲ص ۲۷۱)۔

۲۔ مصباح الشریعۃ ص ۹۷۔

توبہ درحقیقت اپنے اوپر نظارت ہے۔ حضرت علی- فرماتے ہیں: "اپنے نفس سے جہاد کرو اورتوبہ کو مقدم رکھوتاکہ اپنے رب کے مقام طاعت تک پہنچ جائو"۔[1]

یہاںپرتوبہ سے مرادراہ خطا اور عمل خلاف سے حسرت وندامت کے ساتھ واپس آنا ہے، یہ حسرت وندامت ہی کی آگ ہے جو اخلاقی گراوٹ اور پستی سے پاکسازی کے لئے راہ ہموار کرتی ہے اورایسا سوز وگذار ہے کہ جو انسان کے ذہن میں عفو و بخشش کا مزہ شیریں بناتی ہے اورطراوت، تازگی، طہارت وپاکیزگی کو انسان کے اندر وجود بخشتی ہے، ہر ابتدا اور ہر قدم کے لئے اپنی تربیت کے سلسلہ میں توبہ لازم ہےتاکہ وہ انسانی عزّت وکرامت کا احساس واپس آجائے، " اپنے متعلق اپنے قیمتی تصوّرات کا مشاہدہ کرے اور اخلاقی تربیت کے لئے آمادہ ہوجائے۔

"گناہوںکے اشجار کو اپنے قلب ونگاہوں کے سامنے قراردیتے ہیں اورآب ندامت سے اُس کی آبیاری (سینچائی) کرتے ہیں، پھر صحت وسلامتی، رضا وکرامت کا پھل حاصل کرتے ہیں"۔[2]

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"جب کوئی بندہ واقعی (نصوح، خالص) توبہ کرتا ہے تو خدا کا محبوب ہوجاتا ہے اورخداوندعالم دنیا وآخرت میں اس کے گناہ کو پوشیدہ کردیتا ہے...... وہ دو فرشتے جو نامہ اعمال کو ثبت کرتے ہیں انھیں غافل بنا دیتا ہے اور اعضا وجوراح کو حکم دیتا ہے کہ اس کے گناہوں کو مخفی رکھیں اور زمین کے مختلف حصوں سے کہتا ہے کہ وہ سارے گناہ جو تم پر انجام دئے ہیں انھیں نظر انداز کردو، پھر خدا سے وہ ایسی حالت میں ملاقات کرتا ہے کہ ایسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جو اس کے گناہوں کی گواہی دے"۔[3]

حضرت علی فرماتے ہیں: "توبہ دلوں کو پاک کرتی ہے اورگناہوں کو دھودیتی ہے"۔[4]

۱۔ غررالحکم۔

۲۔ بحار الانوارج۷۸ ص۷۲۔

۳۔ کافی ج۲ص۴۲۳۔

٤۔ "التوبۃ تطہر القلوب وتغسل الذنوب"۔(غرر الحکم، فصل۵،ص۱۹۵)۔

امام خمینی بھی توبہ کے بارے میںبیان کرتے ہیں:

توبہ نام ہے نفس کا مادیت روحانیت کی طرف رجوع کرنے کا، جبکہ گناہوں اور نافرمانی کی کدورت کے ذریعہ روحانیت (معنویت) اورنورانی فطرت، طبیعت کی ظلمت میں محجوب ہوجاتی ہے۔ اور اس اختصار کی تفصیل یہ ہے کہ نفس ابتدائے فطرت میں ہر طرح کے کمال، جمال، نور اور درخشندگی اور چمک دمک سے خالی ہوتا ہے، جس طرح سے کہ ان کے مقابل ومخالف صفات سے بھی خالی ہوتا ہے، گویا ایک ایسا صفحہ ہوتا ہے جو مطلق نقوش سے خالی ہوتا ہے، جس میں نہ کوئی روحانی اور معنوی کمالات پائے جاتے ہیں اورنہ ہی صفات اضداد سے متصف ہوتا ہے۔ لیکن ہر مقام و منصب کے حصول کی استعداد ولیاقت کا نور اُس میں بطور ودیعت رکھا گیا ہے اور اس کی فطرت استقامت پر ہے اور اس کا خمیر انوار ذاتیہ سے گوندھا ہوا ہے اورجب معاصی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے ذریعہ اُس کے دل میں ایک کدورت پیدا ہوجاتی ہے اورگناہ جس قدر زیادہ ہوتے ہیں، کدورت اور ظلمت بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ دل بالکل ہی تاریک اور ظلمانی ہوجاتا ہے (یعنی گناہوں کی کثرت سے دل میں سیاہی اور ظلمانی پردہ حائل ہوجاتا ہے پھر اُس پر کوئی بات اثر نہیں کرتی) اور نور فطرت خاموش ہوجاتا ہے اور ابدی شقاوت وبد بختی تک پہنچ جاتا ہے، اگر ان حالات کے دوران، دل کے تمام صفحہ پر ظلمت کے چھانے سے قبل خواب غفلت سے بیدار ہوجائے توپھر بیداری کی منزل کے بعد توبہ کی منزل میں وارد ہو جاتا ہے اور طبیعی کدورت اصلی نور فطرت اور ذاتی معنویت کی طرف واپس ہوجاتی ہے گویا کہ تمام کمالات اور اس کی اضداد سے خالی ایک صفحہ ہوجاتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے: "التائب من الذنب کمن لاذنب لہ۔۔۔"۔گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کے مانند ہے۔ (۱)

اس بات کے لئے کہ انسان توبہ کرے اورمایوسی وناامیدی اس پر غالب نہ آئے، توبہ کی طرف دعوت دینے والی آیات کو پے درپے پڑھنا چاہئے اور یہ جاننا چاہئے کہ خداوندعالم کی عفو و بخشش اور رحمت ورأفت کا دامن نہایت وسیع ہے:

(وَتُوبُوا اِلَی اللهِ جَمِیْعاً اَیُّهَا المؤمِنُونَ لَعَلَّکُم تَفْلِحُون)(۲)

"اور اے صاحبان ایمان! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہو کہ شاید اسی طرح تمھیں فلاح اور نجات مل جائے"۔

۱۔ چہل حدیث ص ۲۳۱، ۲۳۲۔

۲۔ سورہ نور آیت ۳۱۔

(قُل يَا عِبَادِیَ الَّذِيْنَ اسْـــرِفُوا عَلیٰ أنفسِـــهِمْ لَا تَقْنُطُوا مِن رَحْمَةِ اللّٰہِ اِنَّ اللہَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيْعاً اِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيْمِ۔) (١)

"پیغمبر! آپ پیغام پہنچادیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا، بے شک اﷲ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا ہے اور وہ یقینا بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے"۔

(يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا تُوبُوا اِلَی اللّٰہِ تَوبَةً نَّصُوحاً عَسیٰ رَبُّكُم اَنْ يُكَفِّرَ عنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ) (٢)

"اے ایمان والو! خلوص دل کے اﷲ سے توبہ کرو عنقریب تمھارا پروردگار تمھاری برائیوں کو مٹادے گا"۔

ان باتونکو بھی جان ودل سے سماعت فرمائیں:

...بالفرض اس فرض کی بنیاد پر ہے کہ اہل نجات اور اس کی عاقبت سعادت ہو پھر بھی اُس عالم میں گناہوں کی تلافی کوئی آسان کام نہیں ہے، پہلے شدائد، زحمات ومشکلات کا برداشت کرنا ضروری ہے تاکہ انسان شفاعت کے قابل بنے اور ارحم الراحمین کی رحمت اُس کے شامل حال ہوجائے، پس اے عزیز!جتنا جلدی ممکن ہو کرہمت کس لو اورعزم کو محکم اور ارادہ کو قوی کرلو اورگناہوں سے توبہ کرو کیونکہ ابھی جوانی کی عمریا دنیاوی زندگی میں ہو، اور خداداد فرصت کو ہاتھ سے نہ گنوائو اور شیطانی دھوکوں اور نفس امارہ کی چالوں پر توجہ نہ دو۔ (٣)

فرعون کے جادوگروں نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا اور توبہ کرلیا اوربارگاہ الٰہی کے مقربین کے درجہتک پہنچ گئے ابراہیم ادہم، فضیل بن عیاض، حربن یزیدریاحی، جابر جعفی اوربدھ واقعی منقلب ہونے والوں کے نمونے ہیں۔

توبہ کرن یکے بعد اس کے استحکام کے لئے اور گذشتہ گناہ کی تکرار نہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ درج ذیل باتوں کو یاد رکھیں:

پیغمبر اکرم نے فرمایا: "گناہ سے توبہ یہ ہے کہ پھر اس کی طرف واپس نہ آئے"۔ (٤)

١۔ سورہ زُمر آیت ٥٣۔

٢۔ سورہ: تحریم آیت ٨۔

٣۔ چہل حدیث ص ٢٣٣، ٢٣٤۔

٤۔ نہج الفصاحۃحدیث ١٢١١۔

"خداوند سبحان کے نزدیک توبہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی اور جہالت کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کرلیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں کہ خداوند کریم ان کی توبہ قبول کرتا ہے، اور خداوند متعال علیم دانا اور حکیم ہے"۔[۱]

"وہ لوگ وہ ہیںکہ جب برا کام کرتے ہیں، یا اپنے نفس پر ستم کرتے ہیں تو خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت چاہتے ہیں، کون ہے خدا کے سوا جو گناہوں کو بخش دے؟ اورجو گناہ وقصور (ناگہانی) کربیٹھے ہیں اس پر جان بوجھ کراصرار نہیں کرتے "۔[۲] تمام متعلق اور مربوط امور میں اصلاح اور تبدیلی: "مگر جن لوگوں نے توبہ کیا اور اپنے عمل کی اصلاح کی اور خدا سے تمسک رکھا اور اپنے دین کو خدا کے لئے خالص طور پر اختیار کیا تو نتیجہ کے طور پر وہ لوگ مومنین کے ساتھ ہوں گے اور عنقریب خداوند عالم مومنین کو اجر عظیم جزا دے گا"۔[۳]

خود کو خدا کے حضور میں تصور کریں اوریہ جانیں کہ خدا ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے:

ایک حبشی شخص رسول اکرم کی خدمت میں آیا اوربولا: اے رسول خدا! میں ایک بُرے کام کا مرتکب ہوا ہوں، آیا میرے لئے توبہ ہے؟ فرمایا: ہاں۔ پھر وہ چلا گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آکربولا: اے رسول خدا! آیا اس وقت خدا نے مجھے دیکھا ہے؟ فرمایا: ہاں، پھر اُس حبشی نے اس طرح چیخ ماری کہ روح اس کے جسم سے نکل گئی۔[٤]

آخری نکتہ:

توبہ کے بعد اپنے آپ پر نظارت اور تحفظ کے لئے اپنے آپ سے عہد کرے اور مشارطہ کرے۔

مشارطہ یہ ہے کہ پہلے دن مثال کے طورپر اپنے آپ سے شرط کرے کہ آج خداوند عزوجل کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا اور اس بات کا عزم بالجزم کرے اور معلوم ہے کہ ایک دن خلاف ورزی نہ کرنا، بہت آسان امر ہے اور انسان آسانی سے عہدہ برآہو سکتا ہے، تم عازم ہوکر شرط کرو اور تجربہ کروتودیکھو گے کہ کتنا آسان ہے۔ ممکن ہے کہ شیطان اور اُس ملعون کا لشکر تم پراس امر کو بہت سخت دکھائے، لیکن یہ اُس ملعون کا دھوکا ہے۔ اُس پر دل سے حقیقتاً لعنت کرو اور باطل اوہام وخیالات کو دل سے نکال دو اور ایک دن تجربہ تو کرو، اس وقت اس کی تصدیق کروگے۔[۵]

۱۔ سورہ نٔسائ آیت ۱۷۔ ۲۔ سورہ آل عمران آیت ۱۳۵۔ ۳۔ سورہ نٔساء آیت ۱٤٦۔ ٤۔ احیاء العلوم، ابو حامد غزالیج ٤ص ۱۵۔ ۵۔ چہل حدیث ص ۸۔

یہ مشارطہ اور معاہدہ کلی طور پر ہفت گانہ اعضا (آنکھ، کان، زبان، شکم، دامن، ہاتھ اور پائوں) کے ساتھ ہو یا یہ کہ ایک ایسی خالص اخلاقی رفتار یا خاص صفت سے متعلق ہو کہ انسان جس سے دوچار ہے،، بہتر ہے کہ یہ مشارطہ پہلے ہی دن انجام دیا جائے۔

ملا مہدی نراقی اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت تمثیل پیش کرتے ہیں:

"جان لو کہ عقل آخرت کی راہ میں ایک تاجر کے مانند ہے جس کا سرمایہ اور پونجی عمر ہے اور اُسے وہ نفس کی مدد سے استعمال کرتا ہے کہ اس لحاظ سے عقل کے شریک کی مانند ہے کہ اُس کے مال میں تجارت کرتا ہے اور اس تجارت کا فائدہ اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ کا حصول ہے کہ انسان کو دائمی سعادت اور ابدی نعمت کی جانب راہنمائی کرتے ہیں۔ اُس کا نقصان اس صورت میں ہے کہ اس سے ایسے گناہ سرزد ہوں کہ جو دوزخ کے دردناک عذاب تک منتہی ہوجاتے ہیں... اور اس تجارت کی مدت پوری عمر ہے۔ جس طرح تاجر کی ابتدا میں اپنے شریک سے مشارطہ ومعاہدہ کرتا ہے پھر اس کا مراقب اور نگران ہوجاتا ہے اور آخر میں اس کا محاسبہ کرتا ہے اور ممکن ہے کہ اُس سے تاوان بھی مانگ لے، اسی طرح عقل کو بھی اپنی نفس کے ساتھ مشارکت میں ان امور کی رعایت کرنی چاہئے"۔[۱]

ب۔مراقبہ:

امام خمینی اس کی توضیح میں فرماتے ہیں:

"... ایسا ہے کہ تمام شرط کی مدت میں اس پر عمل کرنے کی طرف متوجہ رہو اور خود کو اُس پر عمل کرنا لازم سمجھو اور اگر خدانخواستہ تمھارے دل میں خیال آئے کہ ایسے کے مرتکب ہو رہے ہو جو کہ حکم خداوندی کے خلاف ہے تو جان لو کہ یہ شیطان اور اس کے لشکر کی طرف ہے وہ چاہتے ہیں کہ جو تم نے شرط کی ہے اُس سے روک دیں اُن پر لعنت کرو اور اُن کے شرّ سے خدا کی پناہ مانگو اور باطل خیال کو دل سے نکال دو اور شیطان سے کہو کہ ایک دن میں نے خود سے شرط کی ہے کہ خدا کے حکم کے خلاف نہ کروں لیکن ولیِّ نعمت نے سالوں سال سے مجھے نعمت دی ہے، صحت، سلامتی اور امنیت مرحمت فرمائی ہے کہ اور اس نے مجھ پر ایسے لطف کئے ہیں کہ اگر تاابد اس کی خدمت کروں تب بھی ان میں سے کسی ایک کا حق ادا نہیں کرسکتا، لہذا مناسب نہیں ہے کہ ایک معمولی سی شرط کو بھی وفا نہ کروں... یہ مراقبہ تمہارے کاموں میں بھی جیسے کسب اور کمائی، تعلیم وتعلم اور مسافرت، کسی ایک سے بھی منافات نہیں رکھتا ہے اور اسی حال پر رات تک باقی رہو کہ وہ محاسبہ کا وقت ہے...۔[۲]

۱۔ جامع السعادات ج۳ص۹۳۔ ۲۔ چہل حدیث ص۸۔۹۔

حضرت حضرت علی فرماتے ہیں: "سزاوار ہے کہ انسان اپنے نفس پر حاکم، قلب کا نگراں اور زبان کا محافظ ہو"۔[1]

حضرت امام حسین نے فرمایا: "تین چیزیں اگر ہر مومن میں پائی جائیں تو وہ خدا کی پناہ میں ہے... (تیسرے یہ کہ) اپنے نفس سے محاسبہ کرے اور اُس وقت تک اپنے ہاتھ پائوں کو حرکت نہ دے جب تک یہ نہ جان لے کہ خدا کی راہ میں قدم اٹھایا ہے یا اُس کی نافرمانی کی راہ میں اور یہ کہ اپنے بھائی کے کسی عیب پر ملامت نہ کرے مگر یہ کہ خود اُس کا ترک کرنے والا ہو"۔[2]

حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"اُس بندہ پر آفرین ہو جو اپنے نفس سے جہاد کے لئے قدم اٹھائے، جو انسان ہوائے نفس کے سپاہیوں کو مغلوب بنادے اُس نے رضائے خداوندی کا راستہ پا لیا ہے اور جس شخص کی عقل کوشش وتلاش کے ساتھ نفس امارہ پر غلبہ کرے اور خضوع وخاکساری کے ساتھ عقل کی خدمت میں پہنچے تو اس نے عظیم کامیابی حاصل کی ہے، خود نفس اور ہوائے نفس سے زیادہ تاریک اور وحشتناک خداوند متعال اور بندہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے اور اُس سے مقابلہ کے لئے خدا کی درگاہ میں احتیاج اور اس کے لئے خضوع وخشوع، دن میں بھوکا اور پیاسا رہنے اور تہجد کے علاوہ کوئی تیزتر اسلحہ نہیں ہے، لہٰذا اگر راہ جہاد میں مرگیا تو وہ شہادت کے درجہ پر فائز ہوگا اور اگر زندہ رہ گیا اور ثبات وپائداری کا ثبوت دیا تو نتیجہ میں "رضوان اکبر" کے حاصل کرے۔ خداوند عزّوجل فرماتا ہے:

(وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُم سُبُلَنَا، وَاِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ)۔[3]

""اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقینا اللہ حسن عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

۱۔ غرر الحکم۔

۲ بحار الانوار ج۷۸ص ۱٤۱۔

۳۔ سورہ عنکبوت آیت ٦۹۔ المحجۃ البیضاء ج۸ص ۱۷۰۔

لہٰذا مراقبہ اعضائے ہفتگانہ کے عمل کرنے کے وقت انسان کا فعّالانہ حضور ہے، عمل سے پہلے فکر و تامل کے ساتھ اپنی نیت اور مقصد کی نسبت توجہ اور مراقبت کرے، عمل کے وقت مراقبت کرے کہیں کہ ایسا نہ ہو کہ اخلاقی اقدار اور الٰہی تعلیمات کے خلاف کوئی عمل اُس سے سرزد ہوجائے اور عمل کے بعد بھی مراقبت کرے کہ اس کے خاص آثار جیسے ریا، منّت، اذیت وغیرہ اس سے صادر ہوکر عمل کو ضائع نہ کریں یہاں پر اگر اس کی نظر میں کوئی خاص اخلاقی صفت ہو تو وہ مراقبہ کو اسی صفت پر یا اس کے مناسب اعمال پر مرکوز کردے، اس لحاظ سے اپنے آپ پر نظارت کا اساسی مرحلہ یہی مراقبہ ہے۔

مراقبہ کے سلسلہ میں اہم نکتہ یہ ہے کہ آغاز امر میں اپنے اوپر زیادہ سختی نہیں کرنی چاہئے اور عمل کے جزئیات اور ظرائف کو بھی انجام نہیں دینا چاہئے، یہ رویہ موجب ہوگا کہ اُس کی سختی اُسے اس عظیم جہاد سے روک دے گی، آغاز کار میں اُسے چاہئے کہ صرف اپنے بارے میں حلال وحرام کے سلسلہ میں نفرت کا اظہار کرے یا ایک اخلاقی رذیلت کی نسبت اپنا محاسبہ کرے تاکہ بعد کے مراحل میں خلوص نیت اور اُس سے بالاتر مراقبہ مراتب پر عمل کرے۔

توجہ رکھنی چاہئے کہ خداوندعالم پر ایمان کی پشت پناہی کے بغیر مراقبہ بہت دشوار اور مشکل ہے، ایک بصیر وناظر کے حضور پر یقین واعتقاد ہی مراقبہ کو آسان کرتا ہے اور یہ بات ایمان کی تربیت سے حاصل ہوتی ہے۔

ج۔ محاسبہ:

یعنی کوئی وقت معین کرے (بہتر ہے کہ سونے سے قبل ہو) اور روزانہ کے اعمال کا حساب وکتاب کرے، اگر یہ محاسبہ انجام نہ پائے تو اپنے آپ پر نظارت اور مراقبہ آئندہ ایام میں عملی طور پر ممکن نہیں ہوگا۔

"اے صاحبان ایمان! خدا سے ڈرو اور ہر انسان کو غور کرنا چاہئے کہ اپنے کل (آئندہ) کے لئے پہلے سے کیا بھیجا ہے"۔[۱]

"تم لوگ اپنے دل کی باتوں کو ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو، خدا تمہارا ان سب کے سلسلہ میں محاسبہ کرے گا"۔[۲]

"حضرت ابراہیم کے صحیفوں میں اس طرح مذکور ہے: عقلمند انسان جب تک کہ اس پر اس کی عقل حاکم ہے اس کو چاہئے کہ اپنے لئے چار اوقات معین کرے... اور ایک ساعت اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کے لئے معین کردے"۔[۳]

۱۔ سورہ حشر آیت ۱۲۔

۲۔ سورہ بقرہ آیت ۲۸٤۔

۳۔ بحار الانوار ج ۷۷ ص ۷۱۔

"اپنے نفس کو محاسبہ کے ذریعہ کنٹرول کرو اور اس (نفس) کی مخالفت کرکے اُس کے مالک ہوجائو"۔[1]

"اپنے نفس کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے اور خود کو بھاری اورہلکا کرو قبل اس کے کہ اس کا وزن دیکھیں اور اپنے اعمال کو پیش کرنے کے لئے آمادہ ہوجائو"۔[2]

عاقل انسان کے لئے مناسب ہے کہ اپنی برائیوں کا دین، اعتقاد، اخلاق وادب کے اعتبار اپنے نزدیک حساب کرے پھر انھیں سینوں میں یا کسی کاغذ پر محفوظ کرے اور ان کی اصلاح کرے۔

محاسبہ کی ترکیب اس طرح ہے کہ دن کی ابتدا سے شروع کرے اور جوکچھ اُس سے اعمال سرزد ہوئے ہیں ان کی جانچ کرے کہ آیا اخلاقی معیار کے مطابق ہیںؐیا نہیں ؟ آیااُن کے اندر خدا کی رضایت اور خوشنودی پائی جاتی ہے... ؟ حضرت امیر المومنین علیؑ سے سوال کیا گیا: انسان کس طرح اپنا محاسبہ کرے؟ فرمایا:

"جب صبح کو بیدار ہو تواُس وقت سے عصر تک اپنے نفس کی طرف رجوع کرے اور کہے: اے نفس! آج کا دن ایسا دن تھا جو تم پر گذر گیا اوردوبارہ کبھی واپس نہیں آئے گا اور خدا اُس سے متعلق تم سے بازپرس کرے گا کہ تم نے اس کو کس طرح سے گذارااور اس میں کونسا عمل انجام دیا آیا خدا کی یاد اوراس کے شکرانہ میں مشغول تھے؟ آیا اپنے مومن بھائی کا حق ادا کیا؟ آیا اس کی مشکلات کو برطرف کیا؟ آیا اس کی غیبت میں اُس کے اہل وعیال کی سرپرستی کی؟ آیامرنے کے بعد اُس کے ورثاء کی نسبت مہربان رہے ہو؟ آیا اپنی موقعیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برادرمومن کی غیبت سے روکا ہے؟ آیا کسی مسلمان کی مدد کی ہے؟ اس دن تم نے کیا کیا؟ پھر دل میں سوچے جو کچھ اُس سے سرزد ہوا ہے: اگر نیک اور خیر کام تھے، تو خدا کی حمد وستائش کرے اور اس توفیق پر اس کی تعریف وتمجید کرے۔ اگر گناہ اورکوتاہی اُس سے سرزد ہوئی تو خدا سے طلب مغفرت کرے اوراُ سے ترک کرے اورتوبہ کرے۔اخلاقی تربیت سے متعلق محاسبہ نفس بہت سے آثاراور فوائد کا حامل ہے کہ ان میں سے بعض فوائد اپنے ناپسند صفات و عیوب سے واقف ہونا اور گناہوں سے خالی ہونا اور اصلاح وسعادت کی راہ ہموار ہیں۔

اسی طرح بھولنا نہیں چاہئے کہ اگر محاسبہ کچھ سخت معلوم ہو، تو اُس پر مجاہدہ (جہاد بالنفس) کے ذریعہ غالب آجانا چاہئے اور اس کے آثار و فوائد کے بارے میں غور کرنا چاہئے۔ پھر کچھ مدت بعد روزانہ ایٹومیٹک صورت میں دن بھر یہ محاسبہ اور مراقبہ انجام پائے گا اور رات کے لئے کوئی کام نہیں رہ جائے گا۔

۱۔ غرر الحکم۔ ۲۔ بحار الانوار ج۷۰ ص۷۳۔

امام موسیٰ بن جعفر نے فرمایا ہے:

"جو شخص روزانہ اپنا محاسبہ نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے، لھٰذا اگر اُس نے کوئی اچھا اور نیک کام کیا ہے تو خدا سے اس کی زیادتی کی دعا کرے اور اس کی حمدو ستائش کرے اور اگر برا کام کیا ہے تو خدا سے مغفرت طلب کرے اور اس کی بارگاہ میں توبہ کرے"۔ [۱]

د۔ معاقبہ:

محاسبہ کے بعد قانون تقویت (فعال ماحول سازی) کے مطابق ان مقامات پر جہاں انجام دیئے گئے اعمال اخلاقی معیار کے مطابق تھے اس کے لئے ایک جزا معین کرے (جیسے مناسب تفریح وگردش، اچھی غذا...) اور اگر اس کے برخلاف ہو تو اُس کے لئے مناسب سزا تجویز کرے، جیسے یہ کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو سرزنش اور ملامت کرے اس کے بعد مشقت آمیز اعمال کو برداشت کرے؛ جیسے روزہ رکھے یا خود کو وقتی طور پر بعض لذیذ چیزوں اور عطیوں سے محروم کرے۔ان موارد میںٹبرے عمل سے مشابہت کا لحاظ کیا جاسکتا ہے؛ مثال کے طور پر حرام غذائوں سے پرہیز نہ کرنے کے سلسلہ میں، خودکو بھوکا رکھے اور نا محرم کی طرف نگاہ کرنے کے سلسلہ میں بعض پسندیدہ اور محبوب امور کو دیکھنے سے اپنی آنکھ کو (جیسے ایک جالب نظر فیلم دیکھنے سے) دور کرے اور اگر زبان سے متعلق ہو تو اُسے سکوت کے ذریعہ سزادے اور اگر کسی کو رنج پہنچایا ہو تو اس کے پاس جائے اور اُس سے عذر خواہی کرکے اپنے آپ کو ذلیل و خوار کرے....۔ مجازات معاقبہ پر جو کہ جہاد اکبر ہے ضرور بالضرور عمل کریںٹورنہ انسان کے لئے برے اعمال اور اخلاقی رذائل آسان ہو جائیں گے اور وہ اُن سے اس حدتک مانوس ہو جائے گا کہ اس کا ترک کرنا مشکل اور دشوار ہو جائے گا۔ حضرت علی۔ نے فرمایا: "سب سے بڑا جہاد نفسانی خواہشات سے مقابلہ کرنا اور ا سے دنیاوی لذّتوں سے بازرکھنا ہے"۔ [۲]

"جان لو کہ جہاد اکبر نفسانی خواہشات سے مقابلہ کرنا ہے لہٰذا اس جہاد میں مشغول رہو تاکہ کامیابی کی سعادت نصیب ہو"۔ [۳]

آخر میں دوباتوں کی یاددہانی ضروری اور لازم ہے: اوّل یہ کہ اپنے آپ پر نظارت کی بحث میں آداب ورسوم (عرفی عادات) اصول اور افعال اخلاقی کے درمیان فرق رکھنا چاہئے: اول کلیت نہیں رکھتے لہٰذا ان کی ہمیشہ مراعات کرنا ضروری نہیں ہے ؛ بر خلاف دوسرے کے۔دوسرے یہ کہ تقویت ارادہ کی ترکیبوں سے استفادہ کرنا اپنے آپ پر نظارت کرنے کی کامیابی میں بہت زیادہ موثرہے۔

۱۔ بحار الانوار، ج۷۰، ص۷۳۔ ۲۔ غرر الحکم، فصل ۱، ص۱۴۲۔ ۳۔ غرر الحکم، فصل ۷، ص۲۲۶۔

۲:۔ ایمان کی تربیت

ایمان ایک قلبی حالت اور روحی اثر ہے کہ جس کی تاثیر افکار، احساسات اور اعمال میں آشکار ہوتی ہے۔ حضرت امام محمد باقر فرماتے ہیں:

"الایمان ما کان فی القلب والاسلام ما علیه التناکح والتوارث "[1]

"ایمان وہ ہے جو دل میں ہوتا ہے اور اسلام وہ ہے جو جس پر تناکح وتوازث ہوتا ہے"۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا:

"الایمان قول مقول وعمل معمول وعرفان العقول "۔[2]

"ایمان وہ قول جو بولا جاتا ہے اور وہ عمل ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے اور عقلوں کی معرفت ہے"۔

خداوندمتعال روز قیامت، ملائکہ یا تدبیرعالم کے مامورین پر ایمان رکھنے سے (کہ یہ سب ایمان بالغیب کے مصداق ہیں) انسان کی معرفتی، عاطفی، اور اخلاقی جہات تبدیل ہوجاتی ہیں اور اس نظر جسمانی، کمّی اور فائدہ طلب محاسبات کے حدود میں محدود نہیں رہتی ہے، بلکہ اُس کی یہ فکر، یہ نظر اورخدا شناسی اس کی باطنی استعدادوں کی بالیدگی کا سبب بنتی ہے اور اس کے وجودکی وسعت کو کمال مطلق کے امتداد میں محقّق بناتی ہے۔ ایک بے کراںؔاور لامتناہی علیم وقدیر وجود مقدس کے سامنے حضور کا احساس انسان کے اخلاقی کنٹرول اور تربیت میں ایک اہم عامل ہوگا، لہٰذا ایمان کی پرورش انسان کے پورے وجود میںؓبہت سے قوی وسائل انسان کے پورے وجود میں(جو کہ وہ اختیار میں رکھتی ہے، اخلاقی تربیت کو آسان بنادیتی ہے، بلکہ خود انسان کے وجود میں مکارم اخلاق کو پیدا کرتی ہے۔

۱۔ میزان الحکمۃج ۱ ص۳۰۰۔

۲۔ میزان الحکمۃج ۱ ص۳۰۲۔

الیکس کارل انسان کے مذہبی ایمان اور اخلاقی پہلو کے رابطہ کی اس طرح منظر کشی کرتا ہے:

اخلاقی اور مذہبی افعال عملی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اخلاقی احساس، عرفانی احساس کے ختم ہونے کے بعد دیر تک باقی نہیں رہتا انسان مذہب سے مستقل اور الگ ایک اخلاقی سسٹم بنانے میں جیسا کہ سقراط نے چاہا تھا کامیاب نہیں ہوا ہے، وہ سماج اور معاشرہ جس نے دعا اور راز ونیاز کو اپنے اندر ترک کردیا ہے عام طور پر فساد اور زوال سے محفوظ نہیں رہے گا۔ لہٰذا بے ایمان (نام نہاد) متمدن افراد دیندار لوگوں کی طرح فریضہ رکھتے ہیں کہ اپنے باطنی افعال کے رشد کے مسئلہ میں کہ جو ایک انسانی وجود کا لازمہ ہے، دلبستگی پیدا کریں۔[1] علامہ طباطبائی اخلاقی اسلوب وطریقے کی توضیح میں، تین مسلک کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پہلا مسلک:

دنیوی صالح غایات کی راہ سے تہذیب ہے کہ یہی یونانی فلاسفہ کا عقلی مسلک ہے۔

دوسرا مسلک:

اخروی غرض وغایت کے لحاظ سے تہذیب ہے جیسے حور، قصور، بہشت ودوزخ و۔۔۔ کہ اس کے سلسلہ میں قرآنی آیات بہت زیادہ ہیں اور انبیاء کا تربیتی طرز عمل بھی اسی روش پر رہا ہے۔

تیسرا مسلک:

یہ قرآن کریم سے مخصوص ہے کہ ایک طرح سے ایمان کی پرورش اور معارف الٰہی سے استفادہ کے ذریعہ اخلاقی رذائل کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکتا ہے... جو عمل بھی انسان انجام دیتا ہے اس کا ہدف اور غایت یا اُس میں عزت کا حصول مطلوب ہے یا وہ قدرت ہے جس سے ڈرتا ہے۔ لیکن خداوند سبحان فرماتا ہے: (اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعاً)[2] تمام عزت اﷲ کے لئے ہے اور فرماتا ہے۔ (اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعاً)[3] تمام قدرت اﷲ کے لئے ہے۔ اگر یہ معرفت اور یقین محقق ہوجائے تو ریا، سمعہ، (دکھاوا)، خدا کے علاوہ سے خوف، خدا کے سوا کسی اور سے امید نہ رکھنے، اس کے علاوہ پر تکیہ کرنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی، یہ دو جملے جب بھی انسان کو معلوم ہوجائیں (قلبی یقین کی حد میں) تمام اخلاقی رذیلت کو انسان سے پاک کردیتے ہیں (خواہ صفت) ہو یا فعل اور اس کے مقابل اخلاقی فضائل جیسے تقوائے الٰہی، عزت خداوندی، عظمت وشوکت، بے نیازی اور ربانی ہیبت وغیرہ سے آراستہ کردیتے ہیں۔[4]

۱۔ نیائش ص۲۸۔ ۲۔ سورۂ یونس، آیت ۶۵۔ ۳۔ سورہ بقرہ آیت ۱۶۵۔ ۴۔ المیزان ج ا ص ۳۵۴۔ ۳۶۰۔

خداوند ذوالجلال کی وحدانیت پر ایمان رکھنا انسان کے توحیدی مکتب فکر کو تنظیم کرتا ہے اور اسے انسجام بخشتا ہے، اہداف ومقاصد، افکار، عواطف وجذبات، عادات واطوار، افعال، سارے کے سارے ایک ہدف کے تحقّق کے لئے (کہ اﷲ کی حاکمیت اور اس کی رضا ہے) ہم آہنگ اور متحد ہوجاتے ہیں اور اس وجہ سے دنیوی، شیطانی اور نفسانی خواہشات ، اہداف کے اسباب ہیں اس لئے کہ وہ غیر خدا کوئی اور ہیں تفرقہ اور اختلاف ، لڑائی جھگڑے ، کینہ وحسد اور دیگر اخلاقی رذائل ۔

اور خداوند عالم رقیب وعقید فرشتوں،پرشکوہ حضور روز قیامت کا یقین اخلاقی مراقبت اور کنٹرول کو انسان کے لئے سہل وآسان بنادیتا ہے اور جس قدر ایمان کی قوت زیادہ ہوگی احساس حضور زیادہ ہوگا اور اخلاقی تربیت آسان تر ہوگی: "خداوند عالم تم پر ہمیشہ نگہبان ہے"۔ (۱) انسان کوئی بات نہیں کرتا، مگریہ کہ اس کے پاس ایک مراقب وآمادہ (فرشتہ) ہوتا ہے جسے وہ ضبط وثبت کرتا ہے۔ (۲) حضرت علی نے فرمایا: " خداوند عالم نے ہر عمل کے لئے ثواب اور ہرچیز کے لئے حساب قرار دیا ہے"۔ (۳)

علمائے اخلاق کے شیوہ میں بالخصوص غزالی کے زمانے سے اب تک یہ روش بہت موردتوجہ رہی ہے اور اخلاقی کتابوں کاقابل توجہ حصّہ باواسطہ یا بلاواسطہ اس سے مخصوص رہا ہے اس کے علاوہ چونکہ لوگوں کے اخلاق کو

آراستہ کرنااوران کی اصلاح انبیاء کی بعثت کا اصلی وبنیادی ہدف رہا ہے (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق) میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔] رسول خدا]) اور انبیاء کی تعلیمات میں اخلاقی پیغامات اور موعظے ان کی سیرت وسلوک کا عظیم باب رہے ہیں لہٰذا پرورش ایمان اور اخلاقی تربیت کے درمیان رابطہ کے اثبات کے سلسلہ میں تفصیل ضروری نہیں ہے۔ درج ذیل احادیث مطلب کی وضاحت کے لئے کافی ہیں:

پیغمبر اکرم نے فرمایا: "ایمان حرام امورسے دوری اور دنیوی خواہشات سے پاکیزگی کا سبب ہے"۔ (٤)

۱۔ سورہ ٔنساء آیت ۱۔

۲۔ سورہ قۤآیت ۱۸۔

۳۔ غررالحکم۔

٤۔ کنزالعمال خ۵۸۔

"ایمان حلم وبردباری اور جودو بخشش کے سوا کچھ نہیں "۔[۱]

حضرت علی نے فرمایا: " ایمان ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑ وبنیاد یقین، شاخ تقویٰ، کلیاں شرم وحیا، اور اس کا ثمر سخاوت ہے" (غرر الحکم) "سچائی ایمان کے لئے سر کے مانند ہے"۔(غرر الحکم)

حضرت علی۔ فرماتے ہیں"مومن کی شادمانی اُس کے چہرہ پر اور غم و اندوہ اس کے دل کے اندر ہوتا ہے، وہ کشادہ سینہ اور خاکسار وخاضع نفس کا مالک ہوتا ہے، فوقیت طلبی کو ناپسند کرتا ہے... اس کا سکوت طولانی ہوتا ہے ، اُس کے اوقات مشغول ہوتے ہیں ، وہ شاکر اور صابر ہوتا ہے..."۔[۲]

پیغمبر اکرم فرماتے ہیں: "تم میں ایمان کے لحاظ سے کاملترین انسان وہ ہے جو سب سے اچھا اخلاق رکھتا ہو" ۔[۳]

ویکٹور فرانکل ماہر نفسیات اور علاج معنوی مکتب کا حامل مذہبی ایمان کو جیلوں کے اندر افراد کے اخلاقی اقدار کے تحفظ کے لئے اہم ترین وسیلہ شمار کرتا ہے، آغاز میں جیلوں کے متعلق اس طرح بیان کرتا ہے:

"...ایک دن ایک پولیس جو کہ ہمارے جیلوں میں کام کررہا تھا اس نے مجھ سے کہا: چھائونی میں انسان مردار کا ایک ٹکڑا گوشت کو تلاش کررہا ہے ، آخرکار اُ سے آگ پر چڑھے ایک برتن میں پایا... ہمارے جیل چھائونی آدم خوری سے بھری ہوئی تھی۔[٤] ... ہم نے تو اسیروں کے جیل میں زندگی گذاردی ہے ، اس وقت ہم ایسے لوگوں کو یاد کرتے ہیں جو کمرہ کمرہ میں جاتے اور دیگر قیدیوں کی دلداری کرتے حتی کہ روٹی کا آخری ٹکڑا بھی انھیں بخش دیتے تھے۔[٥]

انسان کبھی اخلاقی رفتار کی سمت کھینچ کرلے جایا نہیں جاتا بلکہ فیصلہ کرتا ہے کہ اخلاقی رفتار رکھے، وہ اس کام کو میلان کی تکمیل یاوجدان کی آسودگی کے لئے انجام نہیں دیتا ہے، بلکہ اس دلیل اور علت کی وجہ سے کہ جس کا پابند ہے اُس انسان کے لئے جسے دوست رکھتا ہے یا اپنے خدا کے لئے انجام دیتا ہے...۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تمام مقدس افراد کا مقصد اپنے خدا کی خدمت کے سوا کچھ نہیں تھا اورمیں یہ خیال نہیں کرتا کہ ان کا اصلی وبنیادی ہدف مقدس ہونا تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ مکتب کمال کو انتخاب کرتے۔[٦]

۱۔ کنز العمال خ٥٧۔ ٢۔ بحار الانوار ج٦٩ص ٤١١۔ ٣۔ بحار الانوار ج٧١ص ٣٨٧۔٤۔ انسان درجستجوی معنا ص ٦٢۔

٥۔ انسان درجستجوی معنا ص٤٧۔ ٦۔ انسان درجستجوی معنا ص ١٤٥و١٤٦۔

اُس نے نیچہ کے جملہ سے استناد کیا کہ اس نے کہا تھا"جس انسان نے زندگی کی کیوں علت دریافت کرلیا ہے وہ ہر کیفیت کے ساتھ نبھالے گا" فرانکل کہتا ہے: جرمن نازیوں کے جیل میں یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ وہ تمام وہ لوگ جو خیال کرتے تھے کہ ان کو کام اور ذمہ داری انجام دینا ہے (اس معنی کے مقابل جس کا وہ اعتقاد رکھتے تھے) انھوں نے زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا چانس رکھا (بعد میں یہ بات کوریا اور جاپان میں امریکی ماہرین کے ذریعہ ثابت ہوگئی ہے) ۔[1]

امریکا کا عظیم ماہر نفسیات ویلیام جیمز بھی دینی ایمان کے اخلاقی پہلو کی امرسون نامی انسان کے قول کو نقل کرتے ہوئے اس طرح تصویر کشی کرتا ہے:

... آدمی کی روح میں ایک عدالت پائی جاتی ہے کہ جس کی سزا اور جزا قطعی اور یقینی ہے جو شخص آلودگی اور برائی کو اپنے سے دورے کرے تو اس نے پاکی اور خوبی کو حاصل کرلیا ہے اور جو انسان پہلے ہی سے قلبی اعتبار سے اچھا انسان ہو اس کے دل میں خداوندعالم جگہ رکھتا ہے، اس عدالت اور اچھائی دوستی کے ساتھ جو یہ شخص اپنے دل میں رکھتا ہے، خداوند ازلی وابدی ، خدائے عظیم کو اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی دھوکہ دے اور مکر سے کام لے گویااُس نے خود کو دھوکا دیا اور اپنی معرفت بھی نہیں رکھتا ہے، ہر انسان کا باطن بخوبی پہچان لیا جاتا ہے، چور کبھی مالدار نہیں ہوتا اور جوانسان فقرا کی مدد کرتا وہ کبھی محتاج نہیں ہوتا ہے۔ پتھریلی دیوار کی پشت

سے بھی قتل آواز دیتا ہے یعنی قتل کو چھپایا نہیں جاسکتا۔

جھوٹ اور ملاوٹ کا ادنیٰ ذرہ بھی اگر کسی چیز میں ہو، مثال کے طور پر خود خواہی کا شائبہ، وسوسہ، تظاہر، ریاتو تمہارے کام کے نتیجہ کو فاسد کردے گا لیکن اگر صداقت اور راستگوئی سے کام لو گے تو ساری چیزیں اور ہرکوئی جاندار ہو یا بے جان تمہاری صداقت کا گواہ ہوگا...۔

عشق، عدالت، محبت، خوش خلقی اور صبر سبھی کا سرچشمہ ایک ہی ہے ، لہٰذا جتنا آدمی ان "مقاصد" سے دور ہوگا، قدرت ونفرت کے سرچشمہ سے بھی ممکن ہے کہ اس سے فیضیاب ہو، دور ہوجائے گا نتیجہ کے طور پر اس کا وجود بے پناہ اور متزلزل ہوکر تدریجاً کمزوراور معمولی ہوکر ذرّہ اور نقطہ میں تبدیل ہوکر نہایت برائی اور پستی کے ساتھ

۱۔ ا انسان درجستجوی معنا ص۱۵۵۔

وجہ موت اور نابودی کے گڑھے میں گرجائے گا۔ اس قانون کا فہم وادراک آدمی میں ایسی فکر واحساس پیدا کرتا ہے کہ ہم اُسے احساس مذہبی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ایک عجیب وغریب قوت کہ خود جذب بھی کرتی ہے اور شاد ومسرور بھی کرتی ہے۔پہاڑوں سے چل کر جو عطر نسیم عالم کو معطر بنادیتی ہے وہ اسی کی ذات سے ہے، آسمانوں اور بلند وبالاپہاڑوں کو عظمت وجلالت وہی عطا کرتا ہے، ستاروں کے سکوت آمیز آواز اُسی کی دین ہے، تمام خوبصورتیاں اور خوبیاں اسی کی ذات سے ہیں، وہ ہے کہ آدمی کو ابدی بنادیتا ہے۔

جب انسان کہتا ہے: "میرا فریضہ وفریضہ ہے" جب عشق ومحبت اسے حکم دیتی ہے، جب عالم بالا سے الہام نیک اور عظیم کام کا انتخاب کرتا ہے، ایسے موقع پراس کی روح عالمِ عقل کے عالم گیر نغموں سے سرشار ہوجاتی ہے... (ویلیام جیمزص۷،۸)

درحقیقت انسان کا خدا پر ایمان، غیرا ارادی طور پر ضمیر میں وارد ہونے سے (گوستاویونگ) کہ غیر ارادی ضمیری چیزوں کو ناخود آگاہ ضمیر کا مفہوم روح، خدا اور غیبی قوتوں پر مشتمل جانتا ہے۔[1]

اس کے بہت سے دیگر افکار ونظریات پر براہ راست نہایت تاثیر رکھتا ہے جیسے اُس کا زندگی اور زندگی ہدف کے بارےنظریہ۔ اور یہ نظریات خود اپنی جگہ پر خوب وبد، درست ونادرست کے بارے میں انسان کے افکار کو تشکیل دیتے ہیں، یہاں تک کہ آخرکار انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی عمل اور انفرادی مناسبتیں بھی اوّلی اور اساسی افکار ونظریات سے تاثیر قبول کرتی ہیں۔

انسان کے غیر ارادی طور پر وارد ہونے کے طریقے، چار اساسی راہ کے حامل ہیں کہ آخری کے علاوہ سبھی طبیعی ہیں:

۱۔عہد طفولیت میں منصوبہ بنانا۔

۲۔مثبت یا منفی شدید ہیجانات کے وقت۔

۳۔ہوشیاری کے وقت نفس کی تلقین: اس طرح سے کہ اچھے اور مثبت جملات اور مفاہیم کی مناسب وقت میں آہستہ آہستہ توجہ کے ساتھ بلند آواز سے تکرار کرے۔

٤۔ہپیناٹزم کی روش۔

۱۔ رواشناسی ضمیر خودآگاہ ص۹۲۔

وہ دینی تعلیمات اوردستورات کہ جو ایمان کی تربیت کے لئے مد نظر قراردئے گئے ہیں، اوّل تین راستوں سے افراد معاشرہ کی ہدایت اورسماج کے اخلاقی اصلاح کے عنوان سے بہترین استفادہ کیا ہے۔ ایمان کی پرورش کے وہ اسلوب جو دینی معارف کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

الف۔عبادت:

عبودیت تذلل اورخاکساری کے اظہار کے معنی ہے کہ جو فارسی میں "بندگی "کے معنی میں ہے اور عبادت اس سے بھی بالاتر چیزہے، یعنی انتہائی درجہ تذلل، اسی وجہ سے خدا کے علاوہ کوئی اس کا مستحق نہیں ہے۔(المفردات) اس بناپر مختلف عبادی اعمال، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ اسی تذلل وبندگی کا اعلان ہے۔ سید قطب اس مطلب کی اچھی طرح منظر کشی کرتے ہیں:

نماز، روزہ، زکات، حج اور تمام تعبدی شعائر واعمال ایک کنجی کے سوا کچھ نہیں ہیں، وہ صرف ایسی کنجیاں ہیں جن کے ذریعہ اپنے لئے عبادت کے دروازوں کو کھول سکیں، یا ایسے منازل اورقیامگاہ ہیں کہ طریق عبادت کے راہی اورمنزل معبود کے سالکین راستہ میں اُس قیام گاہ میں کچھ دیر قیام کرکے توشۂ راہ حاصل کرتے ہیں، تازہ دم ہوتے ہیں پھر کافی زادۂ راہ کے ساتھ اپنی راہ طے کرتے ہوئے معشوق کی منزل کی طرف چل پڑتے ہیں، یہ راہ وہی عبادت ہے لہٰذا جو کچھ اس راہ میں واقع ہو، عبادت سے لے کر روزمرہ کی زندگی کے اموریا غور وخوض اور ادراک تک جب تک کہ ہدف خدا ہو، وہ سب کا سب عبادت ہے۔ یہ اساس اور بنیاد اُس وقت زیادہ مضبوط ہوجاتی ہے جب حقیقت اور عملی اعتبار سے (نہ کہ صرف زبان) سے گواہی دے کہ کوئی بھی مقام اور شخصیت نیز مظہرقدرت عبادت کے قابل نہیں ہےسوائے اس خداوند واحد وخالق کے کہ جو حکیم وعلیم ہے۔[۱]

اس طرح کی عبادت انسان کی زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کرکے ایمان کی پرورش کا باعث ہے اور اس کانتیجہ وثمرہ اخلاقی تربیت اور انسانی فضائل ہیں۔

"اے لوگو! تم سب اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو خلق کیا ہے، لہٰذا اس کی عبادت کرو، شاید تقویٰ اختیار کرو"۔[۲]

۱۔ روش تربیتی در اسلام ص ۳۹۔

۲۔ سورہ بقرہ آیت ۲۱۔

روزانہ کی عبادتوں کی راہ میں، جیسے روزانہ کی نمازیں اور موسمی عبادتیں جیسے روزہ، حج اور اعتکاف نفسیات کے مختلف فنون سے استفادہ کرکے (جیسے اپنے آپ کو تلقین کرنے، عادت دینے اور عمل کرنے، شرطی سازی وغیرہ کے ذریعہ) خدا کی بندگی اور پرستش کی اس حالت کو اپنے اندر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اپنے ناخود آگاہ ضمیر میں جاگزین کرسکتا ہے۔ لہٰذا عبادت میں جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اور عمل جتنا ہی صاف وشفاف اور خالص ہوتا ہوگا اتنا ہی انسان تیزی کے ساتھ اس مقصد تک پہنچ جائے گا۔ لیکن عبادت کے نچلے مراتب بھی اس ہدف تک رسائی کے لئے مقدمہ کے عنوان سے کار ساز ہیں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "عبادت کی تین قسمیں ہیں: "کچھ لوگ خدا کے خوف سے عبادت کرتے ہیں، یہ غلاموں کی عبادت ہے کچھ لوگ ثواب خداوندی کے حصول کے لئے عبادت کرتے ہیں، یہ مزدوروں کی عبادت ہے، کچھ لوگ خدا سے عشق و محبت کی بناپر عبادت کرتے ہیں، یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے اور یہی عبادت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے"[1] "سب سے افضل عبادت عمل کو خدا کے لئے خالص کرنا ہے"۔[2]

عبادت کی تاثیر میں اہم نکتہ یہ ہے کہ رغبت ودلچسپی کی بنیاد پر ہو، نہ کہ کراہت اور سستی کی بنیاد پر ہو۔ اسی لئے پیغمبر اکرم نے فرمایا ہے:

"اُس بندہ پر آفرین ہو جو عبادت سے عشق کرتا ہے، جسم سے عبادت کرتا ہے اور قلب سے اُسے دوست رکھتا ہے اور خود کو اُس کے لئے فارغ کرتا ہے"۔

جو لذت و شیرینی عبادت میں ہے وہ اس کے استمرار اور اُسے قوت پہنچانے کا باعث ہوتی ہے، لیکن اس لذت کا احساس دو شرط پر مبنی ہے:

۱۔ ہوا پرستی (نفسانی خواہشات) سے دوری۔

۲۔ حبّ دنیا سے اجتناب۔

حضرت علیؑ نے فرمایا:

"جو نفسانی خواہشات سے اجتناب نہیں کرتا وہ کس طرح عبادت کی لذت محسوس کرتا ہے"؟۔ (غرر الحکم)

"جس طرح کوئی ایسا بیمار کہ جو شدید درد کا احساس کرتا ہے، اچھی غذا کی لذت محسوس نہیں کرتا، دنیا پرست بھی دنیا سے لگاؤ کی بناپر عبادت کی لذت محسوس نہیں کرتا اور اس کی حلاوت وشیرینی کو درک نہیں کرتا"۔[3]

۱۔ بحار الانوار ج۷۰ ص۲۵۵۔ ۲۔ غرر الحکم۔ ۳۔ بحار الانوار ج۱۴ ص۳۱۰۔

ایک دوسرا نکتہ جو عبادت میں قابل توجہ ہے، یہ ہے کہ عبادت کا ہدف خداوند عالم کے سامنے صرف اطاعت ہے اور "تعبد" کے معنی بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر باوجودیکہ ہم نہیں جانتے کہ نماز صبح دو رکعت کیوں ہے اور بلند آواز سے ہمیں پڑھنا چاہئے، تو ہم صرف اُس کے فرمان کی اطاعت کرتے ہوئے انجام دیتے ہیں۔ فضل بن شاذان حضرت امام علی رضا سے نقل کرتے ہیں: "اس لئے کہ اُسے فراموشی کے حوالے نہ کردیں، اس کے مراتب ادب کو ترک نہ کریں، اس کے امر ونہی سے غافل نہ ہو جائیں...."۔[1] اسی وجہ سے (فرمان خدا کی اطاعت) اللہ کے حدود حلال وحرام کی رعایت اورخدا کے فرائض اور واجبات کی مراعات کرنا عبادت کا اہم حصہ شمار ہوتا ہے۔ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں: عبادت کے دس جز ہیں کہ اس کے نو جز حلال کے سراغ میں جانا ہے۔[2] خداوندسبحان ارشاد فرماتا ہے: "اے اولاد آدم! جو کچھ ہم نے تم پر واجب کیا ہے اُس پر عمل کرو تاکہ لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار بن جائو"۔

ب۔ذکر:

ذکر "یاد آوری" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی طرح کسی چیز کے معنی کا یاد رکھنایا اُس کا حاضر ہونا ذکر کہلاتا ہے۔ دقیق تر تعبیر میں کبھی ذکر سے مراد ایک نفسانی حالت ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان اُس چیز کو جس کی اس سے پہلے شناخت اور معرفت یاد رکھ سکتا ہو۔ ذکر اس معنی میں حفظ کے مانند ہے اس فرق کے ساتھ کہ ذکر اس جگہ استعمال ہوتا ہے کہ کوئی بات حافظہ کے خزانہ میں موجود ہونے کے علاوہ اس کی نظر میں بھی حاضر ہو، کبھی سے مراد دل وزبان پر کسی مطلب کا حاضر ہونا ہے اور اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ذکر کی دو قسم ہے قلبی اور لسانی۔[3] اس بنا برایمان کی تربیت کا ایک دوسرا شیوہ ذکر ہے کہ جو خدا کے قطعی اور یقینی حضور کی انسان کے نزدیک تقویت کرتا ہے۔ زبانی اذکار جو اسلامی تعلیمات میں وارد ہوئے ہیں اس لئے ہیں کہ وہی حضور قلبی کی حالت انسان میں ایجاد کریں ہے۔ البتہ اذکار کی تربیتی تاثیر سے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے؛کیونکہ معین باتوں کو زبان پر لانا تلقین نفس سے استفادہ کے ساتھ ساتھ اُس کے متقضیٰ سے انسان کے ضمیر میں ایک تبدیلی ایجاد کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے غیرہوشیار ضمیر کی راہ ورود کے سلسلے میں ذکر کیا ہے، یہ شیوہ اسلامی تعلیمات میں بہت زیادہ موردتوجہ واقع ہوا ہے اور ہماری پوری زندگی خواب و بیداری، کام اور راحت، خوشی اور غم سب کے وقت خداپرستانہ اذکار اور تلیقنات سے بھری پڑی ہے جو ہم میں اثر انداز ہوتے ہیں۔

۱۔ علل الشرائع ص۲۵٦۔ ۲۔ بحار الانوارج۱۰۳ ص۱۸۔ ۳۔(مفردات)

یومیہ نمازیں (نافلہ اور فریضہ) ان کے مقدمات اور تعیقبات مخصوص اذکار کے ساتھ، کاموں کا آغاز "بسم اللہ" سے اور ہر کام کا خاتمہ "الحمد للہ" سے اور دیگر اذکار کہ جو گھر سے نکلتے وقت، کام کی جگہ میں داخل ہوتے وقت، مسجد میں وارد ہونے کے وقت... یہ ساری تلقینیں پوشیدہ اور آشکار اذکار کی صورت میں صاف وشفاف اور زلال بارش کے مانند مومنین کے قلب وروح کو بارآور کر کے ایمان وفضلیت کے ثمرات اُن کے اختیار میں قرار دیتے ہیں۔

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ زبان کے اذکار قلب کو زیادہ سے آمادہ کرتے ہیں، امام خمینی اپنے استاد کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہمارے عارف کامل شیخ (استاد) جناب شاہ آبادی (روحی فداہ) فرماتے تھے: ذاکر انسان ذکر میں اُس انسان کے مانند ہے جو چھوٹے بچے کو کہ جس نے ابھی ڈھنگ سے بولنا نہیں سیکھا ہے اُ سے اگر کوئی کلمہ یاد کراتا ہے تو اُس کی تکرار کرتا ہے تاکہ اُس کی زبان کھل جائے اور کلمہ کو ادا کرے اور جب وہ کلمہ ادا کر دیتا ہے تو معلم بچہ کا اتباع کرتا ہے اور اس تکرار کی تھکن ختم ہو جاتی ہے گویا کہ اُ سے بچہ سے مدد ملتی ہے، یہی صورت ہے اس کی جو ذکر کرتا ہے اُ سے چاہئے کہ اپنے دل کو کہ جس نے زبان ذکر نہیں کھولی ہے ذکر کی تعلیم دے اور ان اذکار کی تکرار میں نکتہ یہ ہے کہ زبان دل کھل جائے اور زبان قلب کے کھلنے کی علامت یہ ہے کہ زبان، دل کی تبعیت کرتی ہے اور تکرار کی زحمت اور تھکن بر طرف ہو جاتی ہے۔ (۱)

پس اے عزیز! ذکر و یاد محبوب کے راستہ میں تو نے جتنی زحمتیں برداشت کی ہیں کم ہیں، دل کو یاد محبوب کی عادت دے، بلکہ خدا کی خواہش اور مرضی سے قلب کی صورت ذکر حق کی صورت ہوجائے اور کلمۂ "لاالٰہ الا اللہ" کمال نفس کی انتہا ہوجائے کہ اس سے بہتر سلوک الیٰ اللہ کے لئے کوئی زادہ راہ اور نفس کے معایب (عیوب) کے لئے سب سے اچھا مصلح اور معارف الٰہیہ میں بہترین رہبر نہیں ملے گا، لہٰذا اگر صوری اور معنوی کمال کے طالب ہو اور طریق آخرت کے سالک، مسافر و مہاجر الیٰ اللہ ہو تو قلب کو محبوب کے ذکر کی عادت دو اور دل کو یاد حق تبارک وتعالیٰ سے عجین کردو (گوندھ دو) (۲)

۱۔ چہل حدیث، ص۲۵۰۔ ۲۔ چہل حدیث، ص۲۵۰۔

خداوند سبحان کی یاد انسان کو غفلت اور نسیان سے نکال دیتی ہے اور اخلاقی تربیت کی راہ ہموار کرتی ہے، کیونکہ اخلاقی انحراف اور برے افعال کے اسباب وعلل غفلت اور نسیان ہیں:

" اس انسان کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور اس نے اپنی ہوا وہوس کی پیروی کی ہے اوراس کے کام کی بنیاد زیادہ روی پر ہے"۔(۱)

"در حقیقت جو لوگ صاحبان تقویٰ ہیں، جب شیطان کی جانب سے انھیں وسوسہ ہوتا ہے تو]خداکو[یاد کرتے ہیں اور حقائق کو دیکھنے لگتے ہیں"۔(۲)

حضرت علی۔ فرماتے ہیں: "خداوند سبحان نے اپنی یاد کو دلوں کے لئے روشنی قرار دیا ہے، قلوب اس وسیلہ سے بہرے پن کے بعد سننے والے، نابینائی کے بعد بینا اور سرکشی و طغیانی کے بعد مطیع وفرمانبردار ہوجاتے ہیں"۔ (۳)

آیات وروایات میں ذکر کثرت ومداومت کی تاکید کی گئی ہے: "اے صاحبان ایمان! خدا کو بہت زیادہ کرو"۔ (٤)

ذکر الٰہی کی مداومت قلب کی اصلاح اور اخلاقی فضائل سے کہ جو بالیدگی وحیات نو کا سبب ہے:"جو انسان اپنے دل کو ذکر کی مداومت سے آباد کرے تو اس کا کردار ظاہر وباطن دونوں صورتوں میں نیک ہوجائے گا"۔ (۵)

"قلب کی اصلاح کی بنیاد، انسان کا ذکر خداوندی میں مشغول ہونا ہے"۔(٦)

ذکر کی روش بیثنذکر خداوندی کے علاوہ خدا کی نعمتوں کا یاد کرنا بھی منعم]نعمت دینے والے[کے احترام کے عنوان سے انسان کو خداوندعالم کی بے نظیر اور لاثانی ذات کے سامنے سراپا تسلیم ہونے اور اس کی تعظیم کرنے پر آمادہ کرتا ہے، بالخصوص جس قدر نعمت عظیم اور اس کا منعم بے غرض ہوگا، اس کا احترام فطرت کی نظر میں اتنا ہی زیادہ لازم ہوگا:"اے لوگو! اپنے اوپر خداوند سبحان کی نعمت کو یاد کرو، آیا خدا کے علاوہ کوئی خالق ہے کہ تمہیں زمین وآسمان سے رزق دے "۔(۷)

۱۔ سورہ کہف آیت۲۸۔ ۲۔ سورہ اعراف آیت ۲۰۱۔۳۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۲۔ ٤۔ سورۂ احزاب آیت ٤۱۔المیزان ج ۱ ص ۳٤۰۔

۵۔ غرر الحکم۔ ٦۔ غرر الحکم۔ ۷۔ سورہ فاطر آیت ۳۔

چونکہ قرآن کریم خود کو ذکر اور حامل ذکر کے عنوان سے تعارف کراتا ہیلہذا تلاوت قرآن بھی ذکر کی حالت انسان کے اندر پیدا کیا اور ایمان کی پرورش کا باعث ہوتی ہے:

(اِنْ هُوَ الّا ذِكْر لِلْعَالَمِيْن)[۱]

"یہ عالمین کے لئے صرف ذکر (نصیحت) کا سامان ہے"۔

(ص، والقرآن ذی الذكر)[۲]

"ص ذکر (نصیحت) والے قرآن کی قسم"۔

(وَاِذَا تَلِيَتْ عَلَيْهِم آيَاتِهِ زَادَتْهُمْ اِيْمَاناً)[۳]

"اور جب ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے"۔

ذکر کی بحث میں آخری نکتہ "موت کی یاد" سے متعلق ہے، اس بات کی طرف توجہ دیتے ہوئے کہ آخرت پر ایمان رکھنا اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے، موت کا تذکرہ اور اس کا]ذہن میں[حضور ایمان کی پرورش اور اخلاقی آثار کے مجسم ہونے کا باعث ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ موت کی یاد، دنیا کی دوستی اور محبت کو ختم کرنے میںجوکہ بہت سے اخلاقی رذائل کا سرچشمہ ہے، اہم کردار ادا کرتی ہے:

(کلّ نفس ذائقة الموت، وانّما توفون اجورکم یوم القیامة فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقد فاز وما الحیاة الدنیا الّا متاع الغرور)[٤]

"ہر نفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور تمھارا مکمل بدلہ تو صرف قیامت کے دن ملے گا اس وقت جسے جہنم سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہ کامیاب ہے اور زندگانی دنیا تو صرف دھوکہ کا سرمایہ ہے"۔

ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات میں بھی موت کی یاد کا تربیتی اثر ملتا ہے:

"جو شخص]مرنے کے بعد[سفر کی دوری کو یاد کرے گا وہ آمادہ سفر ہوجائے گا"۔[٥]

"جو انسان موت کی آمد کا انتظار کرے گا وہ نیک کاموں میں جلدی کرے گا"۔[٦]

۱۔ سورہ تکویر آیت۲۷۔ ۲۔ سورہ صآیت ۱۔۳۔ سورہ انفالآیت ۲۔ ٤۔ سورہ آل عمران آیت ۱۸۵۔

٥۔ غرر الحکم ٦۔ غرر الحکم۔

موت کی یاد نفسانی خواہشات اور شہوات کو ماردیتی ہے، غفلت کی جڑوں کو اکھاڑ دیتی ہے، دل کو خداوند سبحان کے وعدوں سے قوی اور مضبوط بنا دیتی ہے، انسان کے وجود کو لطیف ونرم کرتی ہے اور ہوا وہوس کی نشانیوں کو درہم وبرہم کردیتی ہے اورحرص و طمع کی آگ کو خاموش کردیتی ہے اور دنیا کو انسان کی نظر میں بے وقعت اور ذلیل وخوار کردیتی ہے۔[1]

راہ آخرت کے سالکین نے اپنے شاگردوں کو ہمیشہ قبرستان میں جانے کی تاکید کی ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار جائیں اور اہل قبور کی زیارت کریں اور موت کی یاد سے اپنے آپ کو تقویت کریں۔[2]

ج۔دعا :

دعا در اصل عالم کے غیر مادی مرکز کی جانب روح کی کشتی کا نام ہے عام طور سے عام طور سے دعا سے مراد تضرع وزاری، اضطراب اور نالہ وشیون، استعانت اور مدد طلبی ۔ اور کبھی ایک روشن کشف وشہود کی حالت جو تمام محسوسات کی دنیا سے دور مستمر اور باطنی آرام ہے۔ بعبارت دیگر کہا جاسکتا ہے کہ دعا خدا کی سمت پروازِ روح کا نام ہے یا عاشقانہ پرستش کی حالت ہے اس مبدأ کی نسبت جس سے معجزہ حیات صادر ہوا ہے اور بالآخر دعا انسان کی کوشش ہے اس نامرئی اور ناقابل دید وجود سے ارتباط کے لئے جو تمام ہستی کا خالق ، عقل کل، قدرت مطلق اور خیر مطلق ہے۔ خاص اوراد کے نقل سے صرف تطر کرتے ہوئے، حقیقت دعا سوز و گذار سے بھری ایک عرفانی حالت کو مجسم کرتی کہ دل اس میں خدا سے جذب ہوجاتا ہے ۔[3]

راز ونیاز ،دعا و مناجات بھی پرورش ایمان کا ایک طریقہ ہے۔دعا احتیاج کا اظہار ہے بلکہ دعا یہ ہے کہ انسان یکسر احتیاج بن جائے ۔دعا اشتیاق کا اظہار ہے، بلکہ انسان کی تمام احتیاج یہی شوق و اشتیاق ہے۔دعا سنوارنے اور تربیت دینے کا ایک عامل ہے کہ نہ صرف انسان کو اس کی کمیوں سے متعلق ہوشیار کرتی ہے بلکہ اس کی تمام کوششوں اور توانائیوں کو اس کے مطلوب کے حصول کی خاطر صرف کردیتی ہے۔

۱۔ المحجۃ البیضاج۸ص ۲۴۲۔

۲۔ ہم بالخصوص ملا حسین قلی ہمدانی ، بہاری ہمدانی اور میرزا جواد انصاری ہمدانی کی وصیتوں میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

۳۔ الکسین کارل: نیایش، ص ۵۱۔

جب کوئی بیمار درد وسوز سے پیچ وتاب کھاتا ہے اور ڈاکٹر سے مدد مانگتا ہے خود ہی ابتدائی کاموں کو انجام دیتا ہے تاکہ معالجہ کی راہ ہموار ہوجائے پس یہی بات ہے کہ دعا اور طلب اپنے حقیقی معنی کو پالیتی ہے اور نتیجہ کے طور پر اجابت اور قبولیت سے ہمکنار ہوتی ہے:

(وَاِذَا سَئَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَاِنِّی قَرِیْبُ، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوا لِی وَلْیُؤمِنُوا بِیْ لَعَلَّهُم یَرْشُدُونَ)[1]

"اور اے پیغمبر! اگر میرے بندے تم سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں ان سے قریب ہوں، پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں جب بھی پکارتا ہے لہٰذا مجھ سے طلب کرو قبولیت کریں اور مجھ ہی ایمان واعتماد رکھیں کہ شاید اس طرح راہِ راست پر آجائیں"۔

ابھی دعا کے عینی آثار] حاجتوں کی برآوری اور قبولیت واجابت [موردنظر نہیں ہیں، بلکہ ان کے علاوہ دعا ومناجات ہے، معبود سے باتیں کرنا اور راز ونیاز کا اظہار کرنا ہے، اس وجہ سے محبوب کے حضور کو دعا کرنے والے کے دل وجان میں تقویت کرتی ہے، کیونکہ دعا ومناجات حاضر مخاطب سے بات کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے، اسی وجہ سے کہ دعا عارفوں کے روح کی غذااور مومنین کے لئے خالص شراب ہے۔ خداوند سبحان نے اپنی توجہ وعنایت کو دعا وعبادت میں قراردیا ہے: "کہو: اگر تمہاری دعا نہ ہو تو تمہارا رب تمہاری کوئی اعتنا نہیں کرتا"۔ [2]

حضرت علی فرماتے ہیں: "دعا] مرادتک [پہنچنے کا خزانہ اور کامیابی کا چراغ ہے۔"[3]

خداوند رحیم وکریم نے کشائش ، اور آسمانوں کے فتح باب اور معلومات]فضائل ومکارم اخلاق [کے راستہ کو اپنی بارگاہ میں درخواست اور دعا کرنا قرار دیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق۔ فرماتے ہیں: زیادہ سے زیادہ دعا کرو کیونکہ وہ رحمت رحمت اور حاجت پوری ہونے کا ذریعہ ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ صرف دعا کے ذریعہ حاصل کرسکتے ہو...۔[4]

۱۔ سورہٴبقرآیت ۱۸٦۔

۲۔ سورہٴفرقان آیت ۷۷۔

۳۔ بحار الانوار ج۹۳ص ۳٤۱۔

٤۔ بحار الانوار ج۹۳ص۲۹۵۔

استجابت وقبولیت دعا کے شرائط میں حضور قلب اور رقت کی شرط کی گئی ہے، کیونکہ جو چیز سوز ونیاز کے ساتھ ہوتی ہے وہ حقیقت میں ارزش وقیمت رکھتی ہے اور ایک حقیقت کو اپنے اندر پروان چڑھاتی ہے: جان لو کہ خداوند سبحان دعا کو غافل اور بے خبر دل سے قبول نہیں کرتا۔(۱)

"دعا کو رقت قلب کے وقت غنیمت سمجھو اس لئے کہ وہ نزولِ رحمت کی نشانی ہے"۔(۲)

ائمہ معصومین (ع) کی دعائوں اور مناجاتوں میں ایسے عارفانہ مضامین ہیں کہ ائمہ معصومین (ع) نے محبوب ازلی کے ساتھ اپنی خلوتوں میں ان کو انشأ فرمایا ہے اور راز ونیاز کیا ہے۔ ان دعا ئوں کے بعض فقرات کو حفظ کرکے اور مناسب مواقع پر ان کی تکرار کرکے تربیتی مکتب میں طرز دعا کو ہم سیکھ سکتے ہیں۔ البتہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ راز ونیاز، دعا ومناجات سوز دل کے ساتھ ہونی چاہیئے اور دل کی گہرائی سے نکلنی چاہیئے، اس لحاظ سے ہمیں سعی وکوشش کرنی چاہیئے کہ اپنی زبان سے بھی دلوں کے محبوب سے راز ونیاز کریں اور اس سے شفیق و مہربان دوست اور اپنی خلوتوں کا مونس و غمخوار جانیں: "یَارَفِیقَ مَنْ لَا رَفِیقَ لَهُ، یَا اَنِیْسَ مَن لَا اَنِیْسَ لَهُ" اے اس کا رفیق جو کوئی رفیق نہیں رکھتا، اے اس کا انیس جو کوئی انیس نہیں رکھتا۔

اس کے علاوہ بعض دعائیں (بالخصوص صحیفۂ سجادیہ کی دعائیں) ہمیں باطنی دردوں اور بیرونی خطائوں سے آشنا کرتی ہیں کہ ہم ان دعائوں کے مضامین سے بھی استفادہ کرتے ہوئے اپنی اخلاقی تربیت کے بارے میں کوشش کریں۔

حضرت امام زین العابدین کی دعائے مکارم الاخلاق خاص اہمیت کی حامل ہے:

خدایا! میں تیری پناہ چاہتا ہو ںحرص و طمع کی طغیانی سے، غیض وغضب کی تندی سے، حسد کے غلبہ سے، صبر کی کمی اور قناعت کی کمی سے، بداخلاقی سے، شہوت افراط سے، تعصب کے غلبہ سے، نفسانی خواہشات کی پیروی سے، درستگی اورہدایت کی مخالفت سے، خواب غفلت سے، (دنیا کے) کاموں پر سخت راضی ہونے سے، حق پر باطل کے انتخاب سے، گناہوں پر اصرار سے، گناہوں کو معمولی اورکم سمجھنے سے اورعبادت و اطاعت کو عظیم خیال کرنے سے۔(۳)

۱۔ بحار الانوار ج۷۷ص۱۷۳۔

۲۔ بحار الانوار ج۹۳ص۳۱۳۔

۳۔ صحیفہ سجادیہ دعائے مکارم اخلاق۔

د۔ اولیائے خدا سے محبت:

جو کسی شخص کو انسان کامل سمجھے اور اس کے اخلاق و معنویات کا سخت دلدادہ ہو تو اس کے تحت تاثیر واقع ہوجاتا ہے۔

استاد مطہری اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

محبت مشابہت و مشاکلت کی طرف کھینچتی ہے اور اس کی قدرت باعث ہوتی ہے کہ محب محبوب کی شکل اختیار کرلے۔ محبت الکٹریک تار کی طرح ہے کہ جو محبوب کے وجود سے وصل ہوتا ہے اور اُس میں محبوب کے صفات کو منتقل کرتا ہے۔[(۱)]

تہذیب اخلاق میں محبت کی تربیتی تاثیر کے بارے میںفرماتے ہیں:

اہل عرفان اور صاحبان سیر وسلوک راہ عقل و استدلال سے کام لینے کے بجائے محبت وعقیدت کی تاکید اور پیشکش کرتے ہیں] اور [کہتے ہیں: کسی کامل کو تلاش کرو اور اس کی محبت وعقیدت کے رشتہ کو گردن دل میں آویزاں کرلو کہ راہ عقل و استدلال سے بھی زیادہ بے خطر ہے اور سریع تر ہے۔ محبت اور عقیدت کی قوت کی تاثیر دل سے اخلاقی رذائل کو زائل کرنے میں لوہے پر کیمیکل مواد ڈالنے کے مانند ہے، مثال کے طور پر ایک اچھے چھاپے کی]پھولدار[پلیٹ بنانے والا تیزاب کے ذریعہ حروف کے اطراف کو مٹادیتا ہے، نہ کہ ناخن سے اور نہ ہی چاقو کی نوک سے۔ لیکن عقلی توانائی کا اثر اُس انسان کے کام کے مانند ہے جو لوہے کے ذرّوں کو ہاتھ کے ذریعہ خاک سے جدا کرنا چاہتا ہے، اس میں کس قدر زحمت و مشقت ہے؟ اگر ایک قوی و مضبوط آہن ربا]مقناطیس[ہاتھ میں ہو، ممکن ہے کہ ایک گردش میں اُن سب کو جدا کردے، عقیدت و محبت کی طاقت آہن ربا کے مانند صفات رذیلہ کو جمع کرکے دور پھینک دیتی ہے۔ صاحبان عرفان کے عقیدہ کے مطابق پاک و پاکیزہ اور کامل واکمل افراد کی محبت وعقیدت ایک ایٹومیٹک مشین کے مانند ہے جو خود بخود رذائل کو جمع کرکے باہر پھینک دیتی ہے[(۲)]

۱۔ جاذبہ ودافعہ علی، ص۷۳۔

۲۔ جاذبہ و دافعہ علی ص۷۷۔۷۸۔

ان لوگوں کے نمونے جو صدر اسلام میں اس جذب و انجذاب کے تحت تاثیر واقع ہوئے ہیں اور حضرت رسول اکرم کے شیفتہ اور دلدادہ ہوگئے یہنّابوذر غفاری، بلال حبشی، اویس قرنی اور سلمان فارسی ہیں اس محبت نے ایک عظیم اکسیر کے مانند انھیں بے مثال گوہر کے مثل کرامت انسانیمیں تبدیل کردیا، اُس کے بعد بھی پوری تاریخ میں ایسے نمونے]شدت وضعف [کے ساتھ کثرت سے پائے جاتے ہیں جلال الدین محمد رومی جو "مولوی" کے نام سے معروف ہیں اس مسیر کے بارزترین نمونوں میں سے ایک نمونہ ہیں۔ جب وہ ایک کمسن بچہ تھے اور اپنے والد کے ہمراہ نیشاپور سے گذر رہے تھے تو نیشاپور کے بزرگ شیخ عطار نے بہاء الدولہ بچہ کو عام انسانوں سے زیادہ افضل بچہ پایا اور کسی تردید اور تأمل کے بغیر، بہاء الدولہ کو مبارک باد دی کہ عنقریب یہ بچہ سوختگان عالم یہنّآگ روشن کردے گا اور رہروان طریقت کے درمیان ایک اور شور وغوغا مچادے گا۔[1]

اس واقعہ کو گذرے ہوئے چند عشرے بھی نہ گذرے تھے کہ یہ پیشینگوئی مولانا کی شمس تبریزی سے ملاقات اور اُن سے عشق وعقیدت میں ظاہر ہوئی۔ اسلام میں یہ محبت اور شیفتگی "ولایت" کے عنوان سے معصومین علیہم السلام کی نسبت مکمل طور پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ ان اولیائے الٰہی کی محبت کہ جو حق کے مکمل آئینہ دار اور اس کی تجلی کی کاملجلوہ گاہ ہیں، انسان کو خدا پر ایمان اور عقیدت کی طرف منتقل کرتی ہے، اور اسی وجہ سے دعائوں میں اس محبت کو ہم خدا سے طلب کرتے ہیں:

خدایا! میرے نفس کو اپنی قدر سے ہماری جان کو قدر سے مطمئن اور اپنی قضا سے راضی قرار دے اور اپنے ذکر ودعا کا مشتاق اور حریص قرار دے اور اپنے خاص الخاص اولیاء کا دوستدار قرار دے اورزمین وآسمان کے درمیان محبوب قرار دے... ۔[2]

آیات وروایات میں عام طور سے ائمہ ہدیٰ (ع) کی محبت اور مودت عمومی اور خالص طور پر امیر المومنین — کی محبت ومودت قابل توجہ وتاکید قرار پائی ہے:

(قُلْ لَا اَسْئَلُکُم عَلَیهِ اَجْراً اِلّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبیٰ)[3] "اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغ کا کوئی اجر نہیں چاہتا علاوہ اس کے کہ میرے اقربا سے محبت کرو"۔

۱۔ عبد الحسین، زرین کوب، پلہ پلہ تا ملاقات خدا ص۵۰۔

۲۔ مفاتیح الجنان، شیخ عباس قمی، زیارت امین اللہ۔

۳۔ سورہ شوریٰ آیت ۲۳۔

اس آیت کے ذیل میں بہت سی احادیث شیعہ اور سنی سے نقل ہوئی ہیں کہ "پیغمبر کے قربیٰ" سے مراد ا
اس آیت میں علی، فاطمہ، اور آپ کے دونوں فرزند] حسن وحسین [(ع) ہیں۔[۱]

اس بناپر پیغمبر اور ائمہ اطہار (ع) کی محبت و ولایت کہ جو کامل انسان ہیں جس قدر بھی زیادہ ہوگی، یہ در حقیقت مکارم اخلاق اور فضائل سے عشق ہے اور یہ عشق خدا کی محبت سے جدا نہیں ہوسکتا۔

اولیائے خداوندی سے قلبی طورپر محبت آمیز رابطہ اورتوسل اسی وجہ سے پرورش ایمان کا باعث ہے۔

ہمیں توجہ رکھنی چاہئے کہ انسان کی خصوصیات میں ہے کہ وہ صرف یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کی توجہ کا مرکز رہے، بلکہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ہو جس سے اظہار محبت کرے اور عشق رکھے جیسا کہ مزلو ذکر کرتا ہے: "... اسی طرح ہمیں اس حقیقت سے غافل نہیں ہونا چاہئے کہ محبت کی ضرورتیں دونوں ضرورتوں کو یعنی محبت کرنے اور محبت دیکھنے کو شامل ہیں"۔[۲]

اس بناپر اگر محبت کا متعلَّق]ظرف[، اولیائے الٰہی اورانسان کامل کی محبت ہوں، تو یہ سرگرداں قوّت مجازی عشقوں اور بے قیمت محبتوں میں صرف نہیں ہوگی، بلکہ کمال انسانیت کے اعلیٰ مقصد میں پھولے پھلے گی۔

سعدی اگر عاشقی کنی وجوانی

عشق محمد بس است وآل محمد

اے سعدی! اگر تم عاشقی اور جواں مردی کرو تو اس کے لئے عشق محمد وآل محمد (ع) کافی ہے۔

اس موضوع میں آخری نکتہ "زیارت" ہے ائمہ اطہار (ع) کے مشاہد مشرفہ کی زیارت ان امور میں سے ہے جو ان کی محبت اور ولایت کو تقویت کرتی ہے اور باغ ایمان کو سرسبز وشاداب بنا دیتی ہے۔ متعدد روایات میں یہ نکتہ بیان ہوا ہے، نمونہ کے طورپر چند حدیث کی جانب ہم اشارہ کررہے ہیں:

"کسی قبر کی زیارت کے لئے سامان سفر آمادہ مت کرو، جز ہماری قبروں کی زیارت کے۔ جان لو کہ میں زہر سے شہید کیا جائوں گا اورپردیس اور عالم غربت میں دفن کیا جائوں گا۔ جو شخص میری زیارت کو آئے گا اس کی دعا مقبول و مستجاب ہے اور اس کا گناہ معاف ہے۔[۳]

۱۔ منجملہ تفسیر فخر رازیج ۲۷ ص ۱٦٦۔ بحارالانوار ج ۲۷ ص ۱۳۔ ۲۔ روانشناسی شخصیت سالم ص ۱٥٤۔ ۳۔ عیون اخبار الرضا ج ۱ ص ۲۸٥۔

محبت کے عنوان سے برادران دینی و ایمانی کی زیارت بھی قلوب کی حیات کا باعث، ایمان اور محبت میں رشد و اضافہ کا موجب ہے، بالخصوص صالح انسان اور ربانی علماء کی زیارت جو کہ دوگنا اخلاقی تاثیر رکھتی ہے:

"تم لوگ ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات کو جائو کہ یہ تمہارے دلوں کی حیات کا باعث ہے اورہماری باتیں بھی ذکر ہوں اورہماری احادیث تمہارے درمیان رابطہ برقرار کرتی ہیں، لہٰذا اگر ان سے تمسک اختیار کروگے تو تمہارے رشد اور نجات کا باعث ہے"۔ [1]

"زیارت دلوں میں دوستی اور محبت ایجاد کرتی ہے"۔[2]

نیک اور صالح افراد سے ملاقات کرنا قلب کی اصلاح کا باعث ہے۔[3]

۱۔ بحارالانوار ج۷٤ ص۲۵۸۔

۲۔ بحارالانوار ج۷٤ ص۳۵۵۔

۳۔ بحارالانوار ج۷۷ ص۲۰۸۔

منابع

۱۔ قرآن مجید

۲۔ نہج البلاغہ

۳۔آدلر، آلفرد، روان شناسی فردی، ترجمہ حسن زمانی شرفشاہی، تصویر، ۱۳۷۵۔

٤۔آمدی، عبدالواحد، غرر الحکم ودرا لکلیم، تہران، محمد علی الانصاری القمی، ۱۳۳۷۔

۵۔ آندرہ، پی تیر، مارکسومارکسیم، ترجمہ شجاع الدین ضیائیان، تہران انتشارات دانشگاہ تہران، ، ۱٤۰۲۔

٦۔ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ۲۰ جلد، بیروت، دار احیاء التراث، ۱۳۸۵ ق۔

۷۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، نہایہ، قم، اسماعیلیان، ۱٤۰۸ ق۔

۸۔ ابن شعبہ حرّانی، تحف العقول، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ۱٤۰٤ ق۔

۹۔ابن طاووس، علی ابن موسی، الملاحم و الفتن، قم، مؤسسہ صاحب الامر (عج)، ۱٤۱٦ ق۔

۱۰۔ ابن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، مصر، مطبعۃ المصطفی، ۱۳۸۹۔

۱۱۔ ابن فہد حلّی، عدّۃ الداعی، قم، مکتبۃ الوجدانی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۲۔ابن مسکویہ، تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق، قم، بیدار، ۱۳۷۱ ش۔

۱۳۔ ابن منظور، لسان العرب، بیروت، دار صار، ۱٤۱۵ ق۔

۱٤۔ اتکینسون، رتیال، زمینۂ روان شناسی، ترجمہ محمد تقی براہنی اور دیگر افراد، تہران، رشد، ۱۳٦٦۔

۱۵۔ اتکینسون، فلسفۂ اخلاق، ترجمہ سہراب علوی نیا، تہران، مرکز ترجمہ و نشر کتاب، ۱۳۷۵۔

۱٦۔ احمد بن ابی یعقوب، تاریخ الیعقوبی، قم، مؤسسہ ونشر فرہنگ اہل بیت، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۱۷۔ احمدی سید احمد، اصول و روشہای تربیت در اسلام، تہران، جہاد دانشگاہی، ۱۳٦٤۔

۱۸۔ ادگاردپش، اندیشہ ہای فروید، ترجمہ غلام علی توسّلی، تہران، انتشارات کتاب فروشی ابن سینا، ۱۳۳۲۔

۱۹۔ اربلی، ابوالفتح، کشف الغمہ، بیروت، دارالکتاب الاسلامی، ۱٤۵۱ ق۔

۲۰۔ ارسطو، اخلاق نیکو ماخس، ترجمہ سید ابو القاسم پور حسینی، تہران، انتشاردانشگاہ تہران، ۱۳٦۸۔

۲۱۔ ارون سون، الیوت، روان شناسی اجتماعی، ترجمہ حسین شکر کن، تہران، رشد، ۱۳٦٦۔

۲۲۔ اسکافی، محمد بن ہمام، التمحیص، قم، مدرسہ امام مہدی (عج)، ۱٤۵٤ ق۔

۲۳۔اشعث کوفی، جعفریات، تہران، مکتبۃ نینوی الحدیثۃ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
۲٤۔ الراغب اصفہانی، الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، تہران، المکتبۃ المرتضویۃ لاحیاء آثار لمرتضویۃ۔
۲۵۔ المظفر، محمد رضا، المنطق، قم، اسماعیلیان، ۱۳٦٦۔
۲٦۔ امام خمینی ، تحریر الوسیلہ، تہران، المکتبۃ العلمیۃ الاسلامیۃ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
۲۷۔ امام خمینی ، چہل حدیث، تہران، مرکز نشر دانشگاہی رجائ، ۱۳٦۸۔
۲۸۔ حضرت امام جعفر صادق ، مصباح الشریعۃ۔
۲۹۔ حضرت امام جعفر صادق ، نہج الفصاحہ۔
۳۰۔ باب الحوائجی، نصر اللہ، فروید چہ می گوید، تہران، انتشارات دریا، ۱۳٤۷۔
۳۱۔ باقری، خسرو، مبانی شیوہ ہای تربیت اخلاقی، تہران، سازمان تبلیغات اسلامی، مرکز چاپ و نشر، ۱۳۷۷۔
۳۲۔ باقری، خسرو، نگاہی دوبارہ بہ تربیت اسلامی، تہران، وزارت آموزش وپرورش، ۱۳٦۸۔
۳۳۔برقی، محمد بن خالد، محاسن، قم مجمع جہانی اہل بیت (ع)، ۱٤۱۳ ق۔
۳٤۔ بلاکہام، ھ۔ج، شش متفکر اگزیستانسیا لیست، ترجمہ محسن حکیمی، تہران، نشر مرکز، ۱۳۷۲۔
۳۵۔بی ناس، جان، تاریخ جامع ادیان، تہران، شرکت انتشارات علمی فرہنگی، ۱۳۷۳۔
۳٦۔ بیہقی، احمد بن الحسین، شعب الایمان، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱٤۱۵ ق۔
۳۷۔ پاپکین و استرول، کلیات فلسفہ، ترجمہ جلال الدین مجتبوی، تہران، حکمت، ۱۳۷۵ ش۔
۳۸۔پروین، لارنس، روان شناسی شخصیت: نظریہ و تحقیق، ترجمہ محمد جعفر جوادی، تہران، رسا، ۱۳۷۲۔
۳۹۔پیاژہ، ژان، تربیت بہ کجا می سپرد، ترجمہ دادستان و منصور، تہران، دانشگاہتہران، ۱۳٦۹۔
٤۰۔پیاژہ، ژان، دیدگاہ پیاژہ درگسترہ تحول روانی، ترجمہ وگردآوری از منصور، محمود وپریرخ دادستان، تہران، نشر ژرف، ۱۳٦۷۔
٤۱۔ تفتازنی، سعد الدین، شرح مقاصد، قم، انتشارات شریف رضی، ۱۳۷۵۔
٤۲۔ ثقفی، ابراہیم بن محمد، الغارات، تہران، انجمن آثار ملّی، ۱۳۹۵ ق۔
٤۳۔ جرجانی، سید شریف، شرح المواقف، قم، انتشارات شریف رضی، ۱۳۷۵۔

٤٤۔ جعفری، محمد تقی، بررسی و نقد افکار راسل، تہران، امیر کبیر، ۱۳۷۵۔

٤٥۔ جوادی، محسن، مسلہ باید و ہست، قم، تبلیغات اسلامی، ۱۳۷۵۔

٤٦۔ جوادی، محسن، نظریہ ایمان درعرصہ کلام وقرآن، قم، معاونت امور اساتیدو دروس معارف اسلامی، ۱۳۷٦۔

٤٧۔ جونز ارنست ودالبی یزو، اصول روانکاوی، ترجمہ ہاشم رضی، تہران، کاوہ، ۱۳٤۲۔

٤٨۔ جوہری، اسماعیل بن حماد، صحاح اللّغۃ، بیروت دار العلم للملایین، ۱۹۹۰م۔

٤٩جیمز، ویلیام، دین وروان، ترجمہ مہدی قائنی، قم، دار الفکر، ۱۳٦۷۔

۵۰۔ حسینی، سید مہدی، مشاورہ وراہنمائی در تعلیم و تربیت اسلامی۔

۵۱۔ حکیمی، محمد رضا، الحیاۃ، تہران، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱٤۵۹ ق۔

۵۲۔ حمصی رازی، سدید الدین محمود، المنقذ من التقلید، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۵۳۔ خراسانی، محمد کاظم، کفایۃ الاصول، قم، مؤسسہ آل البیت (ع) لاحیاء التراث، ۱٤۱۷ ق۔

۵٤۔ خزاز القمی، کفایۃ الاثر، قم، بیدار، ۱٤۵۱ ق۔

۵۵۔ خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، مدینہ منوّرہ، مکتب سلفیہ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۵٦۔ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، روان شناسی رشد بانگرش بہ منابع اسلامی، تہران، سمت، ۱۳۷٤۔

۵۷۔ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، مکتب ہای روان شناسی و نقد آن، ۲ جلد، تہران، سمت، ۱۳٦۹۔

۵۸۔ دفتر ہمکاری حوزہ و دانشگاہ، نقش تربیتی معلم۔

۵۹۔ دیلمی، حسن بن ابی الحسن، ارشاد القلوب ۲ جلد، قم، مؤسسہ آل البیت(ع) ۱٤۱۳۱ ق۔

٦۰۔ دیلمی، حسن بن ابی الحسن، اعلام الدین، قم، مؤسسہ آل البیت(ع) ۱٤۵۸ ق۔

٦۱۔ راسل برتر اند، تاریخ فلسفہ غرب، ۲جلد، ترجمہ نجف دریابندی، تہران، شرکت سہامی کتاب داری جیبی، ۱۳۵۱۔

٦۲۔ راسل برتر اند، زناشویی واخلاق، ترجمہ مہدی افشار، تہران، کاویان، ۱۳۵۵۔

٦۳۔ راوندی، قطب الدین، دعوات، قم، مؤسسہ الامام المہدی (عج)، ۱٤۵۷ ق۔

٦٤۔ روحانی، شہریار، خانودہ موعود مارکسیم، تہران، قلم، ۱۳٦٤۔

٦٥۔ زبیدی، سید محمد بن محمد، تاج العروس، بیروت، دار الفکر، ١٤١٤ ق۔
٦٦۔ زرین کوب، عبد الحسین، پلہ پلہ تا ملاقات خدا، مولانا جلال الدین رومی کی زندگی اور ان کی فکر کے بارے میں، تہران، علمی، ١٣٧٢۔
٦٧۔ سبحانی، جعفر، حسن و قبح عقلی، پایہ ہای جاودان اخلاق، تہران، پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، ١٣٧٧۔
٦٨۔ سید ابن طاووس، مسکن الفوائد، قم، مؤسسہ آل البیت(ع) ١٤١٢ ق۔
٦٩۔ سیف، علی اکبر، تغییر رفتار و رفتار درمانی (نظریہ ہا وروش ہا)، تہران، دانا، ١٣٧٣۔
٧٠۔ سیف، علی اکبر، روان شناسی پرورشی (روان شناسی یادگیری و آموزش)، تہران، آگاہ، ١٣٦٨۔
٧١۔ شالہ، فیلیسین، فروید و فروید یسم، ترجمہ اسحاق وکیلی، تہران، بنگاہ مطبو عاتی قائم مقام، ١٣٤١۔
٧٢۔ شعیر سبزواری، جامع الاخبار، قم، مؤسسہ آل البیت(ع)، ٤١٤ ق۔
٧٣۔ شیخ صدوق، اعتقادات، قم، کنفرانس جہانی ہزارہ شیخ مفید، ١٤١٣ ق۔
٧٤۔ شیخ صدوق، توحید، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
٧٥۔ شیخ صدوق، خصال، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ١٤٥٣۔
٧٦۔ شیخ صدوق، صفات الشیعہ، قم، مؤسسہ الامام المہدی (عج) ١٤١٥۔
٧٧۔ شیخ صدوق، علل الشرایع، بیروت، دار احیاء التراث، ١٣٨٥ ق۔
٧٨۔ شیخ صدوق، عیون اخبار الرضا، تہران، مکتبۃ جہان، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
٧٩۔ شیخ صدوق، مقنع، قم، مؤسسہ امام ہادی، ١٤١٥ ق۔
٨٠۔ شیخ صدوق، تومن لا یحضر الفقیہ، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
٨١۔ شیخ طوسی، امالی، قم، مؤسسہ البعثۃ، دار الثقافۃ، ١٤١٤ ق۔
٨٢۔ شیخ طوسی، محمد بن حسن، تہذیب الاحکام، بیروت، دار التعارف و دار صعب، ١٤٥١ ق۔
٨٣۔ شیخ مفید، ارشاد، قم، مؤسسہ آل البیت(ع)، ١٤١٣ ق۔
٨٤۔ شیخ مفید، اوائل المقالات، قم، کنگرہ جہانی شیخ مفید، ١٤١٣ ق۔

۸۵۔ شیرازی، صدرالدین، تفسیر القرآن، قم، بیدار، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۶۔ صبور اردو باری، احمد، معمای عادت۔

۸۷۔ صحیفہ سجادیہ، الکاملۃ، دمشق، رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۸۔ صدرا لدین شیرازی، الاسفار الاربعۃ، قم، مصطفوی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۸۹۔ صدر، سید محمد باقر، فلسفتنا (نظریہ المعرفۃ)، قم، دارالکتاب الاسلامی، ١٤٥١ ق۔

۹۰۔ صدر، محمد باقر، بحث فی علم الاصول (تقریر سید محمود ہاشمی)، ۷جلد، قم، مکتب الاعلام اسلامی، ١٤٠۵ ق۔

۹۱۔ صدر، محمد باقر، دروس فی علم الاصول، ۳حلقہ، بیروت، دارالکتاب اللبنانی، قاہرہ، دارالکتاب المصری، ۱۹۸۷۔

۹۲۔ صدوق، عیون اخبارالرضا تعلیق حسین اعلمی، بیروت، مؤسسہالاعلمی للمطبوعات، ١٤٠٤۔

۹۳۔ طبرسی، حسن بن فضل، مکارم الاخلاق، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ١٤١٤ ق۔

۹٤۔ طریحی، فخرالدین، مجمع البحرین، قم، مؤسسہ البعثہ، ١٤١٥ ق۔

۹۵۔ طوسی، خواجہ نصیر الدین، اخلاق ناصری، شیراز انتشارات علمیہ اسلامیہ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔

۹٦۔ عاملی، شیخ حر، وسائل الشیعہ، ۲۰ جلد، تہران، کتاب فروشی اسلامیہ، ١٤٠۳ ق۔

۹۷۔ عبد الباقی، محمد فواد، المعجم لالفاظ القرآن الکریم، قاہرہ، مطبعہ دارالکتب المصریہ، ١۳٦٤ ق۔

۹۸۔ عدۃ من الرواۃ، اصول ستہ عشر، قم، دارالشبستری، ١٤٠۵ ق۔

۹۹۔ عسکری، ابوہلال وجزایری، سید نور الدین، معجم الفروق اللغویہ، قم، مکتبہ بصیرتی، ١۳۵۳۔

١٠٠۔ علامہ امینی، احمد، الغدیر، بیروت، دارالکتاب العربی، ١٤٠٢ ق۔

١٠١۔ علامہ حلی، کشف المراد، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ١٤١۳ ق۔

١٠٢۔ علامہ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القران، ۲۰ جلد، قم، جامعۃالمدرسین، مؤسسہ نشر اسلامی۔

١٠۳۔ علامہ طباطبائی، سید محمد حسین، رسائل سبعہ، قم، نمایش گاہ ونشر کتاب، ١۳٦٢۔

١٠٤۔ علم الہدی، سید مرتضی، الذخیرہ، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ١٤١١ ق۔

١٠۵۔ عیاشی، محمد بن مسعود، تفسیر عیاشی، تہران، المکتبہ العلمیہ الاسلامیہ، ١۳۸٠ ق۔

١٠٦۔ غزالی، ابو حامد محمد، احیاء علوم الدین، بیروت، دار العلم، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٠٧۔ فرانکل، ویکتور، انسان در جستجوی معنا، ترجمہ نہضت صالحیان و میلانی، درسا، ١٣٧٣۔
١٠٨۔ فرانکنا، فلسفہ اخلاق، ترجمہ ہادی صادقی، قم، مؤسسہ فرہنگی طہ، ١٣٧٦۔
١٠٩۔ فقہ الرضا (فقہ منسوب بہ امام رضا)، مشہد، کنفرانس جہانی امام رضا ١٤٠٦ ق۔
١١٠۔ فلسفی، محمد تقی، اخلاق، تہران، نشر معارف اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١١١۔ فلسفی، محمد تقی، کودک از نظر وراثت و تربیت، تہران، ، نشر معارف اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١١٢۔ فیض کاشانی، محسن، المحجۃ البیضائ، قم، دفتر انتشارات اسلامی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١١٣۔ فیض کاشانی، ملا محسن، المحجۃ البیضا فی تہذیب الاحیائ، ٨ جلد، بیروت، مؤسسہ اعلمی مطبوعات، ١٤٠٣ ق۔
١١٤۔ قطب محمد، روش تربیتی در اسلام، ترجمہ محمد مہدی جعفری، تہران، انجام کتاب، ١٣٦٢۔
١١٥۔ قمی، شیخ عباس، کلیات مفاتیح الجنان، بہ خط طاہرہ خوشنویس، تہران، کتابچی، ١٣٧٠۔
١١٦۔ قمی، علی بن ابراہیم، تفسیر قمی، قم، دار الکتاب، ١٤٠٤ ق۔
١١٧۔ کارل الکسیس، نیایش، ترجمہ علی شریعتی، تہران، حسینیہ ارشاد، ١٣٥٨۔
١١٨۔ کانت، ایمانوئل، بنیاد ما بعد الطبیعہ اخلاق، ترجمہ حمید عنایت و علی قیصری، تہران، شرکت سہامی انتشار خوارزمی، ١٣٦٩۔
١١٩۔ کتاب مقدس، ترجمہ فارسی، قطع جیبی، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٢٠۔ کراجکی، محمد بن علی، کنز الفوائد، قم، دار الذخائر، ١٤١٠ ق۔
١٢١۔ کریستیانی، ترزاس، روان شناسی مشاورہ، ترجمہ رضا فلاحی و حاجی لو، مؤسسہ رشد، ١٣٧٤۔
١٢٢۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ٢ جلد، بیروت، دار الاضوائ، ١٤١٤ ق۔
١٢٣۔ مارستون، انتقانی، معجزئہ تشویق، ترجمہ توراندخت تمدن (مالکی)، تہران، علمی، ١٣٧٥۔
١٢٤۔ مثولتز، دوان، روان شناسی کمال، ترجمہ گیتی خوش دل، تہران، نشر نو، ١٣٦٢۔
١٢٥۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، ١١١ جلد، بیروت، دار الاضوائ، ١٤١٣ ق۔

۱۲۶ـ محمد قاسمی، حمید، اخلاق جنسی اسلام کی نظریں، تہران، سازمان تبلیغات اسلامی، ۱۳۷۳ـ
۱۲۷ـ محمدی ری شہری، محمد، میزان الحکمہ، ۱۰ جلد، قم، حوزه علمیہ قم، دفتر تبلیغات اسلامی، ۱۳۶۲ـ
۱۲۸ـ مزلو، آبراہام، روان شناسی شخصیت سالم، ترجمہ شیوا روی گردان، تہران، ہدف، ۱۳۶۷ـ
۱۲۹ـ مزلو، آبراہام، انگیزش و شخصیت، ترجمہ احمد رضوانی، مشہد، آستانہ قدس رضوی، ۱۳۶۷ـ
۱۳۰ـ مشکور، محمد جواد، خلاصئہ ادیان، تہران، شرق، ۱۳۷۲ـ
۱۳۱ـ مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق در قرآن، تہران، امیر کبیر، ۱۳۷۲ـ
۱۳۲ـ مصباح یزدی، محمد تقی، دروس فلسفہ اخلاق، تہران، اطلاعات، ۱۳۶۷ـ
۱۳۳ـ مطہری، مرتضی، آشنایی با علوم اسلامی (حکمت عملی)، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)ـ
۱۳٤ـ مطہری، مرتضی، آشنایی با علوم اسلامی (عرفان)، قم، صدرا، ۱۳۷۱ـ
۱۳۵ـ مطہری، مرتضی، اخلاق جنسی در اسلام و جہان غرب، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)ـ
۱۳۶ـ مطہری، مرتضی، اسلام و مقتضیات زمان، ۲جلد، قم، صدرا، ۱۳۷٤ـ
۱۳۷ـ مطہری، مرتضی، تعلیم وتربیت در اسلام، تہران، ، صدرا، ۱۳۶۷ـ
۱۳۸ـ مطہری، مرتضی، جاذبہ ودافعہ علی، تہران، ، صدرا، ۱۳۶۸ـ
۱۳۹ـ مطہری، مرتضی، جاودانگی اخلاق، (چاپ شده در یاد نامہ استاد مطہری، ج ۱)، تہران، سازمان انتشارات و آموزش انقلاب اسلامی، ۱۳۶۰ـ
۱٤۰ـ مطہری، مرتضی، سیری در سیرئہ نبوی، قم، صدرا، ۱۳۷۶ـ
۱٤۱ـ مطہری، مرتضی، مسلہ حجاب، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)ـ
۱٤۲ـ مطہری، مرتضی، مسلہ شناخت، قم، صدرا، ۱۳۷٤ـ
۱٤۳ـ مطہری، مرتضی، مقدمہ ای بر جہان بینی اسلامی (انسان در قرآن)، قم، صدرا، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)ـ
۱٤٤ـ مطہری، مرتضی، نظام حقوق زن در اسلام، قم، صدرا، ۱۳۷۵ـ
۱٤۵ـ مطہری، مرتضی، نقدی بر مار کسیسم، قم، صدرا، ۱۳۶۲ـ

١٤٦ـ معین، محمد، فرهنگ فارسی (متوسط) ، ٦جلد، تهران، امیر کبیر، ١٣٧١ـ
١٤٧ـ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، تهران، دارالکتب الاسلامۃ، ١٣٧٢ـ
١٤٨ـ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ٢٧ جلد، تهران، دارالکتب الاسلامۃ، ١٣٧١ـ
١٤٩ـملکی تبریزی، میرزا جواد آغا، رسالۃ لقاء اللہ، ترجمہ ومقدمہ واضافات سید احمد فہری، نہضت زنان مسلمان، ١٣٦٠ـ
١٥٠ـمنصور، محمود، احساس کہتری، تهران، دانشگاہ تهران، مؤسسہ انتشارات وچاپ، ١٣٦٩ـ
١٥١ـ منصور، محمود، روان شناسی ژنتیک: تحول روانی از کودکی تا پیری، تهران، ترمہ، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٥٢ـ مہرین، مہراد، فلسفہ شرق، تهران، مؤسسہ مطبوعاتی، عطائی، ١٣٥٧ـ
١٥٣ـ نائینی، میرزا محمد حسین، فوائد الاصول (تقریر محمد علی کاظمی) ، ٤جلد، قم، مؤسسہ النشر الاسلامی، ١٤٠٤ ق۔
١٥٤ـ ناطق، ناصح، بحثی دربارۂ زندگی مانی وپیام او، تهران، امیر کبیر، ١٣٥٧ـ
١٥٥ نراقی، ملا احمد، معراج السعادہ، تهران، رشیدی، ١٣٦٢ـ
١٥٦ـ نراقی، ملا مہدی، جامع السعادات، قم، اسماعیلیان، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٥٧ـ نعمانی، محمدبن ابراہیم، الغیبہ، تهران، مکتبۃ الصدوق، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٥٨ـ نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسائل، قم، مؤسسہ آل البیت، ١٤٠٧ ق۔
١٥٩ـ نوری، میرزا حسین، مستدرک الوسائل ومستنبط المسایل، بیروت، مؤسسہ آل البیت لاحیاء التراث، ١٤٠٨ ق۔
١٦٠ـ ورام بن ابی فراس، تنبیہ الخواطر، ٢ جلد، بیروت، دارالتعارف ودار صعب، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٦١ـ ویل دورانت، تاریخ تمدّن، ترجمہ گروہی ازمترجمین، تهران، اقبال، (تاریخ طبع مشخص نہیں ہے)۔
١٦٢ـ ویل دورانت، لذات فلسفہ، تهران، شرکت سہامی انتشار اندیشہ، ١٣٥٤ـ
١٦٣ـہرگنہان، بی۔ آر۔ مقدمہ ای برنظریہ ہای یادگیری، ترجمہ علی اکبر سیف، تهران، دانا، ١٣٧٤ـ
١٦٤ـ ہرمان الدنبورک، فروغ خاور، ترجمہ بدرالدین کتابی، اصفہانی، انتشارات کتاب فروشی تیید، ١٣٤٠ـ
١٦٥ـ ہیلگارد، ارنست، نظریہ ہای یادگیری، ترجمہ محمد نقی براہنی، تهران، ستاد انقلاب فرہنگی مرکز نشر دانشگاہی، ١٣٧٦ـ
١٦٦ـیونگ، روان شناسی ضمیر ناخودآگاہ، ترجمہ محمد علی امیری، تهران، انتشارات آموزش و انقلاب اسلامی، ١٣٧٢ـ
١٦٨- The Psychology of Healthe , M.Robin Dimatteo, .
.colifornia, 1991

فہرست

پہلا باب : اخلاق کے اصول ۴
پہلی فصل: کلّیات ۴
الف۔ علم اخلاق سے واقفیت ۴
۱۔ لفظ اخلاق کا لغوی مفہوم ۴
۲۔ علم اخلاق کی تعریف ۵
۳۔ اخلاق کا فلسفہ ۶
٤۔ اخلاقی تربیت ۷
ب۔ علم اخلاق اور دوسرے علوم ۸
۱۔ علم اخلاق اور فقہ ۸
۲۔ علم اخلاق اور حقوق ۹
۳۔ علم اخلاق اور عرفان عملی ۹
٤۔ علم اخلاق اور تربیتی علوم ۱۰
ج۔ اخلاق سے متعلق نظریات ۱۱
۱۔ فیلسوفوں کا نظریۂ اخلاق ۱۱
۲۔ عارفوں کا نظریۂ اخلاق ۱۱
۳۔ اخلاق نقلی [۳] ۱۳
د: اخلاق اسلامی کے مباحث کی تقسیم ۱٦
۱۔ اخلاق کی بعض بنیادی اور فلسفی بحثیں ۱٦
۲۔ اخلاقی خوبیوںاور برائیوں کی توصیف ۱٦

۳۔ اخلاق تربیتی ۱۶

دوسری فصل : اخلاق کی جاودانی ۱۷

مقدمہ ۱۷

۱۔ مسئلہ کی وضاحت: ۱۷

۲۔ بحث کی تاریخ: ۱۷

۳۔ موضوع کی دینی اہمیت: ۱۸

٤۔ اطلاق اور نسبیت کا مفہوم: ۱۸

الف۔ اخلاقی نسبیت پسندی کے نتیجے: ۲۰

۱۔ ذمہ داری کا سلب ہونا: ۲۰

۲۔ اخلاقی احکام کا بے ثمر ہونا: ۲۱

۳۔ دین کے مکمل اور جاودانی ہونے کی نفی: ۲۱

٤۔ اخلاقی شکّاکیت : ۲۱

۵۔ خادموں اور خائنوں کا یکساں ہونا: ۲۲

ب۔ اخلاق میں مطلق پسندی اور اس کی دلیلیں ۲۲

۱۔ پائدار اخلاق کی نشاندہی کی ضرورت: ۲۲

۲۔ اخلاق کے جاودانی اصولوں کو بیان کرنا: ۲۲

ج۔ سوالات اور جوابات ۲۵

پہلا سوال: ۲۵

پہلا جواب: ۲۵

دوسرا جواب: ۲۵

تیسرا جواب:.. ۲۶
چوتھا سوال:.. ۲۸
جواب:.. ۲۸
تیسری فصل: اخلاقی عمل.. ۲۹
عناوین.. ۲۹
الف ۔اخلاقی عمل کے قیمتی عناصر.. ۳۰
۱ ۔فاعلی عناصر.. ۳۰
ایک: فاعل کی آزادی اور اس کا اختیار.. ۳۱
۱۔ فلسفی جبر:.. ۳۲
۲۔ اخلاقی جبر:.. ۳۲
۳۔ حقوقی جبر:.. ۳۲
٤۔ نفسیاتی جبر:.. ۳۲
۵۔سماجی جبر:.. ۳۳
دو: فاعل کی نیت اور مقصد.. ۳۴
۱۔مقصدکی عقلی اہمیت:.. ۳۵
نیت کے مراتب:.. ۳۶
مقصد اور ایمان کارشتہ:.. ۳۷
ایمان اورعمل کا رشتہ :.. ۳۹
کافروں کے نیک اعمال:.. ۴۰
۲۔فعلی اور عینی عنصر.. ۴۱

ب: اخلاقی ذمہ داری کی شرطیں ۴۳
۱۔بلوغ ۴۴
۲۔ عقل ۴۵
۳۔علم یا اسے حاصل کرنے کا امکان........................ ۴۵
پہلی دلیل : ۴۶
دوسری دلیل:........................ ۴۶
تیسری دلیل:........................ ۴۷
چوتھی دلیل:........................ ۴۷
٤۔قدرت ۴۸
۵۔ اضطرار (مجبوری) کا نہ ہونا........................ ۵۰
٦۔ اکراہ واجبار کا نہ ہونا........................ ۵۰
۷۔قصد وعمد........................ ۵۱
ج: ۔ اخلاقی عمل کی پہچان........................ ۵۲
ا۔عقل[۲]........................ ۵۲
۲۔فطرت [۱]........................ ۵۳
۳۔وحی ۵۴
د۔ اخلاقی اقدار کا تزاحم اورترجیح کا معیار........................ ۵۵
دوسرا باب : ۵۸
اخلاق کے عام مفاہیم۔........................ ۵۸
پہلی فصل: ۵۸

ہدایت کرنے والی نفسانی صفت ۵۸
ایمان ۵۸
۱۔ایمان کی اہمیت.. ۵۹
۲ ۔ ایمان کی ماہیت ٦۰
۳۔ایمان کے اقسام اوردرجات.. ٦۰
اوّلاً:.. ٦۰
ثانیاً:.. ٦۱
٤ ۔ ایمان کے متعلقات ٦۲
ایک۔ عالم غیب پر ایمان :.. ٦۲
دو۔ خدا اور اس کی وحدانیت پر ایمان:.. ٦۳
تین۔ قیامت اور اس کی کیفیت پر ایمان: ٦۳
چار۔ انبیاء (ع) کی رسالت اور آسمانی کتابوں پر ایمان: ٦۴
پانچ۔ امامت اور ائمہ (ع) پر ایمان:.. ٦۴
۵۔ایمان کی شرط.. ٦۵
٦۔ ایمان کے اسباب.. ٦٦
۷۔ایمان کے فوائد.. ٦۷
ایک۔ روحی تسکین:.. ٦۷
دو۔ بصیرت : ٦۸
تین۔ خدا پر بھروسہ:.. ٦۸
چار۔ دنیوی برکتیں :.. ٦۸

پانچ۔ نیک اعمال کی انجام دہی: ٦٩
چھ۔ عوام میں محبوبیت: ٦٩
سات۔ اُخروی فلاح اور کامیابی: ٦٩
۸۔ ایمان کے موانع ٧٠
ایک۔ جہل: ٧٠
دو۔ شک وتردید: ٧١
تین۔ نفسانی خیالات اور شیطانی وسوسہ: ٧٢
چار۔ علمی وسواس: ٧٢
پانچ۔ کفر اور شرک: ٧٢
دوسری فصل: مؤثر نفسانی صفات ٧٣
الف۔ خدا کی طرف نفس کا مائل ہونا ٧٣
۱۔ خداوندعالم کی محبت ٧٣
پہلی نظر: بندوں کی خدا سے محبت ٧٥
الف: محبت کی پیدائش کے اسباب: ٧٥
۱۔ جو چیزیں انسان کی بقاء اور کمال کا سبب ہوتی ہیں: ٧٥
۲۔ لذت: ٧٥
۳۔ احسان: ٧٦
٤۔ ظاہری و باطنی حسن و جمال: ٧٧
٥۔ باطنی اور روحی توافق ومناسب: ٧٧
٦۔ الفت واجتماع: ٧٧

۷۔ ظاہری اوصاف میں شباہت: ۷۸
۸۔ علیت کا رابطہ: ۷۸
ب۔ خدا وند عالم سے محبت کی نشانیاں: ۷۹
۱۔ موت کو دوست رکھنا: ۷۹
۲۔ خداوندعالم کی خواہش کو مقدم کرنا: ۸۰
۳۔ یاد خدا وندی سے غافل نہ ہونا: ۸۰
٤۔ خوشی و غم خدا کے لئے: ۸۰
۵۔ خدا کے دوستونّسے دوستی اور اس کے دشمنونّسے دشمنی: ۸۰
٦۔ محبت و امید کے ساتھ خوف: ۸۱
۷۔ اللہ کی محبت کا کتمان اور اس کا دعویٰ نہ کرنا: ۸۱
ج۔ خداوند عالم کی محبت کے علائم: ۸۱
۱۔ پروردگار سے انس: ۸۱
۲۔ خداوند عالم کی جانب اشتیاق: ۸۲
۳۔ قضائے الٰہی سے راضی ہونا: ۸۲
د۔ محبت پروردگار کا انجام: ۸۳
دوسری نظر: خدا وند سبحان کی بندوں سے محبت ۸۴
۲۔ توکل ۸۵
ایک۔ توکل کی حقیقت و ماہیت: ۸۵
دو۔ توکل کے درجات: ۸٦
تین۔ توکل کی اہمیت: ۸۷

چار۔ سعی وکوشش اور توکل: ۸۸

۳۔ شکر ۸۸

ایک۔ شکر کی ماہیت اور درجات: ۸۸

دو۔ شکر کی اہمیت: ۸۹

تین۔ شکر خداوندی کا دنیوی نتیجہ: ۹۰

ب۔ نفس کا اپنی عاقبت کی طرف رجحان ۹۱

۱۔ خوف ۹۱

الف۔ خوف کا مفہوم: ۹۱

ب۔ خوف کے درجات: ۹۲

ج۔ خوف کی اہمیت: ۹۲

اولاً ۹۲

ثانیاً، ۹۳

د۔ خوف کے بارے میں ہوشیاری: ۹۴

۲۔ امید ۹۴

ب۔ امید کی اہمیت: ۹۵

ج۔ امید کے نقصانات: ۹۶

۱۔ بغیر عمل کے امیدوار ہونا: ۹۶

۲۔ تدبیر خداوندی سے اپنے کو محفوظ سمجھنا: ۹۶

۳۔ خوف ورجاء کے درمیان مناسبتیں: ۹۷

ج۔ نفس کا خود اپنی طرف رجحان ۹۸

۱۔ انکسار نفس... ۹۸
پہلی نظر عُجب (خود پسندی)... ۹۸
الف۔ عُجب کا مفہوم:... ۹۹
ب۔ خود پسندی کی مذمت :... ۹۹
ج۔ خود پسندی کے اسباب:... ۱۰۰
دوسری نظر۔ غرور... ۱۰۳
الف۔ کفار:... ۱۰۳
ب۔ فاسق اور گناہگار مومنین:... ۱۰۴
ج۔ علمائ:... ۱۰۴
د۔ مبلغین اور واعظین:... ۱۰۴
ہ۔ اہل عبادت اور عمل:... ۱۰۴
و۔ عرفان کے دعویدار افراد:... ۱۰۴
ز۔ مالدار اور ثروت مند افراد:... ۱۰۵
۲۔ تواضع... ۱۰۵
ایک۔ تواضع کی اہمیت:... ۱۰۵
الف) کبر:... ۱۰۶
کبر کا مفہوم:... ۱۰۷
تکبّر کی مذمت:... ۱۰۷
تکبّر کی قسمیں:... ۱۰۷
دو۔ پیغمبر کے مقابل تکبّر کرنا:... ۱۰۷

تکبّر کا علاج:... ۱۰۸
ب) ذلت و خواری:... ۱۰۸
تیسری فصل: مؤثر نفسانی صفات... ۱۰۹
د۔ نفس کی توجہ آئندہ کی نسبت.. ۱۰۹
۱۔ آئندہ کی نسبت نفس کا مطلوب رجحان... ۱۰۹
الف۔ حزم:... ۱۰۹
ب۔ آرزؤوں کو کم کرنا:.. ۱۱۰
ج۔ موت کی یاد:... ۱۱۱
د۔ بلند ہمتی:... ۱۱۲
۲۔ موانع.. ۱۱۲
الف۔ طولانی آرزوئیں:.. ۱۱۲
ب۔ پست ہمتی:... ۱۱۳
ہ۔ دنیوی نعمتوں کی طرف نفس کا رجحان.. ۱۱۴
زہد.. ۱۱۴
ایک۔ زہد کا مفہوم.. ۱۱۴
دو۔ زہد کی اہمیت.. ۱۱۵
تین۔ زہد کے مراتب اور درجات... ۱۱۵
۱۔ زہد کے شدت و ضعف کے اعتبار سے مراتب:.. ۱۱۵
۲۔ زہد کے مراتب اعراض کی جانے والی چیزوں کے اعتبار سے:.............................. ۱۱۶
چار۔ زہد کے علائم... ۱۱۸

۱۔ قناعت: ۱۱۸
۲۔لوگوں کے اموال سے بے نیازی اور عفت: ۱۱۹
پانچ۔ زہد اختیار کرنے کے موانع ۱۲۰
۱۔دنیاکی محبت: ۱۲۰
دنیا کی محبت کی نشانیاں: ۱۲۲
الف۔ دنیا کی حرص: ۱۲۲
ب۔ طمع اور لالچ: ۱۲۳
۲۔ خمود: ۱۲۳
و۔ دوسروں کی نسبت نفس کا رجحان ۱۲۴
۱۔ خداوندعالم کی محبت ۱۲۴
ایک۔دیگر دوستی کی حقیقت اور اس کے اقسام ۱۲۴
دو۔خدا سے محبت کرنے کی فضیلت ۱۲۶
تین۔خدا سے محبت کرنے کی نشانیاں ۱۲۷
۱۔ نصیحت اور خیر خواہی: ۱۲۷
۲۔مومنین سے حسن ظن: ۱۲۸
چار۔ خداوند سبحان سے دوستی کے موانع ۱۲۹
۱۔ حسد: ۱۲۹
٦۔ تکبر: ۱۳۲
۷۔ دوسرونکے عظیم نعمتوں سے فیضیاب ہونے کی توقع نہ کرنا: ۱۳۳
۲۔حقد اور کینہ توزی: ۱۳۳

۲۔خدا وند سبحان کے لئے دشمنی ۱۳۵
چوتھی فصل: ۱۳۶
مؤثر نفسانی صفات ۱۳۶
ز۔ نفس کو قابو میں رکھنے والے رجحان ۱۳۶
۱۔ نفس کی قوت ۱۳۶
(ایک) قوت نفس کے فوائد ۱۳۶
الف۔ثبات اور اطمینان (عدم اضطراب): ۱۳۷
ب۔ بلند ہمتی: ۱۳۷
ج۔ غیرت و حمیت: ۱۳۷
۱۔ دین میں غیرت: ۱۳۸
۲۔ ناموس کے لئے غیرت: ۱۳۸
۳۔ اولاد کے سلسلہ میں غیرت: ۱۳۹
٤۔ مال کے سلسلہ مینٖغیرت: ۱۳۹
د۔ وقار اور قلبی سکون: ۱۳۹
۱۔ خدا وند عالم کی بندگی: ۱۴۰
۲۔ علم و حکمت: ۱۴۱
۳۔ حلم: ۱۴۱
٤۔سکوت: ۱۴۱
۵۔ تواضع و فروتنی: ۱۴۱
۱۔ ازدواج: ۱۴۱

۲۔ عدالت: ۱۴۱
۳۔ ایمان: ۱۴۲
٤۔ خدا کی یاد: ۱۴۲
۵۔ حق تک پہنچنا: ۱۴۲
۱۔ لوگوں سے سوال و درخواست کرنا: ۱۴۲
۲۔ حد سے زیادہ ہنسنا اور ہنسی مذاق کرنا: ۱۴۲
۳۔ مال، قدرت، علم، تعریف اور جوانی سے سر مست ہونا: ۱۴۳
٤۔ جلد بازی: ۱۴۳
دو۔ نفس کے لئے خطر ناک شئی ۱۴۴
۲۔ حلم و بردباری اور غصہ کا پینا ۱۴۵
الف۔ حلم اور کظم غیظ کے اسباب و موانع: ۱۴۷
ب۔ حلم و بردباری کے فوائد: ۱۴۷
۳۔ حیا ۱۴۸
الف۔ حیا کی اہمیت: ۱۴۹
ب۔ حیا کے اسباب و موانع: ۱۵۰
۱۔ عقل: ۱۵۰
۲۔ ایمان: ۱۵۰
۳۔ لوگونکی طرف دست سوال دراز کرنا: ۱۵۰
۳۔ زیادہ بات کرنا: ۱۵۱
٤۔ شراب خوری: ۱۵۱

ج۔ حیا کے فوائد: ۱۵۱
۱۔ خدا کی محبت: ۱۵۱
۲۔ عفّت اور پاکدامنی: ۱۵۱
۳۔ گناہوں سے پاک ہونا: ۱۵۱
د۔ حیا کے مقامات: ۱۵۲
۲۔ تحصیل علم سے حیا کرنا: ۱۵۳
۳۔ حلال درآمد کے حصول میں حیا کرنا: ۱۵۳
٤۔ مہمانوںکی خدمت کرنے سے حیا کرنا: ۱۵۳
۵۔ دوسروں کا احترام کرنے سے حیا کرنا: ۱۵۳
٦۔ نہ جاننے کے اعتراف سے حیا کرنا: ۱۵۳
۷۔ خداوند عالم سے درخوست کرنے میں حیا کرنا: ۱۵۴
۸۔ معمولی بخشش کرنے سے حیا کرنا: ۱۵۴
۹۔ اہل و عیال کی خدمت کرنے سے حیا کرنا: ۱۵۴
٤۔ عفّت ۱۵۴
الف۔ عفّت کے اقسام: ۱۵۵
۱۔ عفّت شکم: ۱۵۵
ب۔ عفّت کی اہمیت: ۱۵٦
ج۔ عفّت کے اسباب: ۱۵٦
د۔ عفّت کے موانع: ۱۵۷
۱۔ شرارت: ۱۵۷

۲۔ خمود: ۱۵۷
ہ۔ عفّت کے فوائد: ۱۵۸
۵۔ صبر ۱۵۸
الف۔ صبر کی قسمیں: ۱۵۹
۱۔ مفہوم کے لحاظ سے: ۱۵۹
۲۔ موضوع کے لحاظ سے: ۱۵۹
۳۔ حکم کے لحاظ سے: ۱۶۰
ب۔ صبر کے درجات: ۱۶۱
ج۔ صبر کی اہمیت: ۱۶۱
د۔ صبر کے فوائد: ۱۶۳
تیسرا باب: ۱۶۴
اسلام کی نظر میں اخلاقی تربیت ۱۶۴
پہلی فصل: ۱۶۴
اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے ۱۶۴
مقدمہ: ۱۶۴
طریقے ۱۶۵
۱۔ تربیت کے لئے مناسب ماحول بنانا ۱۶۵
الف۔ مقدمہ سازی: ۱۶۶
ب۔ نمونہ سازی: ۱۶۷
ج۔ ماحول کو صحیح و سالم رکھنا: ۱۶۹

د۔ موقعیت کا تبدیل کرنا:.. ۱۷۰

۲۔ ضرورتوں کو صحیح طریقہ سے پورا کرنا... ۱۷۱

حضرت امام حسنؑ کی سیرت نادان مخالفین کے ساتھ یہی انسانی روش اور سیرت تھی:............ ۱۷۳

الف ۔معاشی نظام کی طرف توجہ:... ۱۷٦

ب۔ ازدواج:.. ۱۷٦

ج۔ورزش:.. ۱۷۷

د۔ کام:.. ۱۷۷

۳۔ احترام شخصیت کے طریقے.. ۱۷۸

۱۔ طبیعی تلافی:... ۱۸۰

۲۔ گریز اور نا امیدی:.. ۱۸۱

۳۔ خیالی تلافی:.. ۱۸۱

الف۔ اکرام واحترام:.. ۱۸۲

ب۔بغیر شرط کے مثبت توجہ:.. ۱۸۵

ج۔ اغماض (چشم پوشی) :.. ۱۸۹

۱۔ صحت پر حمل کرنا چاہئے یا اس کی اچھے طریقہ سے توجیہ کرنی چاہئے:................. ۱۸۹

۲۔تغافل اور تجاہل:.. ۱۸۹

۳۔ عفوودرگذر:.. ۱۹۰

د۔ ذمہ داری دینا:.. ۱۹۲

٤۔ اخلاقی اقدار کی دعوت دینا.. ۱۹۳

الف۔ انذار وبشارت:... ۱۹٦

ب۔ داستان گوئی : ۱۹۷
ج۔تشبیہ و تمثیل: ۱۹۹
د۔سوال وجواب: ۲۰۰
دوسری فصل: ۲۰۲
اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے ۲۰۲
۱۔ عقلانی قوت کی تربیت ۲۰۲
۱۔ طبیعت: ۲۰۳
۲۔تاریخ: ۲۰۳
۳۔قرآن: ۲۰۳
٤۔انسان: ۲۰۳
الف ۔افکار کی عطا اور اصلاح: ۲۰۳
پہلی قسم : ۲۰۳
دوسری قسم : ۲۰۵
ب۔ اخلاقی استدلال: ۲۰۶
ج۔ مطالعہ اور اطلاعات کی تصحیح: ۲۰۷
د ۔ مشورت ومشاورہ: ۲۰۷
۲-۔ عبرت حاصل کرنے کے طریقے ۲۰۸
الف۔گذشتگان کے آثار کا مشاہدہ : ۲۰۹
جرت الریاح علی رسوم دیارہم ۲۱۰
ب ۔ طبیعت اور موجودات کی طرف نظر: ۲۱۱

ج ۔ موجودہ حوادث اور واقعات کی جانب توجہ: ۲۱۲
د۔ گذشتگان کے قصوں میں غور و فکر: ۲۱۲
۳۔ عمل کی پابندی اور مداومت........................ ۲۱۴
الف ۔ مشق اور عادت ڈالنا: ۲۱۸
۱۔دینی واجبات اور فرائض میں عمل کا استمرار اور پابند: ۲۱۸
۲۔ کیفیت عمل کی جانب توجہ کرنا: ۲۱۹
ب ۔ اضداد سے استفادہ: ۲۱۹
ج ۔ ابتلاء اور امتحان: ۲۲۰
د۔معاشرت و مجالست: ۲۲۵
۴: ۔ تشویق اور تنبیہ کا طریقہ ۲۲۷
: اول........................ ۲۲۹
دوسرا نکتہ ۲۲۹
الف ۔ عاطفی توجہ: ۲۲۹
ب ۔ زبانی تشویق: ۲۳۰
ج ۔ عملی تشویق: ۲۳۱
د۔ جزا سے محرومیت اور نیکو کار کو جزا دینا: ۲۳۲
ہ۔جرمانہ اور تلافی: ۲۳۳
و۔ سرزنش وتوبیخ اور جسمانی توبیخ وتنبیہ: ۲۳۳
تیسری فصل : ۲۳۸
اسلام میں اخلاقی تربیت کے طریقے........................ ۲۳۸

۱۔ خود پر ناظر ہونا ۲۳۸
الف۔ توبہ: ۲۴۱
آخری نکتہ: ۲۴۵
ب۔ مراقبہ: ۲۴۶
ج۔ محاسبہ: ۲۴۸
د۔ معاقبہ: ۲۵۰
۲:۔ ایمان کی تربیت ۲۵۱
پہلا مسلک: ۲۵۲
دوسرا مسلک: ۲۵۲
تیسرا مسلک: ۲۵۲
الف۔ عبادت: ۲۵۷
ب۔ ذکر: ۲۵۹
ج۔ دعا: ۲۶۳
د۔ اولیائے خدا سے محبت: ۲۶۶
منابع ۲۷۰